گنجی بار
طاہرہ اِقبال

گنجی بار

(افسانے)

طاہرہ اِقبال

دوست پبلی کیشنز

اسلام آباد - لاہور - کراچی

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-289-4

کتاب	:	کتنی بار
مصنفہ	:	طاہرہ اقبال
موسم اشاعت	:	2008
سرورق	:	خالد رشید
مطبع	:	ورڈ میٹ، اسلام آباد
قیمت	:	300.00 روپے

دوست پبلی کیشنز پلاٹ 110، سٹریٹ 15، I-9/2، پوسٹ بکس نمبر 2958، اسلام آباد

فون 051-4102784-5 E-mail: dostpub@comsats.net.pk

اِنتساب

ملک فیض اللہ خان اعوان

جب وہ موجود تھے تو اک ایسا گھنیرا پیڑ کہ جس کے سائے تلے ہم چھوٹے چھوٹے پودے ہی رہ گئے جنہیں براہِ راست نہ روشنی ملتی ہے نہ آکسیجن، ہر افق، ہر بلندی، ہر پنہائی میں بچھا گہرا سایہ کہ جس سے پرے نہ دیکھنا ممکن نہ کھسکنا ممکن۔

جب وہ نہ رہے تو معلوم ہوا کہ ان پودوں کو تو اسی چھتنار سے کشید ہوتی ہوا میں سانس لینے کی عادت پڑ چکی ہے وہ تو بس اُسی میں سے چھنتی روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کتنا عریاں، کتنا بھیانک اور تکلیف دہ منظر تھا جو اُنہوں نے خود سے ڈھانپ رکھا تھا۔

جب اُن کے بغیر جینا پڑا تو انکشاف ہوا کہ وہ تو کہیں گئے ہی نہیں۔ ہر بات، ہر عمل، ہر موقع پر ایک حکم، ایک ضابطہ، ایک حد، ایک تیسری آنکھ ساتھ لگی رہ گئی ہے۔ نہیں یوں نہیں! ابو جی ایسا نہیں کرتے تھے۔ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ ایسے موقع پر اُن کا ردِّ عمل اس قسم کا ہوتا تھا۔ اس طرح کی صورتحال میں اُن کا فیصلہ یوں ہوتا، ہماری ساری سوچیں، فیصلے اور ارادے اُسی تیسری آنکھ کی جنبش کے تابع ہو گئے۔

ابو جی! مر کر بھی آپ کی حکمرانی کی عادت نہ گئی۔

وہ اُسی شان سے جیئے جو اُن کی وسیع و عریض زمینوں کی رعب دار فراخی، گداز نرمی اور پُر فیض زرخیزی میں رچی بسی ہے اور اُس شان سے اُٹھے جو بھرے کھلیانوں کے سمت جانے کی ہوا کرتی ہے۔ جن کی خالی کی ہوئی جگہ کبھی خالی نہیں ہوتی۔ جس میں گرے پڑے رہ جانے والے ہزاروں دانوں دنکوں پر پرندوں کے غول اُترتے اور اُنہیں چگتے رہتے ہیں کہ زرخیز کھیت کبھی خالی نہیں ہوا کرتے۔

طاہرہ اقبال

242 علی روڈ، خیابان کالونی 2، فیصل آباد

فون نمبر:041-8522052-8523343 موبائل:0333-6556131

ترتیب

پیش لفظ

پہلی بات تو یہ کہ طاہرہ اقبال کی لکھی کہانیاں ہمارے کتنے ہی ہم عصروں کی طرح نری ڈرافٹنگ یا شعبدہ کاری ہرگز نہیں ہوتیں۔ اِن کے ہاں مجھے ایک کہانی بھی ایسی نہ مل سکی۔ یہ تو کچی، کھری، زرخیز مٹی سے اُچیتی، اکھوے نکالتی، برومند اور ثمر بار کرتی کہانیاں اُگاتی ہیں۔ جن میں دیہاتی زندگی بالکل کچی ،گری جیسی ہوتی ہے۔'' کچی ،گری جیسی، کہ بس کچر کچر چر جاؤ، ذرا بھی نہ بچے......'' (میں نے یہ سطر طاہرہ اقبال کی کہانی سے اُٹھائی ہے۔)

اُردو میں دیہات کو...... پنجاب کے دیہات کو، بہت سوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ لیکن طاہرہ اقبال کا دیہات (شاید گنجی بار کا علاقہ) تیز و تند قدرتی چشمے کی طرح مٹی سے پھوٹتا ہے اور پڑھنے والے کو...... بلکہ پاس کھڑے لوگوں تک کو شرابور کر دیتا ہے۔

دیہات سے اُٹھائے ہوئے اِن کے کردار ''اگلے وقتوں کی'' دیہات کی کہانیوں کے سخت رومانی کردار نہیں ہوتے بلکہ وہ آج کی چار پانچ دہائیوں کے مسلے مسلائے کچلے ہوئے ''اصلی تے وڈّے'' فرزندِ زمیں کی کاری ہوتے ہیں جن کا پُرسانِ حال (شاید خدا کے سوا) ابھی تک تو کہیں کوئی ہوا نہیں ہے۔

لفظ 'فرزند' اپنی روانی میں لکھ گیا ہوں ورنہ ان کے بیشتر کردار تو دخترانِ زمین ہوتی ہیں جنہیں

اُن کی بے بس ماؤں نے جھما اور مُسلے اور پیسے اور رڑ کے جانے، خرچ کر دیئے جانے اور بالآخر گوڑے کے ساتھ پھینک دیے جانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تو ایک دو بار کے سوا، ایسی روحوں کے لیے کبھی کسی نے مغفرت کی دُعا بھی نہ کی ہوگی۔ کسی ادبی تحریک نے، پچھلے تیس چالیس برسوں میں، یہ کہہ کر انہیں کبھی تسلی نہیں دی ہوگی کہ اے مظلوم بی بیو! تمہارے بعد اندھیرا نہیں، اُجالا ہے۔ یہ سب اسی طرح...... بلکہ شاید اور بھی بھیانک انداز میں جاری رہے گا۔ آثار یہی بتاتے ہیں۔

تاہم جاری زندگی کی حقیقی دہشت ناکی میں ایک بات بڑی حوصلہ دینے والی ہے۔ وہ یہ کہ طاہرہ اقبال کی کہانی کا ہر کردار چاہے وہ کیسا ہی شکست خوردہ اور پٹا پٹایا کیوں نہ ہو، کیسی ہی گند اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیوں نہ پڑا ہو، وہ کسمساتا ہوا اور کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھنے جیسے تیور رکھتا ہے۔ یہ بات میں نے بین السطور دیکھی ہے یہ بہت زیادہ Pronounced شاید نہ ہو کیوں کہ ان بی بی نے کسی SUBTLE انداز میں ایسا کچھ ضرور کر دیا ہے کہ مجھے اِن کے کچلے ہوئے کردار بھی پوری طرح ہارے ہوئے نہیں لگتے۔ اور یہ بات انہوں نے بہت سے لفظوں میں نہیں کہی۔

یہی اِن کا کمالِ فن ہے اور یہی انہیں اور بھی آگے لے جائے گا۔ کہ اک بے خوفی اور اعتماد ان کی تحریروں میں برابر ملتا ہے۔ شہر کے مڈل کلاس لوگوں کی جھجک ان کی کہانی کو Grow کرنے سے نہیں روک سکتی۔ ان کے توانا بیانیے کے آگے کسی بھی طرح کی یہ جعلی Moralist ٹک نہیں سکتی کیونکہ طاہرہ نے جو کچھ جتنا بھیانک دیکھا اور سمجھا ہے وہ اپنا بے محابا اظہار چاہتا ہے۔ اگر طاہرہ اسپینش زبان میں لکھ رہی ہوتیں اور وسطی امریکی ریاستوں کے براعظم جنوبی امریکہ کے پٹے ہوئے لوگوں کی بپتا بیان کرتیں تو اس وقت دنیا کی درجنوں زبانوں میں یہ کہانیاں ترجمہ ہو چکی ہوتیں۔ بہر حال اُردو ادب اتنی غریب غربا زبان بھی نہیں ہے۔ البتہ لوگ ان کی کہانی کا Locale سمجھنا چاہتے ہیں۔ طاہرہ ان پنجابی زبان کے مانوس لفظوں کو اُس مخصوص گرد و پیش میں لکھتی ہیں۔ اس زبان کا محاورہ زندہ، توانا اور Expressive ہے۔ طاہرہ یہ سب الفاظ جس طرح اپنی کہانیوں میں سناتی ہیں اس طرح ایک قدیم اور مضبوط زبان سے قارئین اور مانوس ہوتے چلے جائیں گے اور اس عمل کے دوران اردو لفظیات کا سرمایہ بھی بڑھے گا...... بڑھتا چلا جائے گا۔ میں کسی بھی طرح کے مبالغے کو مسترد کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنجابی زبان نہ صرف صوفی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ ظہور کرتی ہے بلکہ دیہات

کی کہانیوں میں بھی قیامت ڈھا رہی ہے۔ میں اُردو کہانی سے Creative پنجاب نویسی کی بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں۔

طاہرہ سونے کے انہی مدفون ذخائر پر بیٹھی ہیں۔ اسے کان (Mine) Sort of gold کہہ لیجیے۔ یہ خالص سونا ہے جو اُنہوں نے کھود نکالا ہے، جسے کٹھالی میں پگھلا کر بار بار Purify کرنا ہوتا ہے۔ طاہرہ نے اسے اپنے جوہر سے بے شک چمک اور آب دی ہے۔

اسد محمد خان

مکان F-8/A، سیکٹر X-6
Gulshan-e-Maymar
Karachi-7534c

کارنامہ

امپورٹڈ ہونڈا اکارڈ کے طاقت ور اے۔سی نے جب کام کرنا چھوڑ دیا۔ لسلسی ٹانگوں والے پسینے کے کیڑے برینڈڈ شرٹ کے کالر میں گھس کر ڈنک مارنے لگے، تو اسے احساس ہو گیا کہ وہ چک چوالیس کے قریب پہنچ چکا ہے۔ بھاپ سا سلگتا پسینہ اور بھوبھل سی جلتی دھول اُسی شناخت، شدت اور گرم جوشی کے ساتھ اُس سے بغل گیر ہوئی، جو وہ کبھی چھوڑ گیا تھا۔ اگرچہ بھاپیں مارتا سورج فضا کو دُھندلا چکا تھا، جس کا ملگجا دُھواں نظر کو چندھیا رہا تھا، پھر بھی اُس نے گدھی کو چابک مار مار بھگاتے ہوئے لڑکے کے نقوش میں سے فوقی کو پکڑ لیا۔ شیشہ کھول کر دھول کا بڑا سا انگارہ نگلا۔

فوقی...... ای...... ای...... ای...... کے بیٹے۔'' آسمان بھر، جھڑتی حرارت، سمندروں بہتی دھول اور چھاجوں برستی بھاپ نے جیسے اُسے سمجھا دیا، کہ بیس برس سورج کے اس آتشیں لاوے میں بھن بھن کر فوقی تو کھرنڈ اینٹ بن چکا ہوگا، اور کسی سولوں بھرے کیکر سے لگا سن کی چھمکوں سے ریشے اُدھیڑ رہا ہوگا یا ایٹرن پر سوت لپیٹ رہا ہوگا، یوں لڑکا سا گدھی کو تھوڑی ہانک رہا ہوگا۔

لڑکا اپنی پہچان کے تجسس میں چھینٹیں اُڑاتی لاوا سی دھول کے سیال میں گھٹنوں گھٹنوں گڑ گیا۔ قمیص کے دامن سے ہاتھ رگڑ رگڑ ماتھے تک لے جا کر اُس اجنبی شناخت کو سلام کیا...... گدھی کو چابک مار کر للکرا دیا۔

''جا سیدھی گھر کو جا۔''

گدھی پر لدے چری کے لمبے ٹانڈوں کی گھسٹ کو دھول کی بھٹی میں مُرجھاتے ہوئے اُس نے تادور دیکھا۔ گدھی کی اندھی بہری فرض شناس فطرت نے اُسے پھر باور کروادیا کہ وہ چک چوالیس کے پاس کھڑا ہے۔

پاندے، کانے، روڑ، بلوتے ہوئے بگولے میں چکراتے لڑکے کی حیرت کو امتیاز نے ساکت کردیا تھا......

''آپ جی مجھے کیسے جانتے ہیں۔''

وہ ہنسا تو دھول کے چھینٹے تالو کو جھلسا گئے۔

ان دیہاتیوں کی پہچان کو کسی لمبے چوڑے پہچانی سلسلے کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ ایک دم سمپل میتھڈ......ازلی انسان کی ابتدائی ہوموار نیکس خوشی، حیرت، حسرت اور ہنسی......وہی، ابتدائی انسان کا ہوموسپین سراپا، نقوش، شبیہیں اور شخصیتیں...... جیسے قدرت نے تردد سے بچنے کو، پورے قبیلے، سارے خاندان کے لیے بس ایک گھڑت کا سانچہ محفوظ کر رکھا ہو۔ بنا کسی اضافی محنت کے ابنِ آدم نکال نکال کر پھینکتا چلا جارہا ہو بس کہیں کبھی کچھ کم یا زیادہ......لیکن سانچے کی گھڑت صاف پہچانی جاتی ہے۔

فوقی کے بیٹے کے گرد ابتدائی اور سادہ سادہ شبیہوں کا مجمع لگ چکا تھا، ایک یا دو نسل کے فرق والے ان لڑکوں کو جب وہ ان کے باپ دادوں کی پہچان کے حوالے سے پکارتا، تو مارے حیرت اور فخر کے اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اپنی دھول سے اٹی قمیصیں اُتار کر اُس پر سایہ تان کے خود حدت کے سمندر میں پگھل جائیں، یا پھر اُس کی گاڑی کو سَر پر اُٹھا کر کسی گھنے سائے میں لے جائیں اور اپنے صافے اُسے اُڑا دیں کہ کہیں دھوپ کی آگ اُگلتی لمبی زبانیں اُس کی آب نہ چاٹ لے جائیں۔

''آپ جی اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر ہمیں کیسے جانتے ہیں جی......''

''ارے اگر میں تمہیں نہ جانتا ہوتا تو اتنی بڑی گاڑی میں بھی نہ ہوتا۔''

وہ آدم کی انتہائی ابتدائی ہنسی کی سادگی میں کھلکھلائے اور اپنے اپنے پٹکے اُتار کر گاڑی کی ونڈ سکرین پر چڑھ بیٹھی دھول کی ڈھیریاں اُٹھانے لگے۔ اس کھولتے ہوئے دن کی تمام تر حرارتیں پچھلے بیس برس کی حدت میں تپ کر اُس گیارہ بارہ برس کی بچی کے نقوش میں کھنڈ گئی تھیں جو فوقی کے بیٹے کے پیچھے

چھپتی اپنی پہچان کی شناخت سے سہمی کھڑی تھی۔

جلتی بھوبھل کے ان چبھنے ذرات اُس کے بوٹوں اور جرابوں کے اندر جھڑے جیسے بھٹی کی راکھ کو دائی نے چھانتا بھر اُچھالا ہو۔ پوروں کے جوڑوں میں آبلے پھٹے۔

''مَیں تو اس سیاں کی بیٹی کو بھی جانتا ہوں......''

سیاں کی بیٹی کی شناخت پر مجمع اجتماعی شرمندگی کے کفارے میں گنگ ہو گیا۔ ڈھلے ہوئے لباسوں والے لڑکے سائیکلیں سٹینڈ پر کھڑی کر کے پہلا ہوموار ینٹکس غصہ بن گئے......

''جا ٹو یہاں سے دفع ہو جا...... جاتی ہے یا......''

اُس نے غصے اور شرمندگی کی شدت کو منہ میں بلو کر باہر پھینکا، جو گرد کا گیلا سا گولا بن کر کپاس کے موتیا رنگ پھول پر لرزنے لگا......

''سیاں کی بیٹی! چک چوالیس تو یہاں سے دو میل دُور ہے تو اتنے دُور کیا کرنے آئی ہے۔''

لڑکی نے سَر پر رکھے تسلے کو دونوں ہاتھوں سے ذرا سا اُلٹا کر اُسے دکھایا۔

''میں تو روڑ جمع کرنے آئی تھی......قبر پر ڈالنے کے لیے۔''

''سیاں مَر گئی ہے نا۔''

سنہری سی تتلی دھول لپٹے لیس دار کف بھرے پھول میں ٹانگ پھنسا بیٹھی تھی اور اب باہر کھینچ نہ پا رہی تھی۔

''سیاں مَر گئی ہے...... مجھے کئی سال پہلے ہی پتہ لگ گیا تھا۔''

لڑکے ایک دوجے میں منہ چھپا چھپا ہنسے، جیسے اس غلط اطلاع سے متعلق اُس کی تصحیح کرتے ہوئے اُنہیں اپنے مہمان کی بےعزتی کا احساس ہو رہا ہو۔

البتہ تڑتڑ سلگتی دھول میں فٹ فٹ بھر دھنسے سیاں کی بیٹی کے پَیر اُکھڑ گئے۔

''نہیں وہ تو ابھی پچھلے محرم کو مَری ہے۔''

جیسے برس بھر پہلے مرنے والی کو کئی برس پہلے مرنے کا کہہ کر اُس نے اقدامِ قتل کا اقرار کر لیا ہو۔

''تمہیں غلطی لگ رہی ہے سیاں کی بیٹی! دراصل بیس برس پہلے مَیں نے خود اُسے دفن ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ بس غلطی سے وہ دِکھتی زندہ تھی......''

چھوٹے لڑکے چار قدم دُور بھاگے اور پھر رُک گئے بڑے لڑکوں کے پَر منڈیر سے ذرا سے کھسکے، لیکن اک انوکھے وقوعہ کے تجسس نے مجمع کو چھٹنے نہ دیا۔

''اب پہلی بار اُس کے ننگے سَر کو لڑکوں نے دیکھا، اور احساس ہمدردی سے اُن کے ہونٹوں کی پپڑیاں چیخ گئیں۔ اُس کا لباس اور رنگت بتاتی تھی کہ وہ پہلے ایسی دھوپ کے آتشیں حوض میں کبھی نہیں نہایا تھا......

''آپ میرے گھر چلیں جی۔''

فوتی کا بیٹا اس پر اپنا پہلا حق سمجھتا تھا کیونکہ پہلی پہچان کا امتیاز اُسی نے حاصل کیا تھا۔

باقی لڑکوں کو یہ امتیاز کچھ ایسا پسند نہیں آیا۔

صاف لباس والے لڑکے نے سائیکل کی گھنٹی بجائی۔

''تمہارا گھر کچا ہے اور صاحب کے بیٹھنے کو کُرسی بھی نہیں ہے......صاحب! آپ میرے گھر چلیں، میرا گھر پکا ہے۔ کُرسی بھی ہے اور فریج بھی، جس میں برف بھی جمتی ہے۔''

چھلاوہ سا بگولا پوری سڑک پہ اُچھلتا آسمان کو چڑھ گیا......لڑکے اُس کے باقی ماندہ روڑوں، گیٹوں اور دھول میں اندھے ہو کر بھوبھل نگلنے لگے۔

''سیاں کی بیٹی! تم مجھے اپنے گھر چلنے کو نہ کہو گی۔''

کئی بگولوں کا طویل سلسلہ چلا جو اُسے بلوتا ہوا گُزر گیا۔

''ہمارے گھر میں تو کُرسی نہیں ہے جی اور پھر میں تو قبر پر روڑ ڈالنے جا رہی ہوں......''

اُس نے سَر پر دھرے تسلے کے بوجھ کو پھر ذرا سا اُلٹا کر اُسے دکھایا...... کچے روڑ دھوپ کے بھٹے میں جل جل سیاہ پڑ چکے تھے۔

''آپ میرے گھر چلیں جی...... میرے گھر میں پنکھا بھی ہے۔''

''تو میرے گھر تو کُولر بھی ہے۔''

''اور میری دُکان پر جو ٹھنڈی بوتلیں پڑی ہیں کالی بھی اور ہری بھی......''

''احمد کے پوتے! اس چک میں بجلی کب آئی۔''

لڑکوں نے اُس کی بے عزتی کے خیال سے اُس کی لاعلمی پر اپنی اپنی ہنسی آستینوں میں اُگلی۔

البتہ سیاں کی بیٹی ہنس دی...... جب وہ ہنسی تو اُس کی آنکھوں کے کناروں پر سیاں کی شباہت کھلکھلائی۔

''سیاں کی بیٹی تیرے دائیں پَیر کی تیسری اُنگلی پر سنہری تِل کا نشان ہے نا......''

اُس نے سنہری انگلیوں والا مخروطی پَیر اُوپر اٹھایا تو دھول کے کئی ذرّے جھڑ کر اُس کی زبان کی نوک پر داغ بنا گئے۔

فوقی کے بیٹے نے کڑھتی ہوئی دھول کا پھکا اُٹھا کر سیاں کی بیٹی کے منہ پر اُچھالا۔''شرم نہیں آتی دانت نکالتے ہوئے۔ وہ تو صاحب جی! آئی آوائی ہوئی تھی بجلی!''

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم نے بجلی کو کہیں سے آتے آواتے نہیں دیکھا۔ پہلے ہی کہیں سے آ چکی تھی۔ پر مَیں نے تو اُسے کہیں سے آتے ہوئے نہیں دیکھا نا، اور جب کسی کو آتے ہوئے نہیں بلکہ ہنستے بستے ہوئے دیکھو تو حیرت تو ہوتی ہے نا، ہوتی ہے نا سیاں کی بیٹی......''

سیاں کی بیٹی نے بدن کی چھمک کو لہرا کر سنی کے پھولوں جڑے پودے کی اوٹ لے لی۔ ان پیلے پھولوں کی لمبی قطار کی رنگت اُس کے گالوں پر منعکس ہوئی، جیسے ست رنگے بننے سے جھلملائے ہوں۔

اُسے اپنے اپنے گھر لے جانے کو لڑکوں کا اصرار بڑھ رہا تھا...... دھوپ میں جل جل سفید سفید چٹاک بھرے چہرے گیہوں رنگ لالی ٹپکا رہے تھے۔ دیکھو وہ کس کو شرفِ میزبانی بخشتا ہے اور جس کو وہ یہ اعزاز بخش دے گا۔ اُس کی دہلیز پر پورا گاؤں اُمڈ آئے گا۔ نوجوان لڑکیاں پلو میں منہ چھپا ہنسی کی جھاجھریں اُنڈیلیں گی اور یہ ساری ہنسی سیاں کی ایک گنگ کالمس ہوگی جس کسی کو وہ یہ اعزاز بخش دے گا۔ وہ خاندان مدتوں اس کا تذکرہ سینہ پھلا پھلا کر کرے گا اور پھر برسوں بعد یہ ایک رومانوی قصہ بن کر بچوں کی لوری ہو جائے گا......

''لیکن مجھے تو سیاں کی بیٹی کے ساتھ اس کی ماں کی قبر پر روڑ ڈالنے جانا ہے......''

لڑکوں کے پھٹی کے گم کی طرح کھلے چہرے گرنڈ ہو گئے جیسے یکبارگی، امریکن سنڈی کے لشکر نے مل کر حملہ کر دیا ہو۔

احمد کے پوتے نے سائیکل کے پیڈل پر پَیر مارا......

''آپ اس نیم کے سائے تلے بیٹھیں جی میں گھر سے کچی لسی بنوا کر لاتا ہوں......''

اُس نے کہنا چاہا پر میری گاڑی میں تو منرل واٹر کا فلاسک بھرا پڑا ہے، لیکن وہ تازہ تازہ لپے بھوسے کے قبر نما ڈھیروں کے ساتھ ساتھ سائیکل چلاتا کسی بازی گر کی سی تیزی سے چلا جارہا تھا، جیسے کہیں ریس میں ہار نہ جائے، دائیں بائیں دیکھتا بھی جاتا کہ کوئی دوسرا یہ اعزاز چھیننے کو تو نہیں چل پڑا......

اب مجمع نیم کے سائے کی سمت بڑھنے لگا، جیسے یہ خود بخود فیصلہ ہو گیا ہو کہ کچی لسّی کی آمد کا انتظار نیم کے سائے تلے کیا جائے گا......جس کے عقب میں ٹیوب ویل جھاگیں اُڑاتا چل رہا تھا...... ٹیوب ویل کی ہودی میں نہاتے لڑکے اُس کے احترام میں فی الفور باہر نکل کر کپڑے پہننے لگے، اور پکی نالی پر کپڑے دھوتی عورتیں پنڈیں اُٹھا کر گھاس اٹی کچی منڈیر پر جا بیٹھیں۔

اُس نے نیم کے پیچھے ٹیوب ویل کے گہرے کنویں میں جھانکا۔

''ابھی تک اس پر چھت نہیں ڈلی۔ حالانکہ یہ اس گاؤں کا پہلا ٹیوب ویل ہے، جسے دیکھنے کو اردگرد کے گاؤں سے مہینوں، عورتیں اور بچے آتے رہے تھے حتیٰ کہ مشہور ہو گیا تھا کہ اس میں نہانے سے اولادِ نرینہ پیدا ہوتی ہے۔''

اُس کی بڑبڑاہٹ کے ساتھ فوقی کے بیٹے نے ٹیوب ویل کا شفاف پانی، اوک میں بھر کر اُسے پینے یا منہ دھونے کے لیے پیش کیا، جس میں پیلی پیلی دو نمکولیاں ٹپک گئیں۔

''آپ جی پہلے بھی یہاں آ چکے ہیں کیا؟''

''ارے آنا کیسا یہیں سے تو گیا ہوں۔''

اُس نے پکی ہوئی رسیلی نمکولیوں کا گودا چوسا، وہی ذائقہ، یہ دیہاتی ذائقے کبھی تبدیل کیوں نہیں ہوتے......

ایسی زبردست گاڑی، جدید لباس اور گھڑی، عینک والا اُن کا وطنی ہے۔ دھوپ میں تپ تپ کر جلدی بیماری کے سفید چٹاک بھرے سانولے چہرے کھلکھلائے۔

''آپ کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا جی۔''

''بعض لوگ ہوتے تو ہیں پر دکھائی نہیں پڑتے۔''

چھوٹے لڑکے اُس سے چار قدم پھر پیچھے ہٹ گئے اور عورتیں کپڑوں کی گٹھڑیوں میں تھاپے

باندھ کر چلنے لگیں۔

''تو پھر آپ چلیں ناپنڈ میں چلتے ہیں۔''

فوتی کا بیٹا اپنا پہلا میزبان ہونے کا حق کھونا نہ چاہتا تھا۔ اُس نے کھال کے پانی سے اُٹھتی بھاپ کو سیاں کی بیٹی کے چہرے پر دُھندلاتے ہوئے دیکھا، جو ابھی تک پکے روڑوں کا تسلا سر پر دھرے سائے کے باہر کھڑی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھ تسلے کی سمت بڑھائے۔''اُس بوجھ کو ابھی اُتار کے سائے میں آجاؤ...... سیاں کی بیٹی۔'' وہ بدک کر پیچھے ہٹی، جیسے یہ روڑ نہ ہوں اُس کی بھری جیب ہو جس پر کسی نے جھپٹا مارا ہو......

''اُسے باہر ہی رہنے دیں جی! چل ہٹ دُور ہو جا سیو گندی کی بیٹی۔''

لڑکے روڑے اُچھال اُچھال اُس کی سمت پھینکنے لگے۔

وہ سائے سے نکل کر سیاں کی بیٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''تم یہ روڑے مجھے مار سکتے ہو جب تک تمہارا جی بھر نہ جائے...... مجھے خوشی ہوگی...... تمہاری خوشی میں شریک ہو کر......''

ڈھیلے لڑکوں کے ہاتھوں سے چھٹ گئے۔

''صاحب جی! آپ کی گاڑی دھودیں۔''

کلو موچی کے بیٹے نے جھاگ اُڑاتے پانی میں ڈبو کر بالٹی ہاتھ میں تولی......

''نہیں بالکل نہیں۔''

اُسے معلوم تھا گاڑی دھونے کی اُجرت اگر وہ ہزار کے نوٹ کی شکل میں بھی دے گا تو بھی یہ نوٹ کبھی نہ دیکھنے کے باوجود وہ ہرگز اسے قبول نہ کریں گے۔ ان دیہاتیوں کی جان لیوا قناعت اور سخت جان خودداری اس کپاس کے پودے سی ہی ہے، جو سورج نگل نگل اور بھاپ پی پی خوب پھلتا پھولتا ہے مگر بارش کے چند قطروں سے ہی راکھ ہو جاتا ہے۔

اُس نے پیلے پھولوں اور سفید سولوں بھرے کیکروں کے جھنڈ تلے جگالی کرتی مِنی بھینس کو دیکھا......

''یہ احموں گجر کی نیلی نسل کی بھینس ہے نا؟''

اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ ارے جانور کوئی انسانوں جیسے ڈھیٹ تھوڑی ہوتی ہیں کہ بیس برس بعد تک جیتے رہیں۔ لڑکوں نے اُس کی اس اطلاع پر حیرت سے بھینس کو دیکھا اور اثبات میں سَر ہلایا۔

ایک قدرے جوان لڑکا سائیکل کھڑا کر کے مجمع میں کن سن لینے لگا۔

''پتہ نہیں کون ہے ہمیں سب کو جانتا ہے ہماری بھینسوں گائیوں کو بھی جانتا ہے۔ مگر خود.....''

''صابر کھوجے کے پوتے! تمہاری اس سال خربوزوں کی واڑی کیسی ہے۔''

دوسروں کے کان سے منہ لگا کر اُس سے متعلق معلومات لینے والا اپنی شناخت کی حیرت اور خوشی سے اُچھل پڑا......

''اس بار ہم نے خربوزے نہیں تربوز اُگائے ہیں۔ منڈی میں ان کی مانگ زیادہ ہے۔ فصل تو اس بار سارے پنڈ کی اچھی ہے۔ بارشیں زیادہ نہیں ہوئی نا اس لیے......''

اُس نے موتیا رنگ پھولوں سے بھرے کپاس کے کھیتوں میں دُور تک نگاہ کی گوڈی کی۔ گھٹنوں گھٹنوں دھنستی خشک دھول کے پہاڑ جھکڑوں پہ سوار دھکائی ہوئی دھوپ میں گندھتی سیاں کی بیٹی کو دھندلا گئے تھے۔

''سیاں کی بیٹی! تُو چھاؤں میں کیوں نہیں کھڑی ہو جاتی۔''

وہ دو قدم مزید پرے دھوپ کے اُبلتے کراہے میں اُتر گئی۔

''یہاں سے جاتی کیوں نہیں تُو، تیرا مردوں میں کیا کام......''

صابر کھوجے کے بیٹے نے اپنی مردانگی پر گرہ لگائی......

''ہے کس ماں کی بیٹی جو رات کے اندھیرے میں گاؤں کی عزت کی گٹھڑی سَر پر رکھ بھاگ گئی تھی۔''

''نہیں بھاگی نہیں تھی بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ صابر کھوجے کے بیٹے...... تجھے غلطی لگ رہی ہے۔''

''ایک ہی بات ہوئی نا جی...... اگر قبروں والا سائیں جاگ نہ رہا ہوتا تو بھاگ ہی چکی ہوتی نا۔''

''پر وہ تو کسی صورت بھاگنا نہ چاہتی تھی گاؤں والوں نے مل کر اُسے بھاگنے پر مجبور کیا۔''

لڑکے اُس کی اس غلط اطلاع پر زور زور سے ہنسے۔
''گاؤں والوں نے تو اسے مل کر پکڑا صاحب جی! پھر اُس کا منہ کالا کر کے جوتوں کے ہار پہنائے، گدھے پر بٹھا کر پورے پنڈ کے چکر لگوائے اور بڈھے طفیل سے نکاح کر دیا......''
لڑکے ہنسے تو جھکڑوں میں لپٹے دھول کے غبار، منہ، حلق، سر بھر کر سارے نقوش منہدم کر گئے۔
''اور اُس کا یار...... وہ تو بھاگ گیا پکڑا جاتا تو زندہ نہ بچتا۔''
لڑکے منہ کھول کھول کر پھر ہنسے اور رگ بھر بھر دھول پھیپھڑوں میں پھونکی۔
''تمہیں کیا معلوم۔ تم میں سے تو کوئی پیدا ابھی نہ ہوا تھا اُس وقت۔''
لڑکے اُس کی سادگی پر پھر ہنسے اور نتھنے اور حلق دھول کے انگاروں سے اٹ گئے۔
اُسے اپنے سوال پر شرمندگی ہوئی، شاید وہ اس گاؤں سے زیادہ عرصہ دُور رہا تھا جو کچھ بھول رہا تھا۔ ان دیہاتوں میں اہم واقعات ہوتے ہی کتنے ہیں۔ پچاس سو برس کی تاریخ میں یہی ایک دو قتل ایک ادھ ڈاکہ، دو تین ادھالے...... جن کی تفصیل اتنی بار اور اتنے پہلودار انداز سے دُہرائی جا چکی ہوتی ہے کہ آخر رومانوی کہانیوں کی طرح محفوظ ہو کر نسل در نسل منتقل ہونے لگتی ہے۔ اکو نائی کے بیٹے نے جھاڑی پہ سوکھتی دھلی ہوئی لنگی اُسے پیش کی۔
''صاحب جی! آپ نہا لیں......''
ہاڑ کی ہَوا درختوں سے روٹھ کر پتوں میں ساکت ہو گئی تھی، جس کے امس بھرے نوکیلے دانت پورے جسم پر گرمی دانوں کی چھانٹ نکوس گئے تھے...... جو سرکنڈوں کے پردوں سے چھید اور کٹ لگاتے تھے۔
''تم ابھی وہیں کھڑی ہو۔''
فوقی کے بیٹے نے نرمے کا پورا جھاڑ، اکھاڑ کر اُس کی سمت اُچھالا۔
''جیسی ماں ویسی بیٹی۔''
ضرب کھا کر سیاں کی بیٹی دو قدم پیچھے کھال میں اُتر گئی۔ روڑوں والا تسلہ سَر پر گھوما۔ روڑ جھنجھنا کر اندر ہی رگر رہے۔
''جاؤ ماں نیک بی بی کی قبر پر روڑ بچھا آؤ۔ فرشتوں کے گرز پڑ رہے ہیں۔ دھمک یہاں تک

آ رہی ہے۔''

فوقی کا بیٹا انتہائی سنجیدگی سے جملہ مکمل کر کے کان لگا کر آواز سننے لگا۔ لڑکوں کے قہقہوں کے ساتھ باڑ کے جھکڑ دیوانے ہو گئے اور پتوں، شاخوں کو مسلنے مروڑنے لگے۔

''آؤ سیاں کی بیٹی ہم تمہاری ماں کی قبر پر روڑ ڈالنے چلیں......''

وہ نرمے کے بیچوں بیچ منڈیر پر چلنے لگا، لڑکوں کا مجمع وہیں کھڑا رہا۔

''نہیں صاحب جی! آپ اُس کی قبر پر نہیں جائیں گے اُس کی قبر ہمارے منہ کی کالک ہے۔''

''لیکن مجھے تو تمہارے منہ پر کوئی کالک ملی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی...... چلو سیاں کی بیٹی ہم روڑ ڈالنے چلیں۔''

لڑکے کچھ وقت پنچائتی اصولوں اور مہمان کے احترام کی کشمکش میں کھڑے رہے آخر اُن کے قدم اُکھڑ گئے۔

''چلیں صاحب جی! ہم آپ کے ساتھ چلتے ضرور ہیں مگر اُس کی قبر پر نہیں جائیں گے۔''

کوری کجی میں سے بازو برابر لمبا تام چینی کا گلاس بھر کر اُسے کچی لسی تھما دی گئی تھی۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ ٹیلوں، ٹبوں بھرے رستے سے گزرتا ہوا پورا مجمع جب قبرستان پہنچا تو جیسے کسی دھول روڑ کے گتاوہ بھری لمبی سرنگ میں سے کئی روز گھسر گھسر کر باہر نکلے ہوں۔ قبرستان کی گھٹنوں گھٹنوں دھنستی دھول کے پہاڑی سلسلے میں سے گزر کر سیاں کی بیٹی نے ایک ہموار سی قبر پر روڑوں کا تسلہ اُنڈیل دیا۔ جھنجھنا جھنجھنا کر روڑ اِدھر اُدھر بکھرے، اُس نے دونوں مٹھیاں پھسلتے ہوئے روڑوں سے بھر بھر قبر کے تعویذ پر بچھائیں۔

''سیاں کی بیٹی یہ لڑکے دُور کیوں رُک گئے۔''

''اگر میری ماں گندی تھی تو اس میں میرا کیا قصور۔ روڑ بھی نہ ڈالوں کیا...... مینہ برسے اور سارے گھورے بن جائیں، بجو نکال لے جائیں اُسے......''

اُس نے بک بھر بھر پوری قبر ڈھک دی تھی۔

''نہیں سیاں کی بیٹی! تیری ماں تو بہت اچھی تھی...... بس اتنا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جینا چاہتی تھی۔ پر گاؤں والوں نے اسے جینے نہ دیا......''

دھوپ میں جلتی قبر کی کچی لپائی میں دراڑیں پڑ چکی تھیں......جس میں سے بھوسے کے تنکے منہ کے بل کھڑے نظر آتے تھے۔سرہانے کی پکی اینٹ پر کلر نے سفید سفید دھبے بنا ڈالے تھے بالکل ایسے جیسے سیاں کی بیٹی کی رنگت دھوپ میں تپ تپ ڈب کھڑب ہو چکی تھی۔

''تیری ماں مری کیسے سیاں کی بیٹی۔''

''منکھ (حسرت) کھا گیا اُسے۔''

اُس نے قبر کے پہلو میں بنے بل کو مٹی کی مٹھی بھر کر جلدی سے بند کرتے ہوئے لڑکوں کو سر گھما کر دیکھا......کہ کہیں دیکھ تو نہیں رہے ورنہ اُس کی ماں پر عذابِ قبر کا ایک اور طعنہ آ جائے گا۔

''اُس نے کبھی اُسے بھی یاد کیا سیاں کی بیٹی! جو اُس کے پکڑے جانے کے بعد خود پکڑے جانے کے خوف سے بھاگ گیا......''

ہاڑ کے بگولے بھرے جھکڑ کیکروں پر چڑھ گئے پتے اور پھول جھڑے اور دھول کے غباروں میں بگولے بن کر اونچی نیچی قبریں ناپنے لگے۔

''ہاں اسلم نام تھا اُس کا......میرا باپ جب بھی ماں کو مارتا۔اُس کا نام لے لے کر مارا کرتا تھا۔ماں تو کبھی اُس کا نام نہ لیتی لیکن رات کے پچھلے پہر جب میرا باپ جوگ (بیلوں کی جوڑی) کھول لے جاتا، ماں ریڑ کا ڈال کر بین کرتی۔تو ہر بین کے اخیر میں یہی نام آتا تھا۔ربا اُسے کبھی سُکھ نہ دینا جس نے میری ماں کو سدا اُڑلایا۔''

سیاں کی بیٹی کے آنسو چہرے پر تھپی دھول میں نالیاں بنا کر کیچڑ ہو گئے تھے۔

''سیاں کی بیٹی میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اُسے کبھی سُکھ نہیں ملا، جب کوئی سُکھ کی برسات میں بھیگ رہا ہو، مگر جلد کے اندر، گوشت کے تیل سے ہڈیوں کی لکڑیوں میں آگ کی بھڑک مچی رہے......تو یہ کسی بددعا کا اثر ہے یا جرم کی سزا ہے......تم ہی بتاؤ سیاں کی بیٹی۔''

''تو اس سے مجھے کیا......میری ماں پر لگا طعنہ تو نہیں ڈھل جائے گا......میرے ساتھ گاؤں کی لڑکیاں کھیلنا تو شروع نہیں کر دیں گی......میرے بھائی کو ادھلیڑ کا بیٹا کہنا تو نہیں چھوڑ دیں گے لوگ اور میری ماں کی قبر پر دُعا تو نہیں پڑھنے لگیں گے......''فوتی کا بیٹا تنگ آ کر قبر کے قریب آ گیا۔

''صاحب جی! وہ سائیں بابا آپ کو بلاتا ہے۔وہ اس کی ماں کے بھاگنے والا قصہ سُنا رہا ہے۔

اُسی نے تو پکڑا تھا۔اُس ادھیڑ کو...... اب تو بیچارہ اندھا ہو گیا ہے۔''

جڑوں والے برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھا سائیں بابا اپنی زندگی کے اس یادگار واقعے کی ہزارویں دُہرائی کر رہا تھا۔اُس کی آواز کا جوش ایسے ہی تھا جیسے وہ ابھی ابھی بھاگتے ہوئے پکڑی گئی ہو اور گرفت میں تڑپ رہی ہو اور جو ساتھ آکر بیٹھا تھا اور واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بار بار سوٹا درختوں کے تنوں سے ٹکراتا تھا۔اُسے وہ پہلی نظر میں پہچان گیا تھا۔فوتی کے بیٹے نے کہا۔

''یہ دادا عطا ہے اسی نے تو اُس گندی کو جوتوں کا ہار پہنا کر گدھے پر بٹھایا تھا۔''

لڑکے قہقہے لگا لگا کر ہنسے۔

سیاں کی بیٹی تسلے میں پانی بھر بھر قبر پر چھڑک رہی تھی، جیسے اپنی ماں پر فاحشہ اور بدکردار کے الزام کو دل سے تسلیم کر چکی ہو لیکن کیا کرے کہ اُس کی تو وہ ماں تھی، جس کی گور میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش وہ کر رہی تھی۔

نذرو چدھڑ کا بیٹا بندھا ہوا لال پونا لہراتا اُس کے پاس آکر رُکا۔

''صاحب جی! یہ میں گھر سے مرغی بھنوا کر لایا ہوں۔ساتھ میں چپڑی ہوئی روٹیاں ہیں۔ماں نے پنجیری بھی ڈال دی ہے۔آئیں وہاں بیٹھ کر کھانا کھائیں۔''

دونوں بزرگوں سے وقوعے کی کئی ہزارویں تفصیل سننے والے لڑکوں کا جوش وخروش کم پڑ چکا تھا، کیونکہ اُن کی دلچسپی کا مرکز اب اُن کا یہ اجنبی مہمان تھا، جو ہر ایک کو حسب نسب سے جانتا تھا، لیکن وہ اُسے ابھی تک نہ جان پائے تھے۔

''ہم کھانا یہیں کھائیں گے سارے مل کر......''

اُس نے پونے کی گرہ کھولی، فوتی کے بیٹے نے فی الفور پونے پر ہاتھ رکھ دیا......

''نہ صاحب! اس گندی کی قبر پر نہیں۔''

''ارے قبر کو گندا کہتے ہو...... میں جانتا ہوں اُسے، فوتی کے بیٹے! یقین کرو وہ اتنی ہی اچھی تھی جتنی اچھی تمہاری ماں ہے......''

فوتی کا بیٹا یوں پیچھے پھسلا، جیسے جسم تول کر اُس پر ابھی حملہ آور ہو جائے گا۔

''تم کہیں وہ تو نہیں ہو جو ماں کو ساتھ لے کر بھاگے تھے، پر ماں پکڑی گئی اور تم بھاگ گئے......

ماں مَر گئی اور تم اتنی بڑی گاڑی لے کر آ گئے۔''

وہ سیاں کی بیٹی کے حضور دوزانو جھکتا چلا گیا، جس کے سَر سے پانی بھرا تسلا پھسلا اور فوتی کے بیٹے کے سامنے پھسلن بنا گیا۔ سب سے پہلے خطرے کا اعلان کرنے والا اُس کا پہلا میزبان فوتی کا بیٹا ہی تھا جس نے جبڑوں کے دونوں اطراف ہتھیلیاں کھڑی کر کے کُوک ماری۔ کُوک اُس کے نابالغ حلق سے نکل کر بالغ ہوگئی۔ تکیے میں بیٹھے دونوں بزرگ اپنی جوانی کے اکلوتے کارنامے کو دُہراتے ہوئے خبردار ہوئے جیسے مدتوں بعد اب دوسرے کارنامے کی باری آئی ہو۔ نابینا سائیں کھونڈی ٹٹولتے ہوئے بھاگا، لیکن برگد کی داڑھی سے لپٹ کر لڑکھڑا گیا۔ لنگڑا بابا عطا بیساکھی گھما کر چلا تو منہ کے بل گرا لیکن دونوں کے حلق یکبارگی چِر گئے تھے۔

''اوئے مدعا پکڑا گیا۔ بھاگو...... دوڑو...... پکڑو...... اوئے اسلما اڑ یکے آ گیا......''

سیاں کی بیٹی کے سَر سے پانی بھرا ایک اور تسلا اُن کے قدموں میں گر گیا۔ گاؤں کے رستے پر آسمان چڑھی دھول کے غباروں میں جنگی نعرے اور سرپٹ دوڑتے قدموں کی دھمک لپٹی تھی۔

''بھاگ جاؤ۔ ورنہ یہ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ اسلمے بھاگ جاؤ۔''

سیاں کی بیٹی نے اُڑتی دھول کے پہاڑوں کو خوف سے دیکھا جیسے خون کی ندیاں چھلکتی بہتی چلی آ رہی ہوں۔

''سیاں کی بیٹی! یہ اب مجھے نہیں ماریں گے۔ یہ صرف اُسی کو مارتے ہیں جسے مار سکتے ہیں اور جسے نہیں مار سکتے اُس کے آسیب میں سہم جاتے ہیں۔''

اب تک لاٹھیاں، برچھیاں، ڈانگیں، کلہاڑیاں اُٹھائے پورے چک چوالیس کے مرد پہنچ چکے تھے اور اُس کے گرد دائرہ بنا کر اک دوجے کو آنکھوں کے اشارے دیتے تھے...... پہلے تم...... نہیں پہلے تم...... میں کیوں...... تم کیوں نہیں...... دونوں بزرگوں کی ہلا شیری کے باوجود مجمع گنگ تھا، جیسے دائرے کے بیچ کوئی حیرت انگیز مداری کا کھیل ہو رہا ہو، جس نے انہیں ساکت کر دیا ہو۔ اسلم نے سیاں کی قبر سے دو مٹھی مٹی بھر کر پتلون کی جیبوں میں بھری اور واپسی کے رستے کی سمت مُڑا اُس کے سامنے سے مجمع یوں چھٹا جیسے پولیس کی گاڑی نے ہوٹر مارا ہو۔ اک نئے کارنامے کو دُہراتا ہوا انبوہ اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا...... مگر اُس کے بوٹوں سے اُڑتے دھول تک کا فاصلہ رکھ کر۔ جب وہ گاڑی کا دروازہ

لاک کر کے اسٹارٹ کر چکا تو اُس نے دیکھا پیچھے دوڑتے دھول کے پہاڑی سلسلوں میں چمکتی بلمیں، برچھیاں، چھوئیاں، سوٹیاں، فضا میں لہرانے لگی تھیں۔ انبوہ جیسے ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ ہاتھ میں سے نکلتا شکار پکڑنے کو سرپٹ دوڑا تھا۔ اُس کی تیز رفتار گاڑی کے ٹائروں کے نشانات پر بے تحاشہ کچے پکے ڈھیلے آ کر پھوٹ رہے تھے اور چیخیں اور کوکیں اور للکارے ایک آواز میں سمٹ گئے تھے۔

''ڈرپوک بھاگ گیا۔ ہاتھ آجاتا سالا تو...... اسلما آرائیں۔''

لڑکیاں

کمرے میں گنگ تجسس لبالب بھرا تھا، جس میں لتھڑی ساکت بینائیاں ایک ہی مرکز میں گڑوں گڑوں لٹکی تھیں۔ لڑکیوں کی بارہ زبانیں نوک سے جڑ تک تجسس کا سیسہ پی گئی تھیں۔

بیچوں بیچ پھیلے چارٹ پیپر پر لائنیں اور دائرے کھنچے تھے، جن میں لکھے حروف تہجی پر کریم کی شیشی کا ڈھکنا پُر اسرار گردش کرتا تھا۔ کبھی A، کبھی F، کبھی G، پُر بھید رومانی جزیروں کے حیران کن محرابی در کھلے تھے۔

دو ہاتھوں کی شہادت کی اُنگلیوں کے دباؤ تلے ہَولے ہَولے رینگتا ہوا ڈھکنا جس کی گردش کے تار سے بارہ بینائیاں بندھی تھیں۔ جیسے یہ بے کار ڈھکن نہ ہو بلکہ قادر التقدیر ہو، جو ان لڑکیوں کے مستقبل کا سارا بھید جانتا ہو اور ابھی سب کچھ ان کے سامنے منکشف کرنے والا ہو۔

متجسس سانسوں کے تشنج میں ہونکتے ہوئے بائنٹی کی مس ہیلن نے کہا۔

''میڈم روبینہ! آپ اپنے بارے میں سوال پوچھیں۔''

میڈم روبینہ کی اُنگلی تلے پھسلتا ڈھکن چارٹ پیپر کے درمیانی دائرے میں گھوم رہا تھا۔ ڈھکن کی قید میں آئی رُوح پر جب کسی سوال کا بوجھ نہیں ہوتا تھا۔ تو وہ چارٹ پیپر کے درمیانی دائرے میں گردش کرتی رہتی تھی۔ گویا Standeasy حالت میں ہوتی تھی۔

میڈم روبینہ نے روح کے احترام میں دوزانو بیٹھے لفظوں میں باوضوی سرگوشی کی۔

''تم ہی پوچھ لو، ہاں تمہیں میرے بارے میں کچھ پوچھنا ہے تو خود ہی پوچھ لو۔''

لندن سے فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے والی مس روبینہ R-P,Z شفاف شو کیسوں میں سجے کھلونوں کے پہلو میں مچل مچل گئی۔ مسز ہیلن نے آنکھیں موندیں جیسے یسوع مسیح کی شبیہہ کے حضور بائبل مقدس کی تلاوت کرنے جا رہی ہو۔ پوروں سے صلیب کا نشان بنایا۔

''اے شیکسپیئر کی روح! مس روبینہ کی شادی جس شخص سے ہوگی اُس کے نام کے سپیلنگ بنا دیجئے۔

ڈھکنا سرعت سے گردش کرنے لگا، A-H-S-A-N

میڈم روبینہ کے پھیلے پھیلے لبوں پر کمتی کمتی اضطرابی ہُوک اُٹھی اور واپس طوفانی ریلوں میں غوطہ زن ڈوبنے اُبھرنے لگی۔''او مائی گاڈ! احسن!'' Oxford میں میرے ساتھ ہی تو تھا۔ لڑکیوں کے ہوسٹل کے بالکل سامنے اُس کا کمرہ تھا۔ ایک Sunday کو''میری'' جو فلپائنی تھی۔ اُسے کیا شرارت سوجھی جا کر احسن کے کمرے کی کال بیل بجا کر بھاگ آئی۔ پھر فلسطینی فاطمہ! چینی روز بھی جا تیں بیل دبا کر واپس بھاگ آتیں۔''

اَندر ہی اَندر دوڑتی ہر ہر ریلے سے ٹکراتی، لہر بہ لہر بھاگتی ہوئی سنسناہٹ، خلیہ خلیہ، بوٹی بوٹی لپٹتی ہوئی۔

''آخر میں میری باری تھی اور.....''اور میں نے ابھی کال بیل پر ہاتھ بھی نہ رکھا تھا کہ دروازہ، پٹ سے کھل گیا اور احسن.....''دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ لفظوں کو گدگدا گئی اور زبان کی باریک باریک سی چٹکیاں بھرلیں۔''

''احسن میرے سامنے کھڑا تھا.....احسن.....احسن۔''

لہو کی گردش کے ہمراہ کوئی بھاگتا، ہانپتا ہوا، جیسے آنکھوں اور ہونٹوں کے رستے باہر اُبل پڑے گا۔ بار بار سنی داستان کے ہر اُتار چڑھاؤ پر لڑکیوں نے پورا پورا رسپانس دیا۔ آخر کو تو پرنسپل کا بیان تھا۔ بیان جاری رہا۔ زبان لفظوں کے گدگدی کرتی رہی۔

''مجھے بھی فوراً بہانہ سُوجھا کہا''آج آپ ہمارے ساتھ ڈنر کریں'' پھر ہم سب لڑکیوں نے

اپنے اپنے کنٹری کی ایک ایک ڈش بنائی اور احسن......''

فشارِخون کو ناپنے والا آلہ نس نس کو بھینچنے اور چھوڑنے لگا، قصہ جاری رہا جیسے یہ کوئی واقعہ نہ ہو کوئی تحقیقی و تجزیاتی رپورٹ ہو جس پر ریسرچ کی ابھی کافی گنجائش باقی ہو۔لڑکیوں کے اپنے سوالات بدمزہ ذائقے کی طرح حلق میں گھل کر نشیب میں اُتر گئے تھے کیونکہ شیکسپیئر کی روح تو کل آنے کا وعدہ کر کے رُخصت لے چکی تھی۔

چھوٹے سے قصبے کے اس چھوٹے سے کالج کے سٹاف ہوسٹل میں مقیم بارہ لیکچررز اور ایک پرنسپل ساری ہی ایک ہنگامہ خیز منزل سر کر آئی تھیں، اور دوسری منزل کے بند دروازے کے کھلنے کی منتظر تھیں۔ جس کی ذرا سی چرچراہٹ کال بیل کی پکار بن ہوشیار کر دیتی، دوڑا دیتی، معلوم پڑتا یونہی کوئی شریر بچہ جاتے جاتے بٹن پر اُنگلی کا دباؤ دے کر بھاگ گیا ہے۔ کالج، یونیورسٹی، امتحانات، پبلک سروس کمیشن، سلیکشن، تقرری، ایک پُرشور تیز رفتار دور کے بعد پُرسکون چلنے والا عبوری دور جس کا تحرک محض انتظار کا جوار بھاٹا تھا، انتظار دوسرے دور میں داخلے کا ایک Phase کے اختتام پر، دوسری Phase کا آغاز کتنا ضروری ہوتا ہے۔ کتنا عزیز ہوتا ہے وہ مردہ جسے جلد از جلد دفنا دینے کی بے چینی لگی ہوتی ہے۔ کہیں اس عبوری دور میں گلنے سڑنے ہی نہ لگے۔

فارسی کی مس راشدہ نے دوراز ہ کھولا ''لڑکیو اُٹھو! شام کی چائے کا وقت ہو چلا ہے۔'' مس روبینہ نے اپنے لندن کے قصے کو التوا میں ڈالا، کیونکہ آج ارسطو کی روح نے پھر Ahsan کے سپیلنگ ہی بنائے تھے۔

''مس ہیلن! شیخ سعدی کی روح کو کال کرو اور مس راشدہ کے متعلق معلومات لو۔''

''نہیں مس روبینہ! رُوح غریب کو کاہے کو تکلیف دینی۔ اٹھارہ سال ہونے کو آئے اسی ہوسٹل میں۔ پھر میں ابھی تو نماز پڑھ کر آ رہی ہوں۔''

مس راشدہ کے ان بے رَبط جملوں میں شاید وہی رَبط تھا جو کسی ایک مضمون کی مختلف سرخیوں میں ہوتا ہے۔ جنہیں سمجھنے کے لیے متن کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔

لڑکیاں ڈائنگ ٹیبل پر آ گئیں۔

''مس راشدہ جی! اتنے مزیدار پکوڑے لیکن اتنے کم، سب نے ایک ایک دو دو پکوڑے جھپٹتے

ہوئے خالی پلیٹ کو حسرت سے دیکھا۔

''آج شام کی چائے پر نجمہ اور فاخرہ کی ڈیوٹی تھی لیکن وہ تو ارسطو کی روح میں ایسی اُلجھیں کہ کچھ یاد ہی نہ رہا، عصر کی نماز کے بعد میں نے چائے چڑھائی۔''

''مس راشدہ جی! یہ کون سی نئی بات ہے۔ جب بھی ڈیوٹی والی لڑکی سو رہی ہوتی ہے یا کچھ پڑھ رہی ہوتی ہے یا پھر روحوں میں اُلجھی ہوتی ہے تو آپ کسی کو کب ڈسٹرب کرتی ہیں۔ اُس کے حصے کی ڈیوٹی خود ہی تو کر لیتی ہیں اور مس فوزیہ کی ڈیوٹی تو خیر...... وہ ایم فل جو کر رہی ہے...... بیچاری......''

مس گل لالہ کے لبوں سے بیچا نکلنے کے بعد حلق کی سمت بہتی لمبی ری ای کے ساتھ ہی لڑکیوں نے کپوں میں سر یوں گرا دیئے جیسے اندر اتر کے تیرنے کا خیال ہو۔

مس راشدہ نے دیوار پہ چسپاں ڈیوٹی لسٹ پر نگاہیں جما دیں۔

''خیر! ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں، رات کے کھانے پر عابدہ اور زاہدہ کی ڈیوٹی ہے۔'' پھر سوائے فوزیہ کے ساری نظریں مینو لسٹ پر اُٹھیں۔

''آج دال چاول پکیں گے۔ مس راشدہ جی تھوڑا دہی بھی منگوا لیجئے ،میس فیس کم پڑ گئی تو اور جمع کر لیں گے فکر نہ کریں......''

لڑکیوں کے بھرپور قہقہوں میں مس راشدہ کی دبی دبی مخصوص مسکان ذرا پھیل گئی، جیسے اگربتی سی دھکی ہو۔

زاہدہ اور عابدہ کچن میں گھس گئیں، باقی لیکچررز باہر نکل آئیں۔ کالج کی عمارت کے اطراف میں پھیلے گراؤنڈوں میں ہوسٹل کی لڑکیاں پھولوں کی کیاریوں کے اِردگرد بکھری تھیں، لیکچررز کو بیڈمنٹن کورٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر لڑکیاں اپنے ریکٹ اور شٹل کاک اُٹھا باہر نکل گئیں۔ مس راشدہ اور انگریزی کی مس فوزیہ کالج کی بلڈنگ کے گرد چکراتی روش پر گھومنے لگیں۔

اپریل کا شباب پھول پھلواری میں، پتوں پودوں میں، چہروں، مزاجوں میں، منہ زور طوفانی ریلوں کی مانند اُمڈا پڑ رہا تھا، جس کی بلاخیزی کے سامنے ہر کیاری، ہر بیل، ہر باڑ، ہر پیڑ مغلوب ہو فاتح کا علمدار بنا بیٹھا تھا۔

''مس راشدہ جی! کیا آپ بھی روحوں والے کھیل پر یقین رکھتی ہیں، بھلا روحیں ہمیں مستقبل

بلکہ رشتوں کا حال کیا بتا سکتی ہیں۔''

پرنسپل آفس کے ستونوں سے لپٹی بیلوں سے جھڑی کی طرح برستے عنابی و دھانی پھول فوزیہ پر یوں نچھاور ہو گئے، جیسے سکول کے بچے مہمانِ خصوصی کے نشانے لگا لگا کر پھولوں کی مٹھیاں بھر بھر پھینکتے ہیں۔

''اتنی لمبی لمبی بے کار شاموں اور اس منہ بند انتظار کی کوئی تفریح تو ہونا چاہیے نا۔''

پرنسپل آفس کی عقبی دیوار سے ٹنگے نوٹس بورڈ کی جالی میں مس راشدہ نے آنکھیں دھنسا دیں۔ جہاں لگے نئے نوٹس میں اگلے ہفتے ہونے والے کانووکیشن میں شمولیت کے لیے ڈگری ہولڈرز کو ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

''کیا یہ تفریح ہے؟''

فوزیہ نے عنابی، دھانی پھولوں کی دوسری کھیپ کو خود پر سے جھاڑا۔

''عبوری دور کی تفریح تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ منتیں مانگنا، کھانے بانٹنا، دیگیں چڑھانا، درگاہیں، عامل پیر، پیڑوں کی شاخوں پہ بندھی سیاہ ٹاکیاں اور قبروں کے تعویزوں پہ لہراتے جھنڈے، منہ بند انتظار کے چوبھے ہی تو ہیں۔''

مس نگہت اور نجم نے گردنیں گھما کر اُنہیں دور تک دیکھا اور نجم نے پکار کر کہا۔

''پکے پھوڑے کو سوئی چبھوتے رہنا ضروری ہوتا ہے ورنہ پتہ کیا ہوتا ہے۔ کیا......؟'' نجم کی آنکھیں خوفناک تصور نے میچ دیں اور جو کچھ ہوتا ہے وہ سب کچھ مس راشدہ کی آنکھوں سے بوند بوند پرنالہ سا بہہ نکلا، فوزیہ پرنالے کی کاٹ دار دھار سے بچنے کو چڑ چڑی ہو گئی ''لیکن یہ سب خود فریبی ہے۔''

تو پھر تفریح کیا ہوتی ہے۔ ڈرامہ، فلم، تاش، لوڈو، گپ بازی خود کو ہی بہلانے کو اذہان کی اختراع شدہ خود فریبیاں ہی تو ہیں۔ ارے چھوڑو پرے، یہ دیکھو، ڈگری ہولڈرز کے لیے سفید لباس، سیاہ گاؤن اور سیاہ جوتے تو لازمی کر دیئے جاتے ہیں لیکن یہ Compulsion بھی ہونی چاہیے کہ ادھورے اور پورے بچے ساتھ لانا منع ہیں۔ دیکھنا تم اُس دن، ایک دو سالہ اولڈ سٹوڈنٹ...... پہلے بچوں اور شوہر کا تعارف کرواتی ہیں پھر اپنا نام بتاتی ہیں۔ پہچانی تھوڑی جاتی ہیں، پوری عورتیں......''

مس راشدہ کے گال یوں تمتما گئے جیسے نوٹس کے پیچھے کوئی چھپا ہوا شرمناک منظر جھلک دکھا گیا ہو۔

''میڈم روبینہ کو دیکھیں، Oxford University سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے اور پرنسپل بننے کے باوجود اندر سے وہی خود فریب لڑکی۔'' فوزیہ کا تو پہلا کانوکیشن تھا اُسے ان شرمناک مناظر کی کیا خبر۔ مس راشدہ نے نوٹس بورڈ سے جڑے سَر کو پیچھے گھمایا۔

''گمشدگی اور بیماری مخمصہ اور انتظار، انہیں بھی سانس لینے کو آکسیجن چاہیے عمل تنفس کا رکنا تو موت ہے نا'' لیکن مس راشدہ نے کچھ کہا بھی نہیں اور فوزیہ نے کچھ سنا بھی نہیں۔ دوسرے چکر میں پھر سامنے سے آتی نگہت اور نجم نوٹس بورڈ کے سامنے رُک گئیں۔ نگہت نے کہا۔

''فوزیہ تمہارے پاس گاؤن ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ مانگنے تانگنے کی بجائے اس ویک اینڈ پر ہیلن لاہور جائے تو اس سے اپنے اپنے منگوا لیتے ہیں، اب ساری عمر ہی تو ضرورت رہنی ہے اُن کی......''

دونوں لڑکیاں جن کی عمروں میں اٹھارہ برس کا فرق تھا۔ اٹھارہ برس بعد کی لڑکی جس کا کڑی دُھوپ سا جوبن گھنیرا سایہ بن اپنی محفوظ مٹھی میں لڑکی ذات کو ڈھانپے تھا۔

اٹھارہ برس پہلے کی لڑکی جس کا ڈھلتی چھایا سا جوبن، چمچلتی دھوپ میں سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی یتیمی عریاں کیئے دیتا تھا۔

''مس راشدہ جی! آپ روحوں سے کیوں کچھ نہیں پوچھتیں۔''

سنبل کے اُونچے پھیلے پیڑ سے جھڑ جھڑ اَن گنت روئی کے گالے دونوں لڑکیوں پر برس برس کر ہوا کی بند مٹھی میں کہیں گم ہو جاتے۔ فوزیہ کو بھی نفسیاتی تجزیے کی ضرورت تھی جہاں سُوئی اَٹک جاتی دِنوں وہیں اَٹکی رہتی۔

مس راشدہ کے لبوں پر پھیلی مسکان کو صندل دھونی نے کھلکھلا دیا۔

اٹھارہ برس ہوئے اسی ہوسٹل میں بسر کرتے ہوئے۔ ہاں البتہ تم بتاؤ اُس روز جو خواتین تمہیں ملنے کالج سٹاف روم میں آئی تھیں اور بعد میں تمہارے گھر بھی گئیں تو پھر......

''تو پھر...... مس راشدہ جی! وہی سٹیٹس پرابلم۔ مس میچ تو ڈریس بھی برا لگتا ہے۔ یہ تو پھر ذات کا، اذہان کا، اجسام کا میچ ہے۔''

''بات تو یہی ہے کہ رائٹ میچ رائٹ ٹائم کو نگل جاتا ہے اور پھر رائٹ مین رانگ ٹائم کے

اوجھلے میں گم ہو جاتا ہے اور روحوں نجومیوں اور فالوں کا ٹھیکیدار بن جاتا ہے۔'' پتہ نہیں مس راشدہ نے یہ کہتے ہوئے اُس کی سمت دیکھا یا کچھ نہ کہتے ہوئے دیکھا۔

البتہ مس نگہت نے پکار کر کہا۔ ''فوزیہ تمہارے پاس وائٹ ڈریس ہے نا۔''

چاروں لڑکیوں نے بیک وقت فلسفے کی مس مقصودہ کو خشک فوارے والے لان کے گرد چکراتے ہوئے دیکھا، آپ ہی آپ بڑبڑاتی اور مسکراتی ہوئی۔ کڑک مرغی سی۔ جس کے سینے کو انڈے موجود نہ ہوں لیکن وہ پر پھیلائے کڑکڑ کرتی ہر ایک سے چھپتی ہر ایک پہ جھپٹتی، پھڑ پھڑاتی ٹھونگتی یہاں وہاں دبک رہی ہو، اردگرد گھومتی لڑکیوں کی ٹولیاں گنگنا رہی تھیں۔

دیواروں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے
مَیں بھی پاگل ہو جاؤں گا ایسا لگتا ہے

رات کھانے کی ٹیبل پر کھانا تو چنا ہوا تھا۔ سلاد رائتہ بھی موجود تھا لیکن عابدہ اور زاہدہ غائب تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو کوئی خاص تشویش نہ ہوئی کیونکہ یہ معلومہ بات تھی کہ یقیناً دونوں کی لڑائی ہو چکی ہوگی، شاید کوئی گرلز ہوسٹل کی لڑکی سٹاف ہوسٹل میں آئی ہو اور زاہدہ نے اُس سے ہنس کر بات کر لی ہوگی اور پھر زاہدہ پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہوگئی ہوگی۔ اس جرم کی پاداش میں وہ عابدہ پر جھپٹ پڑی ہوگی، اُس نے دیواروں میں سر مار مار یا چھری سے کٹ لگا لگا خود کو زخمی کر لیا ہوگا، اور اب دونوں کمرے میں بند ہوں گی، اور ایک دوسری کو نوچ بھنبھوڑ رہی ہوں گی۔

مس ہیلن نے کہا'' کھانے کے بعد فرائڈ کی سول (Soul) کو کال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ زاہدہ اور عابدہ کی شادی کب ہوگی؟''

مس راشدہ نے گہری ہمدردی کو منہ کے نوالے میں لپیٹ کر حلق میں اُتارا۔

''لڑکیو! ہر نماز میں دُعا کیا کرو کہ ان میں سے کم از کم ایک کی شادی جلد ہو جائے۔ وجود کی گھٹن کو جزو خون بنا لینا ہر ایک کا ظرف نہیں ایسے حبس موسم میں آندھی بارش کا آنا فطرتاً ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ فضا زہر آلود ہو جاتی ہے اور بیماریاں پھیلا دیتی ہے۔''

''ہمارے ہاں تو بس آندھی ہی آتی ہے بارش تو دور کہیں پہاڑوں پر برس کر فارغ ہو جاتی ہے۔''

فزکس کی مس عامرہ نے اپنے چینی فیس کٹ کو مزید پھلا کر کہا اور ساری لڑکیاں تادیر ہنس ہنس کر نوالے نگلتی رہیں اور پھر یکبارگی یوں چپ ہوگئیں جیسے فیصلہ نہ کر پارہی ہوں کہ آخر وہ کس بات پر ہنس رہی تھیں۔

جب زاہدہ اور عابدہ پَر پھلائے چونچیں سرخ کیئے کھانے کی میز پر آئیں، تو مس گل لالہ نے تقریر کے انداز میں میز پر مکا مارا۔

''مس راشدہ جی آج چا کبار آئس کریم چلے گی۔ میس فیس کم پڑ گئی تو اور جمع کر لیں گے۔''

ساری لڑکیوں نے Hip, Hip, Hurray کے چھت شگاف نعرے لگائے اور آئس کریم کے مختلف Flavours پر محققانہ بحث کرتی ہوئیں، ٹی وی روم میں جمع ہوگئیں، جہاں مشہور پاپ سنگر اپنے ہٹ گانے پر ایک انبوہ کے ہمراہ اور رنگ برنگ دھوؤں کے بیچ کرب ناک دھما چوکڑی مچا رہا تھا۔ مس عامرہ نے ہوائی بوسہ ٹی۔ وی سکرین کی سمت اُچھالا، اور اپنی ہتھیلی پولیٹیکل سائنس کی مس نویدہ کی سمت پھیلا دی۔

''دیکھو تو بھلا میری شادی کا کچھ امکان اس سنگر سے ہونے کا ہے یا کہ نہیں۔'' ہاتھ میں مٹی مٹی لکیر نظر آنے کے بعد حافظ کے دیوان سے فال نکالی گئی اور فال کی روشنی میں ستاروں کے علم سے مدد لی گئی۔

ساری لڑکیوں کی ہتھیلیوں میں کھجلی ہونے لگی تھی، دماغ کی لکیر، دل کی لکیر، عمر کی لکیر، بیرون ملک سفر کی لکیر اور منگنی اور شادی کی لکیر، سبھی ہتھیلیوں میں تو موجود تھی۔ بس اک ذرا ستاروں کی گردش میں وقت کا تعین باقی تھا۔ جس کا حساب کتاب وقت کی اہم ضرورت تھی۔ لائبریری کا آدھا فنڈ تو علم نجوم کی کتب خریدنے میں جاتا۔ جن پر لائبریری نمبر لگ کر ایشو ہو جاتی تھیں، اور پھر واپس لائبریری میں کم ہی جاتی تھیں۔ طالبات تو بس ڈھونڈتی ہی رہ جاتیں علم نجوم تو بس پروفیسروں کے تکیوں تلے آرام کرتے تھے۔

Saggitarius اور Leo کا جوڑ ایک دم مناسب Cancer کی لک اور لیڈرشپ، Taurus کی کانسٹنس اور مستقل مزاجی ایک بھرپور لائف بنا دیتی ہیں اور......اور......

طویل کوری ڈور کے دونوں اطراف کلاس رومز طالبات سے ٹھنسے ہوئے ہوتے سٹیج پہ رکھے

ڈائس پہ کھڑی لیکچرارز پُر مغز لیکچرز دے رہی ہوتیں۔ یہ سب لیکچرز اپنے اپنے مضمون میں ماسٹر کمانڈ رکھتی تھیں۔ کیونکہ وہ جس طبقے سے تھیں، اس کی کمزور کچی دیوار کسی چور دروازے کا بار ہی نہ سہارتی تھی۔ یا پھر جگہ چھوڑی ہی نہیں جاتی تھی۔ ٹاپ کلاس میرٹ کے سوا کوئی دوسرا راستہ بنتا ہی نہیں ہے۔ سامنے پڑے ڈسکوں کے نیچے نیچے ہاتھوں ہاتھ پرچیاں گردش کر رہی ہوتیں۔

''میڈم آج خوش لگ رہی ہیں۔ شکر ہے آج وہ سڑا بسا سبز سوٹ نہیں پہنا جس کے پانچوں کی سلائیاں تک سفید ہو چکی ہیں۔''

''لیکن میڈم کا ناک کمال کا ہے۔ میڈم نے جو کلر پہن رکھا ہے Same ایسا میرے پاس بھی ہے۔ لگتا ہے آج میڈم کو سویرے سویرے کوئی خوش خبری ملی ہے۔ اسی لیے تو میرے چہرے پر سائل دیکھنے کے باوجود مجھے ڈانٹا نہیں۔''

کاغذ پہ بنی میڈم کی شبیہہ پر مختلف تبصرے رقم ہوتے چلے جاتے۔ پیریڈ ختم ہونے تک پیپر بھر چکا ہوتا۔ میڈم کا محاکمہ مکمل ہو چکا ہوتا۔

پیریڈ ختم ہونے کے بعد لڑکیاں اپنی اپنی پسندیدہ پروفیسرز کے پیچھے بھاگتیں ہاتھوں میں پھول لیے وش کارڈز پکڑے پتہ نہیں مس سوتے میں کیسی لگتی ہوں گی کھاتی کیا ہوں گی۔ لفظ کھاتی ہوں گی۔ سوچتی کیا ہوں گی۔ کتابیں سوچتی ہوں گی۔ کس قدر عالمانہ سوچیں ہوں گی، اقبال، رومی، افلاطون، ارسطو ایسی ہی سوچوں کی تو پیداوار ہیں۔

یہ عاشق لڑکیاں اپنی محبوب پروفیسر کا مضمون منتخب کرتی تھیں۔ چاہے وہ اُن کے لیے کیسا ہی اجنبی کیوں نہ ہو۔ اپنی کلاس چھوڑ کر محبوب پروفیسر کی کلاس میں بیٹھتی تھیں۔ چاہے حاضریاں شارٹ ہونے کی بنا پر داخلہ روک دینے کا ڈراوا ہی کیوں نہ دیا جائے۔

کالج میں تو یہ خبر بھی عام تھی کہ اکنامکس کی پروفیسر مس قمر اپنی سٹوڈنٹ نادیہ پر مرتی ہیں، اسی لیے تو اُسے لیے ایک کونے میں پہروں بیٹھی بظاہر پڑھاتی رہتی ہیں۔ افواہ اُڑی وہ کالج کے اوقات میں ٹیوشن پڑھا رہی ہیں۔ میڈم روبینہ نے Explaination کال کرائی۔ اُنہی دنوں مس قمر کی منگنی ہو گئی اور یہ خبر چپڑاسیوؤں اور چوکیداروں کے منہ تک آئی کہ نادیہ نے خودکشی کی کوشش کی اور ناکامی کی صورت میں اُس کی شادی قمر سے بھی پہلے طے کر دی گئی اور مس قمر نے اُس کی مہندی پر ڈھولک بجا بجا کر

ڈھولک کے تندوے اور اپنا گلا دونوں پھاڑ ڈالے۔

مس فوزیہ کی پسندیدگی کا تناسب ایک اور گیارہ تھا۔ والی بال کی پلیئر صائمہ پر سینکڑوں لڑکیاں مرتی تھیں، لیکن خود وہ مس فوزیہ کی عاشق تھی۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ مس راشدہ بھی فوزیہ پر مرتی ہیں۔ اسی لیے تو صبح اذانوں کے وقت ساری لیکچرارز کو دروازے پیٹ پیٹ جگاتی ہیں۔ ''اُٹھو نماز پڑھو، وقت تنگ ہے۔ بس اب اُٹھ جاؤ۔''

اور اپنی روم میٹ فوزیہ کو ہلاتی تک نہیں، اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول باتھ روم جاتی ہیں لائٹ تک نہیں جلاتیں کہ کہیں فوزیہ ڈسٹرب نہ ہو اور خود ہی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔

''لڑکی غریب! رات دو بجے تو سوتی ہے ایم۔فل جو کر رہی ہے۔ چلو باقی چار نمازیں تو پڑھ لیتی ہے نا۔''

کھانے پر فوزیہ کی جس روز ڈیوٹی ہوتی ہے اُس کے کچن میں پہنچنے سے پہلے کھانا تیار ہوتا ہے اور مس راشدہ بڑبڑاتی ہوئی سلاد کاٹتی ہوئی ملتی ہیں۔

''بیچاری لڑکی کہاں کبھی اس نے کام کیئے نوکروں نے کر کے سامنے رکھے۔'' آخر ایک روز سوشل ورک کی مس گل لالہ نے کہہ ہی دیا۔

''مس راشدہ جی! آپ اسے کاہے کو تکلیف دیں گی۔ وہ آپ کی لیلیٰ جو ہوئی۔'' اُس روز سے فوزیہ کی غیر موجودگی میں اُس کا نام لیلیٰ پڑ گیا۔

اگر فوزیہ کو اس کی بھنک بھی پڑ جاتی تو اپنی خاندانی برتری اور انا پسندی کے ہاتھوں شاید استعفیٰ دے واپس گھر جانے پر مجبور ہو جاتی لیکن جب پروفیسر عبدالحئیٰ اپنے بیوی بچوں سمیت مس راشدہ سے ملنے آتے ہیں۔ تو پھر فوزیہ ہی چائے کے ساتھ کباب پکوڑے تلتی ہے اور ٹرے سجا کامن روم میں بھجواتی ہے۔ گیٹ کیپر اکبر خان ریٹائرڈ Batman اپنے دراز قد کو آدھے سے زیادہ دہرا کر کے چائے اور دیگر لوازمات اُن کے سامنے چنتا ہے۔ کالج میں یہ خبر عام تھی کہ پروفیسر عبدالحئیٰ اٹھارہ برس پیشتر مس راشدہ پر پہلی ہی نظر میں مر مٹے تھے۔ جب مس راشدہ کی پہلی تقرری اس کالج میں ہوئی تھی اور دور پار کی رشتہ داری کی بنا پر پروفیسر صاحب کی اماں مس راشدہ سے ملنے آئی تھیں تو ساتھ اُنہیں بھی لے آئی تھیں، اُس وقت مس راشدہ کا کلف لگا چنا ہوا سفید دوپٹہ، اُن کے چہرے کی مہتابی کے سامنے پھیکا پڑ گیا تھا۔

انگلیوں کے ناخن عنابی نیل پالش میں رنگے تھے اور لپ اسٹک ایسی گہری گلابی تھی گویا مشاطہ نے باریک برش کی نوک سے محراب اور قوس کھینچ بیچوں بیچ آتش دہکا دی ہو۔ پروفیسر صاحب تو اس آتش کی حدت سے بولا گئے لیکن اماں سے رہا نہ گیا۔ بائیں کلے کی جڑ میں گلوری ٹھونستے ہوئے بولیں۔

''اے بیٹا! کنواری لڑکی کو ایسا سنگھار مناسب نہیں۔'' اور مس راشدہ جب جواب میں مسکرائیں تو ہونٹوں گالوں اور آنکھوں کے سارے گلابی عنابی رنگ بلوریں دوپٹے کے جام میں چھلک گئے۔

''ارے بڑی خالہ! سنگھار کاہے کا میں تو ابھی وضو کر کے آ رہی ہوں۔'' اُنہوں نے دوپٹے کی کھردری سطح جب چہرے پر بے دردی سے رگڑی تو بلش ان کے سارے رنگوں میں لتھڑا برش پورے چہرے پر بے ترتیبی سے پھر گیا اور پلکوں کی باڑ میں مسکارے کی تہہ خشک ہوگئی۔

اماں نے دوسری گلوری دوسرے کلے میں دبائی اور وہاں سے اُٹھیں تو سیدھی ریلوے اسٹیشن پہنچیں اور مس راشدہ کے گھر جا دستک دی لیکن گیند ایک ہی ہٹ میں گراؤنڈ سے باہر جا گری۔

مس راشدہ کی نانی کو پروفیسر صاحب کی شرعی داڑھی پر شدید اعتراض تھا اور پھر نہ تو شرعی داڑھی منڈھی اور نہ ہی نانی کی ناں ہاں میں بدلی آخر کو تو لکھنؤ والی تھیں۔ دلی والوں کے سامنے کیسے پیچ کھا جاتیں اور دلی والی نے بھی پیک پہ پیک اُگلتے اور گلوری پہ گلوری نگلتے ہوئے کہا راشدہ کی ڈولی اُٹھنے سے پہلے بہو گھر نہ لے آؤں تو مرزا حاتم بیگ کی بیٹی نہ کہلاؤں۔ مس راشدہ اب بھی وضو کرنے کے بعد ہونٹ گال ناخن ویسے ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ جن کے کچے رنگ چھٹ کر پروفیسر صاحب کی آنکھوں میں اُتر گئے ہیں۔ رنگوں کی پٹاری آنکھوں کو پروفیسر صاحب فرش پر جماتے ہیں تو بس جمائے ہی رکھتے ہیں۔ جیسے اس فرش میں کچھ کھو جنے ہی تو آئے ہوں اور جب فرش کی سختی اور سنگینی نگاہوں کو پتھرا دیتی ہے اور کباب پکوڑوں کی پلیٹیں خالی کر کے بچے ان سے کھیلنے لگتے ہیں تو وہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے یوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جیسے ڈر ہو کہ کہیں رنگوں کی پٹاری اوندھا نہ جائے اور ہر بار واپسی پر وہ اپنی بیوی سے کہتے ہیں۔

''زمرد! راشدہ کا کہیں رشتہ کروادو۔ اللہ تم سے خوش ہوگا لیکن کسی بہت اچھے انسان سے، جیسے وہ خود......اچھی سی، پیاری سی......''

زمرد اپنے تھار تھار وجود کو تین جھٹکے دے کر اُٹھتی ہے تو بوٹی بوٹی، نس نس نجانے اتنی دیر بعد تک

کیوں تھرتھراتی رہ جاتی ہے۔ جیسے کوہ ہندوکش میں ہزاروں میل نیچے کہیں زلزلہ آیا ہو اور زمین دور دور تک کانپ گئی ہو۔

''اچھی کا تو معلوم نہیں لیکن یہ...... پیاری کدھر سے ہوئی پھٹے ہوئے زرد ہونٹوں سے ڈھلکتے لٹکتے راکھ گالوں سے، یا الرجی زدہ ہاتھ پیر سے۔''

پروفیسر صاحب جب فرش سے نظریں اُٹھاتے ہیں تو اُس وقت رنگوں کی پٹاری میں کچا قیمہ بھر جاتا ہے جسے قصاب کاٹو کہ باریک سے باریک تر کرتا چلا جا رہا ہو۔

''تم اُسے کہو نا ذرا رنگ لگا لیا کرے، سبھی تو لگاتے ہیں۔'' رنگوں کی پٹاری تیز دُھوپ میں سوکھنے لگتی ہے۔ بھول جائیں کہ وہ کیا تھی یاد رکھیں کہ وہ کیا ہے۔ سڑے گلے پھل، پھول چاہے کیسی ہی خوبصورت طشتری میں سجا دو کوئی نہیں خریدتا۔'' وہ بڑی لڑکی کی چوٹی کو اتنا کس کے بل دیتی ہیں کہ لڑکی بلبلا کر اُٹھ بھاگتی ہے ''امی جلد ادھیڑ دیں گی کیا۔''

پروفیسر عبدالحئی اپنی شرعی داڑھی کو کھجلاتے رہ جاتے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں یہی تو بھول نہیں سکتا۔

اُس روز سٹاف روم میں ایک ہنگامہ مچا تھا، پیریڈ مس ہو رہے تھے لیکن آج کسی کی نظر گھڑی پر نہ تھی۔ گویا ساری کلائیوں پہ بندھی گھڑیاں نبض کی تیز ہوتی ہوئی سوئیوں نے بند کر دی ہوں، ہسٹری کی مس بشریٰ سب کے بیچوں بیچ گھری کھڑی تھی۔ اُس کی گردن میں ایسا تناؤ تھا۔ جیسے حسن کارکردگی کے صدارتی تمغے کے لیے اس سال اسی کا انتخاب ہوا ہو اور چہرے پہ وہی نکھار تھا، جو روح کی کسی انتہائی خفیہ انتہائی حساس پرت سے پھوٹتا ہے اور نس نس بوٹی بوٹی میں کوندے بھر دیتا ہے۔ جس کی چمک معمولی چہرے کو غیر معمولی بنا ڈالتی ہے اُندر ہی اندر ری ورس گیئر لگتا ہے تو چہرہ دس برس پیچھے کی شادابی و معصومیت کے حوض میں دھل دھل کے کسی بلیچ کریم کا اشتہار بن جاتا ہے۔

پھر یہ خبر سٹاف روم سے نکلتی پرنسپل آفس سے ہوتی ہوئی کلاس روموں اور کینٹین پر موضوع گفتگو تھی کہ مس بشریٰ کی منگنی ہوگئی۔ ہوسٹل میں شام کی چائے کے ساتھ مس بشریٰ کی منگنی کے لڈو پلیٹ میں سجے قمقموں کی مانند دمکتے تھے۔ مس راشدہ نے بسم اللہ پڑھ کر بشریٰ کو لڈو چکھایا اور پھر اُس کا جھوٹا باقی لڑکیوں کو کھلایا۔ ایک ہی لڈو بارہ لڑکیوں نے چکھا لیکن کسی اعلیٰ درجے کے ناپ تول کے پیمانے

سے کہ ذرا سا حصہ پھر بھی بچ گیا کہ مس راشدہ چٹکی میں یہ ذرہ بھرے گڑ بڑا گئیں اور پھر اُنگلی اور انگوٹھے کی پوریں زبان پر رکھ لیں، لڑکیوں نے یوں تالیاں بجائیں جیسے اُنہوں نے کوئی کمال کی پرفارمنس دی ہو اور جب سب لڑکیاں مل کر دعا کر رہی تھیں کہ سب لڑکیوں کی قسمت میں بشریٰ جیسی خوشیاں لکھی جائیں تو اُس وقت مس راشدہ کے چہرے پر وہی سارے رنگ بکھر گئے تھے جو اٹھارہ برس پہلے اس وقت بکھرے تھے جب پروفیسر عبدالحئی کی والدہ نے اُنہیں میک اَپ کرنے پر ٹوکا تھا۔

لڈو بڑا متبرک تھا کہ وہ لمحہ قبول دُعا کا تھا۔

اگلے ویک اینڈ پر مس زاہدہ لڈو لے پلٹیں۔ زاہدہ کی منگنی کی خوشی اُس سے بھی زیادہ دوسری لڑکیوں کو ہوئی۔ جیسے اُن میں سے ہر ایک کا کوئی ذاتی مسئلہ حل ہو گیا ہو اور میز بجا بجا کر سب نے مل کر گایا۔

زاہدہ کو مل گیا بلما، زاہدہ عابدہ کو چھوڑ چلی۔

اگلے ویک اینڈ کے اختتام پر مس زاہدہ اپنے نکاح کے لڈو لے آئیں اور پھر زاہدہ اور عابدہ دونوں ایک ہفتے کی چھٹی لے کر شادی کی شاپنگ کے لیے پشاور چلی گئیں۔

سٹاف ہوسٹل موتی چور لڈو کی طرح پھوٹے پڑ رہا تھا، جس کے بسنتی رنگ چراغوں کی سی حدت بھڑکاتے تھے، سٹاف ہوسٹل کی شامیں زردے کی دیگ کی طرح دم پہ لگی اشتہا انگیز مہک چھوڑتی تھیں۔ ہر ہفتے کے اختتام پر لڑکیاں جب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوتیں تو اِس اُمید کے ساتھ کہ دیکھو اگلے ہفتے کے آغاز پر کون لڈو لے پلٹتی ہے۔

فوزیہ کے لیے امید کا تناسب ایک اور گیارہ تھا۔ آخر تو وہ ہوسٹل کی پھلواری کا سب سے شوخ رنگ تر و تازہ اور نایاب گلاب تھی۔

منہ بند انتظار کا پھوڑا چوبھے کھا کھا یوں پھٹا کہ سارا مواد یکبارگی باہر آ رہا۔ زخم کے کھلے منہ پر انگور آ گیا، اور آرام کی آسودگی جاگتی تڑپتی آنکھوں میں نیند بھر لائی۔ لڑکیاں سوئی جاگی غنودگی لیے چھٹیاں گزارنے گھروں کو روانہ ہوئیں۔

اُس روز بچ رہی میس فیس سے خیام کی رباعی اور حافظ کی غزلوں کے مطلعے تیار ہوئے اور اُنہیں کھاتے ہوئے لڑکیوں نے جہیز کے راہنما اصول وضع کیے۔ اُنہیں ایسے زرق برق ملبوسات نہیں

خریدنے جو وہ کالج میں نہ پہن سکیں۔ البتہ بجلی کا سامان اعلیٰ کوالٹی کا ہو۔ بھاری زیور تو بالکل بے کار ہے۔ ساری عمر سنبھالتے پھرو، ہلکی پھلکی چینیں اور ٹاپس البتہ کالج میں پہنے جا سکتے ہیں اور بار بار گلے مل مل لڑکیاں ایک دوسری کے پتے اور ٹیلی فون نمبرز لیے پھر ملنے کے لیے جدا ہو گئیں۔

گرمیوں کی طویل چھٹیوں کے برابر ہی طویل و عریض کشادگی کا جن کلاس روموں میں گھس بیٹھا اور بھاں بھاں کرتا خالی ڈیسکوں پہ ناچنے لگا۔ وہی کلاس روم جو لڑکیوں کی تعداد کے سامنے سکڑے سمٹے رہتے تھے۔ بھنبھار ہو گئے۔ وہ گھاس جو لڑکیوں کے پیروں تلے رُندتی، سسکتی، مٹی کے سینے میں منہ چھپاتی پھرتی، وہ بڑھ بڑھ سیاہ ناگوں سی لہرانے لگی، جہاں جہاں (پھول توڑنا منع ہے) کی تختی لگی تھی، وہاں پھولوں کے تختے بن گئے۔ جیسے لڑکیوں کی ٹولیاں منہ جوڑے کھسر پھسر کرتی ہوں۔

جن دنوں چھتنارے درخت ٹنڈ منڈ کیے جا رہے تھے اور گراؤنڈ کی شاخوں اور پتوں سے اَٹے تھے اور کمر کمر چڑھی گھاس میں مالی کٹائی والی مشینیں دوڑاتے پھر رہے تھے۔ کلاس روموں کو دھوتا ہوا گندا پانی نہر کی طغیانی لیے کوری ڈور میں بہتا تھا۔ تب لڑکیوں کے جتھے کشادہ کلاس روموں میں حملہ آور ہوئے۔ تو کشادگی کا جن گہری نیند سے بیدار ہو بائیں بھائیں کرتا بھاگ نکلا۔

اسی روز درختوں کو ٹنڈ منڈ کرتے مالیوں اور تازہ تازہ لگے نوٹس پڑھتی طالبات تک کو یہ اطلاع موصول ہوگئی کہ اگلے ہفتے مس عابدہ کی شادی ہے اور عابدہ کا وجود یکدم اتنا اہم ہو گیا کہ ہر ایک کا مڑ کے اُسے دیکھنا ضروری تھا۔

جس روز وہ چھٹی پر جا رہی تھی اُس کی مہندی رچائی گئی۔ ڈے سٹاف بھی مدعو تھا۔ اور ہوسٹل کی طالبات سٹاف ہوسٹل کی بند کھڑکیوں سے باڑ باندھے ہوئے تھیں۔ میڈم روبینہ سمیت تمام لڑکیوں نے ڈھولک بجا بجا کر گایا۔

ہریالی بنی مہندی لاون دے

سوائے مس راشدہ کے کہ سارے انتظامات تو اُنہی کو کرنا تھے۔ کھانے کی چاشنی بھی تو اُنہی کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کے مضمون کی مناسبت اور ہاتھ کے ذائقے کی وجہ سے لڑکیوں نے کھانوں کے نام ہی تبدیل کر دیئے تھے۔

بریانی خیام کی رباعی کہلاتی تھی۔ کوفتے سعدی کی حکایت، قورمہ فردوسی کا قصیدہ اور شاہی

ٹکڑے حافظ کی غزلوں کے مطلع کہلاتے تھےاور فوزیہ اُن کی مدد کرتی تھی۔ بلکہ سعدی کی حکایت تو اب وہی بنانے لگی تھی اور خیام کی رباعی میں بھی کافی مدد کرتی تھی۔ یوں بھی وہ تو ایم ۔فل کر رہی تھی۔ اُس کے پاس فالتو وقت ہی کہاں ہوتا تھا۔

جس طرح محرم کے فوراً بعد شادیوں کا رش نکلتا ہے اسی طرح گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد سٹاف ہوسٹل میں شادیوں کا سیلاب آ گیا۔ کامن روم جھنڈیوں، کاغذی جھالروں سے سجا رہنے لگا، ڈھولک پیسے جمع کر کے اپنی ہی خرید لی گئی۔ اُبٹن، چاول، گرم مصالحے تھوک کی دکان سے آ گئے۔ مس راشدہ کے گھسے ہوئے ناخنوں پر جیسے ریتی چل گئی اور بیائیوں والی پوروں میں پانچ وقت وضو کے باوجود زعفرانی رنگ دھنسے رہنے لگے، مس نگہت اور مس نجم نے مل کر سلائی مشین خرید لی اور مہندی کے جوڑے ہوسٹل میں ہی سِلنے لگے۔ جن پر گوٹا کناری ٹانکتے ہوئے مس راشدہ کی پھٹی اُدھڑی پوروں میں سوئیاں چبھ چبھ گئیں۔ شادی کی رات لڑکیاں کرائے کی ویگن کروا کر شادی میں شریک ہوتیں۔ لڑکی کو اپنے ہاتھوں دلہن بناتیں اور اُس کی سسرالیوں کے سامنے اُس کی تعریفیں کرتی نہ تھکتیں۔ دیکھنے والی عورتیں اُن کی اعلیٰ ظرفی پر حیران ہو ہو جاتیں۔ آخر کو تو ماسٹرز ڈگری ہولڈرز پروفیسرز ہیں۔ ہم جیسی کچی پکی میٹرک، ایف۔ اے فیل تو نہیں کہ بس تُو وہ...... غیبت اور بدخوئی کے علاوہ کوئی مصروفیت بنتی ہی نہ ہو۔

لیکن اگلے روز پتہ نہیں خبریں کن خفیہ خبر رساں ایجنسیوں سے نکلتیں اور چپڑاسیوں اور کلرکوں تک کی زبان پر آ جاتیں۔

دولہا محض میٹرک پاس ہے۔ جنرل سٹور کا مالک ہے تو کیا اس قدر ذہنی تفاوت، کیمسٹری کی مس نجم نجانے کس طرح Compromise کرے گی۔

دولہا ہے تو پروفیسر لیکن پورے گھرانے کا واحد کفیل، پانچ نندیں اور ایک ساس، مس نگہت تو ہر وقت ہائی الرٹ حالت میں محاذِ جنگ پر رہے گی۔

دولہا ہے تو ڈاکٹر سنا پریکٹس بھی اچھی ہے۔ لیکن اُف توبہ دوسرا Shrek سنا مس نبیلہ نے دولہے کو گھونگھٹ کی اُوٹ سے دیکھا تو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئیں اور صبح تک بیہوش رہیں اور دولہا ساری رات بیہوش دلہن کو کورامین پلاتا رہا۔ مہمانوں کی آمد کے ساتھ جا کر کہیں پلکیں اور بتیسی باہم جدا ہوئیں۔

پتہ نہیں یہ C.I.A جیسی خفیہ ایجنسی کہاں کام کر رہی تھی۔ جو دوسروں کے گھروں حتیٰ کہ بیڈ رومز تک میں با آسانی جھانک سکتی تھی۔

شادی کے بعد ہفتے عشرے کی چھٹی گزار کر جب لڑکی واپس کالج آتی تو اُس وقت دلہن کو دیکھنے کے لیے کلیریکل سٹاف بھی ہاتھ برابر سوراخ والی جالی کے چھتے سے چپک دلہن کو دیکھتا تھا جس کھڑکی سے لڑکیوں سے فیس وصول کی جاتی تھی۔

بندوں والے کان اور چوڑیوں والے بازو، ٹیکسی کی پچھلی سیٹ سے تھری پیس سوٹ کے عقب میں جھلملاتے ہوئے اُترتے، ڈبل بریسٹ بٹن بند ہوتے چاہے درجہ حرارت 38 ڈگری ہی کیوں نہ ہوتا۔ نئے بوٹ چیری بلاسم کا اشتہار معلوم ہوتے اور نمبروں سے بند ہونے والا اٹیچی کیس اُٹھا کر ہوسٹل پہنچانے والا چپڑاسی خوشی کے مارے اٹیچی کیس کی ہی طرح پھولا پھولا ہوتا، جیسے اس شادی میں اُس کا براہ راست حصہ رہا ہو۔ لڑکیاں کلاسیں چھوڑ اُن روشوں پر باڑ بنا ڈالتیں جہاں سے دلہن لیکچرار نے گزرنا ہوتا تھا اور دلہن لیکچرر نگاہوں کی تپش سے اپنے گلے میں پڑے گلوبند کی مانند دہک جاتی، لڑکیاں کھلے منہ کے ڈھکنے گراتی اُٹھاتیں۔

''ہائے اللہ! اتنا ناج حاصل کرنے کے بعد بھی یہی کچھ کرنا تھا تو پھر اتنے سال کیوں برباد کیے پہلے ہی کرلیتیں، کتنی گندی ہوتی ہیں یہ...... پروفیسریں بن کر بھی شادیاں کرلیتی ہیں۔''

عاشق لڑکیاں خون کے گھونٹ قطرہ، قطرہ منہ کے رستے ٹپکاتیں۔

اُس روز خیام کی رباعی اور سعدی کی حکایت ڈائننگ ٹیبل پر بجی اپنی مہک سٹوڈنٹ ہوسٹل کی دال کی پلیٹوں میں بگھار لگا دیتیں اور سٹوڈنٹ آہیں بھر بھر سٹاف ہوسٹل کی بند کھڑکیوں کو دیکھتیں جہاں سے چھلکتے قہقہے درمیانی بلے گراؤنڈ کی بھربھری مٹی میں سونے کے تار پرو دیتے جو چمکیلی دھوپ میں دہکتے اور حرارت چھوڑتے تھے۔

لڑکیاں دولہے کو یوں ملاحظہ کرتیں گویا منہ میں ہاتھ ڈال دوندی چوندی بھی دیکھ ڈالیں گی اور دولہے کی نگاہیں بار بار مس فوزیہ پر اُٹھتیں کہ نایاب و نادر اشیاء تو دیکھنے کے لیے ہی ہوتی ہیں یہ محویت اُس وقت ٹوٹتی جب کوئی لڑکی خوفناک چیخ کے ساتھ اُچھل پڑتی اور دلہن کی گردن یا کھلے گریباں کی طرف اشارہ کر کے چلاتی۔

''یہ...... یہ کیا...... کوئی کیڑا ابھر گیا۔ یا الرجی ہو گئی۔''

اور دلہن جسے خون سے نشانات کو اس انداز برتری سے چھپاتی کہ نہ دیکھنے والیاں بھی چونک کر دیکھنے کی کوشش کرتیں، مس راشدہ فرج میں رکھے حافظ کے مطلع لینے کو کچن میں دوڑتیں جو زیادہ ٹھنڈے ہو گئے تھے اور فوزیہ کو اپنے مقالے کا اگلا باب بروقت سوجھ جاتا۔

دولہے کے چلے جانے کے بعد خبریں سٹاف ہوسٹل سے ہوتی ہوئی سٹوڈنٹ ہوسٹل، سٹاف روم اور مالیوں چوکیداروں کے منہ تک آ جاتیں کہ مس طوبیٰ تو برباد ہو گئی اسی لیے تو اتنے سنگلاخ قہقہے لگاتی ہے تو لگاتی چلی جاتی ہے۔ شادی کو دو ہفتے ہو گئے لیکن She is still virgin نجمہ کو چھوڑ کر دولہا امریکہ چلا گیا، سنا اُس نے وہاں شادی کر رکھی ہے۔ دیکھو اسے وہاں بلاتا بھی ہے یا یہیں ساری عمر سڑتی رہتی ہے۔

خبریں گردش کرتی رہیں، لڑکیاں دُلہنیں بنتی رہیں۔ ایک Phase سے دوسری Phase میں داخل ہوتی گئیں۔ ایک مسئلے کے حل نے کئی مسائل کی پنیریاں لگا دی تھیں۔ مسائل کا بھی ایک Phase سے دوسری Phase میں داخل ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ وہ بھی ٹھہرے پانی سی بساند مارنے لگتے ہیں۔

ٹرانسفر، ساس نندوں کے جھگڑے، شوہر کی تلون مزاجی، بچوں کی پیدائش اور بیماریاں، مسائل حل ہوتے اور حل ہونے والے مسائل نئے مسائل کے بیج بو جاتے۔

عبوری دور میں بسر کرتی لڑکیاں، ایک Phase سے دوسری Phase میں داخلے کی منتظر لڑکیاں، جن کے مسائل نہ ہونے کے برابر تھے لیکن زندگی مسائل کے کھلونوں سے تہی ہو جائے تو پھر انسان کے کھیلنے کو مصروف رہنے کو بچتا ہی کیا ہے۔ عدم مصروفیت کی بے اہمیتی کتنا خوفناک جن سا مسئلہ۔ پڑھی لکھی لڑکیوں پر تو...... جن بھی غلبہ نہیں کرتے۔ اسی لیے تو پڑھی لکھی لڑکیاں منہ بند انتظار کے پھوڑے کو چوبھے لگاتی رہتی ہیں۔ علم نجوم، دست شناسی، روحیں...... عبوری دور کو قتل کرنے کے سارے ہتھیار ہوسٹل میں جمع تھے۔

لڑکیاں عورتیں بنتی گئیں۔ ہوسٹل عورتوں سے خالی ہوتا گیا اور اُن کی خالی جگہ لڑکیاں پُر کرتی رہیں۔ جب بھی کسی پروفیسر کی ٹرانسفر ہوتی ابھی وہ ریلیو بھی نہ ہوتی کہ اُس کی جگہ لینے کو نئی لڑکی

اپائنٹمنٹ لیٹر یا ٹرانسفر آرڈر لیے، آ موجود ہوتی۔

کالج کی بلڈنگ وسیع ہوتی گئی کتنے نئے بلاک بن گئے۔ سٹاف ہوسٹل دوگنا ہو گیا اور کمروں میں لڑکیوں کی تعداد چوگنی ہوگئی اور اُس دن ساری لڑکیاں ہوسٹل کی سب سے پرانی لڑکی مس راشدہ کی فیرویل پارٹی کے انتظامات میں لگی ہوئی تھیں۔ جو کل ہونے والی تھی۔ سب نے کتنی بار اس صریحاً ناانصافی پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔ کتنا ظلم تھا کہ مس راشدہ جیسی Old Girl کو ریٹائر کر دیا جائے جو ابھی ہر، ہر لحاظ سے لڑکی تھی۔ ذہن بھی، وجود بھی، اور لڑکیوں نے کتنی بار ایک دوسری سے سوال کیا تھا۔ کبھی لڑکیاں بھی ریٹائر ہوتی ہیں۔ ریٹائر تو بڑھیاں ہوتی ہیں اور لڑکیاں کبھی بڑھیاں نہیں ہوتیں بڑھیاں تو عورتیں ہوتی ہیں جو مائیں بنتی ہیں، نانیاں دادیاں بنتی ہیں۔

بس میں کچھ نہ تھا ورنہ تو مس راشدہ کو پیلا جوڑا پہنا ہاتھوں میں مہندی رچا، گھونگھٹ میں چھپا دیتیں اور ڈھولک بجا بجا ہریالی بنی مہندی لاون دے گا گا ڈھولک کے تندوے اور اپنے حلق پھاڑ ڈالتیں۔ مس راشدہ کو عورت بنا اس ہوسٹل سے رخصت کرتیں پھر دم لیتیں۔

لڑکیاں اس صریح زیادتی پر تبادلہ خیال کرتے کرتے شدید ذہنی تھکن کا شکار ہو چکی تھیں اور تھکن سے چور دماغوں کو ری لیکس کرنے پرنسپل کے کمرے میں اُٹھ آئی تھیں۔ جہاں چارٹ پیپر بچھا تھا اور لائنوں اور دائروں میں لکھے حروف تہجی پر کریم کی شیشی کا ڈھکنا گردش کرتا تھا۔

پرنسپل ڈاکٹر پروفیسر مس فوزیہ کی شہادت کی انگلی تلے پھسلتا ہوا ڈھکنا Amir کے سپیلنگ بناتا تھا، اور لڑکیاں کھلے منہ ہتھیلیوں سے ڈھانپ ہیجانی چیخوں کے ڈھکن اُٹھاتی چڑھاتی تھیں۔

تبھی مس راشدہ نے دروازہ کھولا اور میڈم فوزیہ نے دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی کہا۔

''مس روز! شیخ سعدی کی روح کو کال......'' لیکن آج مس راشدہ کو نہ تو پڑھی ہوئی نماز یاد آئی اور نہ ہی ہوسٹل میں گزارے ہوئے تیس سال، وہ سیدھی فوزیہ کے کان تک پہنچیں، جیسے کوئی بڑا بوجھ اُٹھا انسان بھاگنے لگتا ہے، ہونٹ میڈم فوزیہ کے کانوں کی لوؤں سے مس ہو گئے اور فوزیہ کا منہ آدھا کھلا آدھا بند رہ گیا۔

''کچھ عورتیں آئی ہیں تم سے ملنے......تم باہر آ جاؤ......ذرا کچھ چہرے پر لگا لینا......میں تو یہی چاہتی ہوں کہ میرے جانے سے پہلے پہلے......'' مس راشدہ ناقابل برداشت بوجھ والی تیزی سے

واپس پلٹیں، جیسے خوف ہو کہ کہیں اُن کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر عورتیں واپس نہ ہو جائیں یا کوئی اور لڑکی اُن کے پاس نہ پہنچ جائے۔

کنوار پنے کی صندل دھونی آنکھوں میں دھکتی دُھواں دھار ہو گئی، صندل دھونی کی کڑواہٹ لڑکیوں کے نتھنوں اور آنکھوں کو بوجھل کر گئی۔ مس راشدہ نے ململ کے کھردرے دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے کناروں سے کڑواہٹ کی تلچھٹ کو رگڑ کر پونچھا۔

''ویسے تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو...... لیکن پھر بھی کچھ رنگ، ذرا سا میک اَپ...... سارے ہی تو لگاتے ہیں...... تو پھر ہم......''

مس راشدہ نے دھوئیں میں دھکتے کھردرے دوپٹے کے پلو سے چہرے کو بے دردی سے رگڑا، لیکن کسی رنگ کی کوئی بوند تک نہ چھٹی، جیسے ساری ہی پچکاریوں کے رنگ کڑی دُھوپ میں سوکھتے سوکھتے اندر جم کر لوتھڑا ہو گئے ہوں۔

عزت

سہاگ پُڑے سے کچ کچ چھنتی مہک نے سارا گھر بھر دیا تھا، جیسے ہر شئے کو بٹنا چڑھا ہو۔ مہندی کے تھال کھلے پڑے ہوں، جس کا رنگلا عرق، سرسوں کے تیل کی چکنائی کے ساتھ بے قابو ہو سطح پر تیرنے لگے اور سارا ماحول، زرتار گھونگھٹ میں چھپا، لجاتا، مسکراتا، مہکتا ہو۔ چودھری فضل دین مردوں سے فارغ ہو دولہے کو ساتھ لیے گھر میں داخل ہوا، نذیراں بی بی ڈنڈی جھمکی والے کانوں کے پیچھے بانکڑی لگے دوپٹے کی کناری اڑوس خوشابی کھسہ پنجے میں گھستی ہوئی اُٹھی اور دولہے کا ماتھا چُوما۔

''ماں صدقے واری میرا گھبرو پت لاہڑا (دولہا) بنا......'' جالاہڑے اب اپنی ووہٹی (دلہن) کو جا کر دیکھ۔

چودھری نے گلہری کی دم جیسی مونچھوں کو تھپتھپایا۔

''چودھری قاسم علی! تجھے پتہ ہے نا کہ ووہٹی کیا ہوتی ہے۔''

''ہاں ابا''

دولہے نے سہرے کی لڑیوں کے سائے میں باپ کے پُر جوش چہرے کو حیرت سے دیکھا۔

''عورت ہوتی ہے ابا جیسے امی......''

''اوئے نہیں کملیا۔''

چودھری نے دولہے کو نظروں کی سان پہ گھسا جیسے اکھاڑے میں اُتارنے سے پہلے استاد اپنے زیرِ تربیت پٹھے کو جانچتا ہے۔

''بگری ہوتی ہے کچی بگری، بس کچر کچر چر جاؤ ذرا بھی نہ بچے۔''

نذیراں نے اُونچی گھوڑی والی ناک کو سنہری کناری والے گلابی دوپٹے میں لپیٹا۔''جا میرا پُت (بیٹا) آپ ہی دیکھ لے کچی بگری ہے کہ پکی......''

''تجھے یاد ہے نا چودھری قاسم علی! پہلے گھنڈ (گھونگھٹ) اُٹھانا ہے اور پھر باتیں کرنی ہیں اپنی ووہٹی سے......''

چودھری نے نتھنے پھلائے۔ گھر میں بسی واشنا کو پھیپھڑوں تک کھینچا۔ اندر کا اضطراب اور جوش گرم بھاپ کی طرح مُنہ سے چھٹا۔

''جا میرا شیر آج دکھادے، تُو چودھری فضل دین کا حلالی بیٹا ہے۔''

دولہے نے سہرے کی لڑیوں کو ماتھے پر کسی تمغے کی طرح تھپتھپایا اور دلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ پیچھے سے چودھری نے پھر ہانک لگائی۔

''اندر سے کُنڈی لگا لینا۔ یاد سے...... جاتے ہی...... پہلا کام یہی کرنا ہے...... پھر کچھ اور......''

دولہے نے کمرے میں جا کر کُنڈی لگالی۔

''کُنڈی تو لگالی سیانا ہے اللہ رکھے۔'' نذیراں بی بی ایسے شرمائی جیسے اُس کے حجلۂ عروسی کی کُنڈی لگی ہو۔

کمرے میں سے دولہے کی باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔

''خیر صلا باتیں بھی کر رہا ہے۔''

نذیراں بی بی کوکے والی لال ناک کو بُکل میں لپیٹ کر شرمائی جیسے اس کا اپنا گھونگھٹ پہلی بار اُٹھا ہو۔

''باتیں تو کر رہا ہے لیکن یہ باتیں کیسی ہیں جیسے پہلی رات کی دلہن سے نہیں پرلی بہک سے گرو تمبا کو مانگ رہا ہو۔''

باتوں کی آوازیں ختم ہوگئیں۔

''لوچُپ ہوگیا۔اب تسلی ہوگئی تیری۔''

نذیراں بی بی نے گُلابی دوپٹے میں لال چقندر ناک پھر لپیٹی جیسے اُس کا اپنا دولہا چُپ ہوا ہو۔

''ہاں چُپ تو ہوگیا ہے پر جیسے چُپ نہیں ہوا سو گیا ہے۔''

''نہیں چودھری! سو کہاں گیا ہے۔سامنے بالو ہے جو سوؤں کو جگا دے مُردوں کو اُٹھا دے۔ تجھے تو ایسے ہی وہم ہورہا ہے۔چل چھوڑ اب تُو بھی سو جا۔''

نذیراں بی بی نے بروکیڈ کی گُلابی رضائی کھول کر ٹانگوں پر پھسلائی جس کے حاشیے کی ساٹن میں کر کر چمک کی لہریں سی چھٹیں۔چودھری نے ایڑی کے پیچھے اُنگلی ڈال کے جوتی پَیر پر چڑھائی جیسے کہیں چلنے کی تیاری ہو۔

''نذیراں! ایک کام کر، جا کُنڈی کھڑکا کے پُوچھ کوئی پانی دھانی تو نہیں چاہیے۔''

''نہ چودھری! نذیراں کی گُلابی ناک پر دل کی شکل کا لال کوکا خون کے قطرے کی طرح لرزا۔''

''یوں بھی پانی، دُودھ، پھل فروٹ سب رکھ دیا تھا میں نے اندر......''

''اُٹھ جا پُوچھ مجھے وہم ہے یہ بھڑوا چُپ نہیں ہوا سو گیا ہے۔''

نذیراں جھٹکے سے اُٹھی کہ اگر وہ نہ اُٹھتی تو چودھری اُٹھ چکا ہوتا، کُھسے کی ایڑی دوہری کی، گھسٹتے ہوئے صحن عبور کیا۔کُنڈی کھڑکانے کے ساتھ ہی دروازہ کُھل گیا۔

''کیا بات ہے خالاں۔''

دروازے کی اُوپرلی موہاٹھ کو چھوتا ہوا بالو کا سَر باہر نکلا، جس کی پُشت سے قاسو کے خراٹے چھٹے تھے جن کے بوجھ نے بالو کے بھلا ہی سے قد میں جھول ڈال دیا تھا۔دُلہناپے کی واشنا بند دروازے سے نکل صحن میں بچھی چودھری کی چارپائی کے گرد مہکنے لگی۔

جس سرعت سے نذیراں واپس مُڑی اُسی تیزی سے چودھری آگے بڑھا۔نذیراں نے پیچھے سے کُرتا کھینچا۔

''کہاں جارہے ہو چودھری۔''

''اس بھڑوے کی خبر تو لُوں...... پوچھوں تو......کتنا سمجھایا......بجھایا......''

''ٹھہر جا چودھری! بچہ ہے سمجھ جائے گا کچھ دنوں میں...... بیاہ کے قابل تھا ہی کہاں، تُو نے زیادتی کی بچے کے ساتھ۔''

''بارہ تیرہ سال کا لڑکا بالغ ہو جاتا ہے۔ یہ ہے ہی زنخا، ورنہ بالو جیسی عورت سامنے ہو تو آٹھ سال کا لڑکا بھی ایک جھٹکے میں جوان ہو جائے۔''

چودھری اپنے ہی قدموں پر آگے پیچھے گھوما، جیسے پڑ (میدان) کے اندر مخالف کو پکڑنے یا اُس سے بچنے کی کوشش میں ہو۔

''چل چھوڑ چودھری آٹھ سال کا بچہ...... مَیں تو کہتی رہی۔ نیانا (بچہ) ہے۔ پر بہن جیراں پر بالو بہت بھاری ہوگئی تھی۔ ہر آتے جاتے کے ہاتھ ایک ہی پیغام اپنی امانت آ کر لے جاؤ۔ مَیں بیوہ یہ بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں رہی۔ اپنا بوجھ اُتار کر میرے سَر ڈال دیا۔ خُود تو سُکھ کی نیند سو رہی ہے نا...... اور میں......''

''سُکھ کی نیندر...... کل مکلاوے گئی سب بتائے گی نا جیسی گئی ویسی مُڑ آئی۔ پھر اُس کی سُکھ کی نیند......''

چودھری پڑ کے اندر پھر گھوما، جیسے سمجھ نہ آتی ہو بدن سے چھلکتی بے پناہ توانائی کو آخر کہاں جلائے جیسے ہونکتا، شوکارتا پھنیر ناگ پٹاری میں بند کر دیا گیا ہو جو پٹاری کے بند ڈھکنے کو بار بار ڈنکتا ہو۔''

''تُو بھی حوصلہ کر چودھری! کُچھ دن میں دونوں رس بس جائیں گے، تو پھر...... اللہ سئیں خیراں کردے گا......''

''اسے کھلا پلا، دیسی گھی کی نالیں دے اسے۔ دُودھ میں دیسی انڈے پھینٹ کے پلا، بادام اور السی کی پنجیری بنا کے کُٹا اسے...... عورت ذات کب تک جوانی کی اُڈیک میں بیٹھے گی۔ کنواری کے سینے پر رکھا صبر کا بھاری پتھر نکاح کے دو بولوں کے ساتھ ہی اُٹھ جاتا ہے اور پھر بند ٹوٹے راجباہ کی طرح جدھر روڑھ لے جائے بہہ نکلے۔''

''گھر کی بیٹی ہے ایسی بے صبری نہیں کہ چار روز اُڈیک (انتظار) میں نہ بیٹھ سکے۔''

نذیراں ہش ہش کرتی اُٹھی۔ بلی جاگ لگی دُودھ کی چاٹی پر دھرے دورے کو گرا کر بھاگی تھی۔

''اگر تُو دیکھ نہ لیتی تو بلی دودھ جھٹا جاتی۔''

چودھری کھیس لپیٹے تکیہ بغل میں دبائے باہر بیٹھک میں سونے کو چلا......

اگلی صبح بالو نے کمرے سے نکل لسوڑی کے بوٹے کے سائے میں آ کر انگڑائی توڑی۔ چودھری اور نذیراں دونوں کو لگا وہ راتوں رات زیادہ بھرپور ہو گئی ہے جیسے پکی ہوئی لسوڑیوں کا رس اپنے ہی زور سے چھلکے کا مُنہ پھوڑ ٹپکنے لگے۔ مہندی میں گچ گچ بٹنے میں رچ رچ گورے بدن کا انگ انگ بجنے لگا ہو جیسے خطرے کی سیٹیاں، کوکیں اور آوازے پُرشور ہو جائیں۔ قاسم بستہ گلے میں لٹکائے باہر نکلا۔ بالو کے قریب سے گزرا جیسے اُس کے کچھو (بغل) گھس کر سست گیا ہو اور چہرے کا بھولپن عمر کے اک دو سال مزید نگل گیا۔

"کہاں جا رہا ہے، قاسم علی۔" نذیراں نے مکھن کی تہ لگے تین پرتوں والے پراٹھے کو توے پہ اُلٹا۔

"سکول امی......"

"رہنے دے آج...... سکولے......" توے پر گھی کی سَر سَر اُٹھی اور چھینٹے اونے کی پچھلی دیوار اور نذیراں کے مُنہ پر پڑے۔

"نہیں امی! آج تو انگریزی بی کا پرچہ ہے۔ نہ جاؤں تو فیل ہو جاؤں گا......"

قاسم علی کتابوں والا جھولا کیرئیر پر پھنساتا، جلدی جلدی پیڈل مارتا باہر نکل گیا اور چودھری کھیس کی بُکل کے اندر دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں انگوٹھوں سے مسلتا رہ گیا۔

بالو لسوڑے کے بُوٹے کے نیچے ہلکے سے گھونگھٹ کی اوٹ میں سے آنکھوں، لبوں، گالوں سے کچھ لال اور سنہرا سا ٹپکاتی رہی، سنہری سپیوں کا موتی چور ارغوانی قلاقند میں گھلا ہو جیسے...... مکھن اور لسی میں گھلتی نذیراں کی آواز اونے کے دھوئیں میں لپٹی۔

"بالو پراٹھا پک گیا آ کے کھا لے۔"

چودھری نے ٹریکٹر اسٹارٹ کیا۔ احاطے میں جیسے بھگیاڑ دھاڑا ہو۔

نذیراں پیڑا ہاتھ میں لیے اُٹھی۔ "چودھری روٹی کھائے بنا ہلوں پہ جا رہا ہے۔"

چودھری نے پورا ایکسی لیٹر دیا اور ناتراشیدہ تختوں کے گیٹ سے ٹریکٹر اس رفتار سے نکلا کہ دھول کے گولے نے پورے گھر کو تادیر لپیٹے رکھا اور جب دھول رفتہ رفتہ بیٹھی تو بالو ابھی وہیں صحن میں

کھڑی انگڑائی توڑتی تھی اور نذیراں کے ہاتھ میں پکڑا تین پرتوں والا پیڑا کرچ کرچ سے بھر گیا تھا۔
سخت ڈھیموں سے بھرے کھیتوں کے سینے پھوڑ پھوڑ مٹی کو سُرمہ بنا زرخیز مٹی سے لدا پھندا ٹریکٹر واپس لیے چودھری مڑا تو نذیراں کی گود میں سَر رکھے قاسم پڑا تھا۔
''یہ کیوں رو رہا ہے۔''
چودھری نے صافے سے مُنہ جھاڑا اور ڈھول کھنگار کر لسوڑی کے بوٹے پر اُچھالی۔
''کہتا ہے لڑکے مذاق اُڑاتے ہیں کہ تیری ابھی سے شادی ہوگئی۔''
''کیوں؟ شادی مَرد کے بچے کی نہیں ہوتی تو کیا کھسروں کی ہوتی ہے؟''
آنکھوں کے حلقوں کے پیالوں میں جمی مٹی پسینے کے قطروں میں تر ہونے لگی۔ چودھری نے پھونک مار کر مُونچھوں پر سے پسینے کا قطرہ اُڑایا۔
''پر میرے تو کسی جماتیے کی نہیں ہوئی نا ماسٹر بھی ہنس رہا تھا کہہ رہا تھا اپنی ووہٹی کو ہمارا سلام کہنا۔''
قاسو نے ماں کی جھولی میں مُنہ گھسیڑا جیسے ذرا سا کتور اتنور کے گھورے میں تھوتھنی پھنسا لے۔
''اُس نے تیری ووہٹی کو سلام بھجوائے اور تُو لے آیا اُٹھا کر......''چودھری نے چھپری کی چھت میں اُڑسی برچھی باہر کھینچی، اور گلے میں دھی بلوتی مدھانی گھڑ گھڑائی۔
''اوے ابرو! ذرا گھوڑی لا اصطبل سے میں ذرا اس ماسٹر کے بچے کو وعلیکم اسلام کہہ کے تو آؤں......''
رنگوں اُبٹن اور مہندی کی پنڈ سے کھل کھل نکلتی خُوشبوؤں کو سُونگھتا اور مدہوش ہوتا ملازم غنودگی میں تھا۔ یہ گھڑک سنی ہی نا۔
نذیراں نے برچھی کی دستی پر ہاتھ ڈالا۔
''چودھری! بچے کے ساتھ چھیڑ خانی کی ہوگی۔ تُو تو ذرا ذرا بات پر گرم ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا ہو کے بیٹھ، لسی کا کٹورہ پی......''
چودھری لسی کا کٹورہ پینے لگا، پر ماسٹر کا بھیجا ہوا سلام پہلا خطرہ تھا جس نے پُورا مطلع خطرناک اور مشکوک بنا دیا۔ یہ خطرے کی ُوکیں اور واجیں (آوازے) بالو کے پھلا ہی سے قد سے نکلتیں۔ کمر کی

کمان سے تیر بن چھٹتیں، لال گلابی دوپٹہ ڈھلک جائے تو لال پیلی بتیاں جلتی بجھتیں، سُرمے سے بھری آنکھوں کے لال ڈوروں اور ہونٹوں کے روغنی پیالوں سے دم بدم سیٹیاں اور سائرن بجتے۔

چودھری دیکھے اَن دیکھے خطروں کی ریتل میں دھنسا دن میں کئی بار چھپری کی چھت میں شاماں والی سوٹیاں، برچھیاں اور چھرے ٹٹولنے لگتا، اور گلی میں گزرتے ہوؤں کو دکھا دکھا اُن کی دھاریں تیز کرتا اور ہر قد آور اور مضبوط نوجوان کا جھولا گزر جانے کے بعد اُڑتی بیٹھتی گرد سے جیسے سوال کرتا۔

''نذیراں بی بی! آخر کتنا فرق ہے دونوں میں، یہی تین چار سال کا ہی نا...... وہ اتنی جوان اور یہ اتنا بچہ......''

''چودھری! یہی تین چار سال کا اوجھلا ہی تو ہے، جس کے اوہلے اوہلے (اوٹ) بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ جوان بوڑھا، بڑا ظلمی ہے یہ تین چار سال کا درمیانی اوہلا...... پھر لڑکیوں کی جوانی بھی تو سرسوں کا کھیت راتوں رات کھڑ جائے......''

نذیراں بی بی ہر جملے کے ساتھ بدک بدک کر سمٹتی، جیسے فضا میں بھرے خطرے کے تیروں کا وہی ہدف ہو اور باہر گلی میں سے گزرتے ہر نوجوان کے کھڑکے میں سیٹیاں اور ڈھولے لپٹے ہوئے ہوتے۔

''باگےاچ آبالو......
کنگھا شیشہ میں دینا آں......
گت کر کے وکھا بالو......''

''تیرے میرے میں اس سے زیادہ فرق تھا پر تجھے بسا کے دِکھا دیا پورے شریکے کو، پہلے روز جب چاچے نے پوچھا، چودھری فضل دین یہ تیری کون ہے۔ تو یاد ہے نا تجھے مَیں نے کیا جواب دیا تھا۔ کیوں چاچا! اب تُو مجھے بتائے گا کہ میری ووہٹی میری کون ہے اور ساری برادری کے سامنے تجھے کلاوے میں بھرا اور اندر کوٹھے میں لے آیا۔ عورتیں سی سی کرتی مُنہ ناک پلو میں دابنے لگیں جیسے لال مرچی لگی ہو اور مرد مونچھیں باچھوں پر۔ گر ائر ک گھر ک سُوٹے کھینچنے لگے اور چاچے کا ئر گٹھ (بالشت بھر) برابر اُونچا ہو گیا، اگلے ہی دن روڑوں والے کلّے (ایکڑ) میرے نام کیے اور ساری برادری میں شملہ اُونچا کر کے کہا۔

''بیٹا جوان ہو گیا ہے۔'' مجھے بھی چودھواں نہیں تو پندرہواں ورا (برس) لگا ہو گا۔ آٹھ سال کا فرق تو ہو گا ہمارے بیچ۔''

نذیراں بی بی یوں شرمائی جیسے یہ واقعہ ابھی ابھی ساری برادری کے سامنے رُونما ہوا ہو۔

''چل چھڈ چودھری! تُو مجھ سے چھوٹا کہاں ہے اتنا تو بڑا لگتا ہے۔ چودھری مَیں تو ہمیشہ تیرے سامنے نکی (چھوٹی) سی ہو کر رہی......''

''نذیراں بی بی! مرد کبھی عورت سے چھوٹا ہوا ہے؟ ادھر جوانی کا سال لگا، اُدھر وہ اپنی ماں سے بھی بڑا ہو گیا، جتنی اُونچی گردن اُٹھا کے بیٹے کو دیکھتی ہے۔ اُتنا ہی ڈرتی ہے۔ ایک یہ قاسو ہے سسرا، جو اپنی رن سے بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ بے غیرت! مجھے تو اپنا نطفہ ہی نہیں معلوم پڑتا۔ کسی کھسرے کا جنا ہے تُو نے......''

نذیراں مُنہ میں اُنگلی دبا کر ہنسی۔ ''چودھری تُو بھی بات کرتے وقت سوچتا کچھ نہیں، کسی سِکھ کی اولاد لگتا ہے مجھے......''

چودھری کے سنجیدہ اور کرخت چہرے پر آئی مسکراہٹ بڑی اوپری سی لگی۔ جنڈ کے ڈال پر پڑی ایک رسّے کی پینگ پر جھولتے ہوئے نِنھی نے پُکار کر کہا۔

''امی آپاں روتی ہے۔''

''کیوں روتی ہے؟''

نذیراں نے مجرمانہ انداز میں دانتوں پر اُنگل لپیٹی۔

''اُس سے کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔''

اُٹھ کر بھوری کے آگے کترے کا رگ (مٹھی بھر) ڈالا، چودھری نے چڑی کا ٹانڈا زور سے بھوری (بھینس) کی پُشت پر مارا جس نے دُم گھما کر جھٹکی گوبر پیشاب کے چھینٹے دونوں پر پڑے۔

''روئے گی نہیں تو کیا ہنسے گی۔ آج ستائیسواں روز آن لگا۔ جیسی آئی تھی ویسی پڑی ہے۔ آخر عورت ذات ہے۔ چڑی جتنا دل، شُشکار کر دانہ نہ ڈالو اُڈاری مار، دوسرے رکھ پہ بسیرا کرتی ہے۔ اُڈ یک میں نہیں بیٹھتی۔''

قاسو سائیکل کے پیڈل مارتا ہوا گیٹ سے داخل ہوا، اور بستہ کیریئر سے اُتارتے ہوئے باپ

کو دیکھا، اس نفرت سے جو خوف کی انتہا میں پلتی ہے۔

''امی جلدی روٹی پکا دے۔ آج ہمارے سکول میں ٹورنامنٹ ہے چار بجے میں نے جلدی جانا ہے......''

نذیراں نے بھوری کی کھرلی میں گندم کا دلیا ڈال کر توڑی (بھوسہ) کو اُس میں ملایا۔ ''اپنی دوہٹی سے مانگ نا......'' ڈلار سے بولی۔

''اب وہی تیرے سارے کام کرے گی اُسی سے کہہ۔''

کچی عمر کے چہرے پر تیرتی حیا کی لالی نے اُسے لچکیلا اور نوخیز سا بنا دیا تھا۔ ''آپاں روٹی دے دے۔''

قاسو کی اُونچی ہانک کے ساتھ چودھری اُٹھا جیسے سوئے ہوئے شیر کے پنجے پر ہاتھی کا پَیر آ گیا ہو۔ بڑھ کر قاسو کو چوٹی کے بالوں سے جکڑا، اور پٹخا کر کھرلی میں پھینکا، جہاں نذیراں گتاوا کر رہی تھی۔

''او زنخا وہ تیری آپاں لگتی ہے آپاں لگتی ہے تیری۔''

ماتھے کی سلوٹیں، اکڑی ہوئی مونچھوں کی طرح کرخت ہو کر تن گئیں۔ قاسم سیاہ ملیشیے کی وردی جھاڑتے ہوئے اُٹھا جس پر بھوسے کے تنکے چپک گئے تھے اور بالوں میں چری کی پوریاں اُلجھ گئی تھیں۔

''نھی اور منی بھی تو آپاں ہی کہتی ہیں۔ اگر میں نے کہہ دیا تو...... بڑوں کی عزت کرنی چاہیے...... نام سے نہیں بلانا چاہیے...... یہی سکھایا ہے ہمیں سکول میں......''

قاسو کے چہرے پر معصومیت رونے لگی تھی۔

چودھری نے گردن میں ہاتھ ڈال کر اُچھالا اور پودینے کی کیاری میں پٹخا جس کے بنے (کنارے) کلر سے اٹے تھے۔ اُس کا منہ ناک سفید کلر اٹی جھاگ سے بھر گیا۔ نذیراں چھڑواتے چھڑواتے کئی دھپے کھا چکی تھی۔ بالو اندر کھڑکی میں بیٹھی باہر کا منظر اس بے نیازی سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ توجہ تنازع ہو ہی نا، اُس کی کھڑکی کی سیدھ میں کچی اینٹوں کے فرش پر ٹریکٹر کھڑا تھا جسے ابرو ملازم دھو رہا تھا۔ چودھری کو محسوس ہوا کھڑکی اور ٹریکٹر کے درمیانی فاصلے میں کچھ پُر اسرار سا تار جڑ گیا ہے۔ جس کی سرسراہٹ کانوں نے سنی، سورج سے نکل زمین تک پھیلے موہوم سے۔ کرنوں کے جال کا سایہ آنکھوں نے دیکھا جو واضح تو نہ تھا لیکن سانس پسلیوں تک کھینچ کر سونگھا جائے تو بجھائی اور سنائی دینے لگے، قاسو

کی گردن چودھری کے ہاتھ سے چھٹ گئی اور ٹریکٹر کے مڈگارڈ میں جمی گیلی مٹی کے لوتھڑوں میں نظریں جم گئیں۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر مٹی کا تھوبا اُتارا اور ملازم کے مُنہ پر مارا پھر دوسرا مارا پھر تیسرا...... دونوں مٹھیاں گیلی مٹی کی بھر بھر اُتارتا اور ابرو کے نشانے لے لے کر مارتا۔

''یہ ٹریکٹر دھو رہا ہے تو...... ایسے دھوتے ہیں چار لاکھ کی گاڑی...... پہلے تُو نے دیکھی کبھی آنکھیں مل کے دیکھی...... کمی کمین شہدا...... پَیر کی جُوتی، تیرا دھیان کدھر ہے۔''

چھپری کی چھت سے شاماں والا ڈنڈا ساڑ ساڑ باہر نکلا جیسے خشک سرکنڈوں سے بھگیاڑ (بھیڑیا) گھسڑ کے باہر نکلا ہو۔ سرکنڈوں کے پَردے، راکھ کے جالے، انار کے بوسیدہ چھلکے، اوٹے میں گرے اور چولہے پر اُبلتے ساگ کے کُنے میں جھڑ گئے۔ اوٹے کے آرائشی سوراخوں میں سے نکلتا دُھواں مزید کثیف ہو گیا۔ ملازم خطرہ پا کر بھاگا۔ چودھری شاں شاں سوٹا لہراتا ہُوا پیچھے لگا، کچھ سوٹیاں ملازم کی پُشت پر سے دُھول اُڑا گئیں، زیادہ تر کچے صحن کے بھر بھرے کلر، دیواروں، کھرلیوں اور چند ایک بھینسوں، بیلوں کی پُشت پر برسیں، بھینسیں کھونٹوں کے گرد چکراتی مُنہ اُٹھا بھیاں بھیاں بولنے لگیں اور گوبر پیشاب میں دُمیں بھر بھر جھاڑنے لگیں، مرغیاں بچوں کو لیے کُڑکُڑاں پھڑ پھڑانے اور اُڈاریاں (اُڑانیں) مارنے لگیں۔ بکریوں کے پَیروں تلے بچے مسلے گئے۔ دُھول آسمان کو چڑھ گئی۔ قاسو اور ملازم دونوں دھول کے پہاڑ سے ہو کر کہیں نکل گئے۔

چودھری ہَوا، فضاء زمین کو کوٹتے کوٹتے ہف کر چار پائی پر گرا، چہرے کا پسینہ اور باچھوں کا جھاگ مل کر گرتا بھگو رہا تھا، اور ٹریکٹر کے ٹائروں سے پانی کے قطرے مٹی کو گھولتے ہوئے گر رہے تھے، ایک بڑا سا کچی گیلی مٹی کا لوتھڑا دھڑ کر کے پانی میں گرا چھینٹے اُڑے اور بالو نے کھڑکی کا پٹ دھڑام سے مارا......

اُس رات قاسو واپس گھر نہ آیا۔ کسی باغ کی مینڈھ پر کینو کھاتے گزاری، اگلی صبح گیٹ کی جھری میں سے جھانکا۔ ٹریکٹر کھڑا نہیں تھا۔ گویا چودھری گھر پر نہ تھا۔ جلدی سے داخل ہوا اور بستہ کیریئر پر رکھ رسّی کسنے لگا، نذیراں اوٹے سے تین پرتوں والے پراٹھوں کا چھابا اُٹھا کر لپکی۔

''آ میرا لال روٹی کھا۔''

''نہیں کھانی مجھے اس گھر کی روٹی۔ بستہ لینے آیا تھا اب مُڑ کر کبھی نہ آؤں گا......''

نذیراں کے سینے میں تین دھمو کے لگے۔ تینوں جملوں کے گھسنے۔

''نہ پُت (بیٹا) تیرا باپ تو اَزل سے زہری! پر ماں کا تو خیال کر تیرے باجھوں (بغیر) مچھی ہار تڑپ تڑپ مر جائے گی۔''

''میں پڑھوں گا تھانیدار بنوں گا پھر اسے بتاؤں گا۔ بتاؤں گا پھر اسے......''

ناراض پھولا پھولا بند گو کھرے جیسا چہرہ جیسے پھٹی کے کچے کچے ریشے ذرا ذرا اکڑی ہوئی پھوٹوں میں سے جھانکتے ہوئے جنہیں کہرے نے کرنڈ کر دیا ہو۔

بالو باہر نکلی اور لسوڑی کے بوٹے تلے کھڑی ہوئی جیسے رس پکے لسوڑوں کے مُنہ پھٹ جائیں اور چپکنا گودا ہرے کچور پتوں پر ٹپکتا ہو جن کے بدن سے لیس داری انگڑائی ٹوٹتی ہو۔

''چل غصہ چھوڑ، اپنی ووہٹی سے مِل کل سے تیرا انتظار کر رہی ہے۔'' نذیراں نے اُس کا رخ بالو کی سمت پھیرا۔

''اس سے ملوں جس نے مجھے مروایا۔ مَیں تو اس کے لاگے (قریب) بھی نہ لگوں، اُس نے پیڈل پر پَیر مارا۔'' کیریئر نذیراں کے ہاتھ سے چھٹ گیا۔

''نہ میرا لال سکول سے سیدھا گھر واپس آنا۔''

''پر ایک شرط پر امی۔'' قاسو نے ماں کی بغل کے نیچے سے بالو کو دیکھا اور پیٹھ پھیر لی۔

''ہاں بول نا۔'' نذیراں نے نوالہ مکھن میں چُور کر کے قاسو کے مُنہ میں ڈالا۔

''امی مَیں تیرے پاس سویا کروں گا۔'' اُس نے ایڑیاں اُٹھا کر ماں کے کان سے مُنہ لگایا۔

''نہ کیوں۔''

نذیراں نے نوالہ مُنہ سے ہٹا کر واپس چھابے میں رکھ دیا۔

''تنگ کرتی ہے مجھے۔'' قاسو نے بنا ہوا نوالہ اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیا۔

''کبھی کہتی ہے میرے بال دیکھو کتنے لمبے ہیں۔ کبھی کہتی ہے دیکھ مَیں سُرخی لگا کر کیسی لگتی ہوں۔ مَیں اسے دیکھوں کہ پڑھوں، پرچے ڈالنے ہیں مَیں نے ساتویں جماعت کے آخر......''

وہ اُوپر تلے نوالے مُنہ میں ڈالتا چلا گیا...... تبھی گیٹ میں سے ہری چھلیوں کا بورا اندر جھولا جس کے پیچھے صفدر کی آواز نے احاطے میں پینگ کا ہولا را لیا۔

''پھوپھی! چھلیاں لایا ہوں تیرے لیے۔ نری کھنڈ تے مصری۔''

نذیراں نے لسوڑی کے بوٹے تلے پکی ہوئی رس اور میٹھی لیس قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے دیکھی۔ لفظ لفظ حلق کی چھلنی سے نکلے۔

''آ بالو صفدر کو لسی کا کٹورہ مکھنی کا پیڑا ڈال کر دے۔ غریب پیلی سے سیدھا یہاں آیا ہے۔ چھلیاں لے کر......''

بالو چوکے کی سمت بڑھی جیسے سن کا دراز قد بوٹا کمر تک پیلے گہنوں سے پھولوں میں لدا نہر کنارے صبح کی ہوا میں لہرایا ہو۔ کھن کھن کھن۔

''خالاں چھلیاں ہیں۔''

صفدر نے بڑھ کر چھلیوں والا بورا اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ ادھ کچری مہک اُٹھی پتہ نہیں لڑکیوں کے کنوارے بدن اور دودھی چھلیوں کی مہک ایک جیسی کچی پکی سی کیوں ہوتی ہے۔ جیسے بیلے میں لگی گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑی دھان کی رنگ بدلتی بالیاں، سورج کے سینک میں دم پر لگی، پَردوں میں چھپی پکتی ہوں، اندر ہی اندر بڑی راز داری کے ساتھ۔

''ہاں بھون لے نا۔ چولہے میں چھوڑا لگا ہے۔ انگارے بن رہے ہیں۔ آپ بھی کھا ہمیں بھی کھلا بالو......''

''با گے اچ آ بالو......
کنگھا شیشہ میں دینا آں......
گت کر کے دکھا بالو......''

لال جوڑے کی ہر سلوٹ پر موم بتیاں سی جلیں، نذیراں نے قطرہ قطرہ پگھلتی موم کو دیکھا، بالو رنگلے پیڑھے پر بیٹھی جیسے سورج کی حرارت پا کر گوکھرے کے گلدان میں پھٹی کا گُم پورا کھڑ جائے۔ صفدر چھلیوں کے پردے چیر چیر کر پیش کرنے لگا۔ انگوٹھے کا ناخن کچے دانے میں دبایا۔ دودھ کا قطرہ اُڑ کر ہونٹوں پر پڑا۔ زبان پھیر کر چٹخارہ لیا۔ ''بالکل دودھی شہد، بھوننے کی بھی ضرورت نہیں کچی ہی چر جاؤ دودھ اور گودا دونوں......''

بالو دہکتے کوئلوں کو پنکھا جھلنے لگی جیسے ہاتھ ہی نہ ہلا ہو پُورے بدن نے جھولا، جُھولا ہو۔ پنکھے کی

گھنگھریاں ہی نہ بجی ہوں۔ ساری ہی کھنکی ہو...... کھن کھن کھن...... جیسے روم روم کو گہنے چڑھے ہوں جو ذرا ذرا میں بجتے ہوں، صفدر جھنجھنے کی طرح پورا چھنک گیا۔ کوئلوں پر جمے سفید سفید راکھ کے ذرّے اُڑے اور عنابی بدن تڑختے بھنتی ہوئی چھلیوں کی سوندھی مہک اوٹے سے نکل پورے صحن میں پھیل گئی۔

قاسو بستہ اور سائیکل اُٹھا کر پتہ نہیں کب کا نکل گیا تھا۔ چھلی کے بھننے کا انتظار کیے بغیر......نذیراں چھلّی کھا رہی تھی۔ صفدر بھی چھلّی کھا رہا تھا۔ بھنی چھلیوں کی مہک پورے احاطے میں گھومتی دیواریں پاٹ رہی تھی جیسے اُس کے ہاتھ پَیر لگے ہیں اور وہ قدم قدم پر دستکیں دیتی اپنے وجود کو ہر شئے میں اُنڈیلتی چلی جا رہی ہو۔ ہر دستک پر تینوں دِلوں کے کنڈے دھڑ دھڑ بجتے اپنی اپنی آواز کے ساتھ تبھی خطرے کے سائرن کی طرح ٹریکٹر چنگھاڑتا ہوا گیٹ سے داخل ہوا۔ دھڑ دھڑ بجتے کواڑ دھک دھک کھڑکنے لگے۔ ٹریکٹر کے اُٹھائے ہوئے منوں مُنہ مٹی کے طوفان میں سے چودھری نمودار ہوا۔ سفید پگڑی، پلکیں، مُونچھیں سب دھول کی تہ میں بدرنگ ہوگئے تھے۔

''پھوپھا جی سلام۔''

صفدر مٹی کے اُٹھتے بیٹھے غبار کی اوٹ میں سے گزرتا باہر نکل گیا۔ سوت کی بنی چارپائی پر اُس کی ادھ کھائی چھلّی پڑی رہ گئی، جس کے بدن سے بھاپ میں لپٹی میٹھی سلونی مہک چھنتی تھی۔ پگڑی، پلکیں، مونچھیں، جُوتے سب ڈب کھڑب ہوگئے۔

''یہ یہاں کیوں آیا تھا؟''

چودھری نے ادھ کھائی چھلّی کی طرف اشارہ کیا جیسے صفدر اپنا بھُوت وہیں چھوڑ گیا ہو۔

''کیوں پہلے کبھی نہیں آیا کیا؟''

نذیراں نے ادھ کھائی چھلّی اُٹھا کر چولہے کے پیچھے راکھ کے جالوں میں رکھ دی جیسے صفدر کے بھُوت کو کہیں کال کوٹھڑی میں چھپا رہی ہو۔

''پہلے اور اب میں بہت فرق ہے۔ اب گھر میں جوان لڑکی ہے۔ فصل پک جائے تو اس کے بنے سے لانگا ناپا (گزرنا) روک دیا جاتا ہے......''

انگاروں پر پڑی چھلیوں کے سینے سے دُھواں نکلنے لگا......نذیراں نے تکا دیوار سے اُلار کر باہر اُچھالا۔

''بالو چھلیاں پلٹ سڑ گئیں۔''

''قاسو آیا تھا......'' چودھری نے تکے کی پرواز دیکھی۔

''آیا تھا بچہ ہے ابھی......سال دو سال کی چوری ہے۔ ہوشیار ہو جائے گا۔''

نذیراں نے چھلّی کے دانے گھیر کے ہتھیلی چودھری کے سامنے کر دی۔

''چودھری! تیری کیا صلاح ہے۔ بالو کو چھ مہینے سال کے لیے اس کی ماں کے گھر نہ بھجوا دیں۔''

چودھری نے اُس کی ہتھیلی سے اُٹھائے دانے اُچھال کر اُس کے مُنہ پر مارے۔

''کیوں اپنی عزت گھر سے نکال دوسروں کے بُوہوں (دروازوں) پر پھینک دوں......تا کہ ہر کاں کُتا مُنہ مارے، چک تان کے چوک میں بٹھا دوں......سارے تیلیاں ہٹا ہٹا نظارہ کریں......نیلامی پر لگا دوں اپنی عزت کو...... بولیاں دیں آ کر صفدرا، پرویزہ، امیرو......نصرو......سارے تیرے بھتیجے بھانجے......'' نذیراں آنکھ میں پڑے دانے کے چھلکے کو چادر کے پلو سے مسلنے لگی۔

صحن کے وسط میں بنی پودینے اور دھنیے کی کیاری مہکتی تھی۔ بالو کونڈی میں کوٹ کوٹ پودینہ باریک کر رہی تھی۔ انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی میں لے کر پودینہ چیک کرتی اور پھر کوٹنے لگتی۔ نذیراں تنور پر مکھن میں مومو کر پراٹھے لگا رہی تھی۔ پودینے اور دیسی گھی کی مہک باہم جذب ہو گئی تھی۔ اوٹے کے پاس چارپائی پر بیٹھا صفدر دونوں ذائقوں کے تیار ہونے کا انتظار کر رہا تھا، جن کی اشتہا نے کوئی تیسرا ذائقہ بنا دیا تھا۔ شاید بھوک کا ذائقہ......دل، کلیجہ، پھیپھڑے، ہونٹ سب رالیں ٹپکاتے تھے۔

''ابھی باریک نہیں ہوا۔'' بالو گھوٹنے کے ردھم کے ساتھ جھومی......''ہو تو گیا ہے......''

''پر تجھے پسند نہیں آ رہا......''

صفدر نے ہاتھ بڑھا کر پور سے چٹنی لگائی اور اُنگلی منہ میں چُوسی۔

''سی سی کراری مِسی روٹی کے ساتھ ڈبل مزا......''

دیوار کے ڈھلے سائے میں بچھی چارپائی پر بیٹھا قاسو سبق یاد کر رہا تھا۔ ہَوا جگہ گھیرتی ہے......وزن رکھتی ہے۔ بے رنگ، بے بُو ہوتی ہے۔

''بے رنگ بے بُو تو بہت سی چیزیں ہوتی ہیں۔ نگاہ ہوتی ہے۔ خیال ہوتا ہے۔ جذبہ ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے۔ سدھریں ہوتی ہیں۔

صفدر ہر جملے کے ساتھ پور چاٹتا۔ ''سی سی...... کراری۔''

''تو تُو پڑھا دیا کرنا بیچارے کو، دس جماعتیں پاس ہے۔ ساتویں جماعت کا کیا ہے......''

بالو نے زور سے رگڑا دیا۔ صفدر نے کونڈی میں اُنگلی لگا پھر چوسی۔ ''سی سی کراری۔''

رگڑے اور چٹخارے میں دیسی چپل کی آواز جذب ہو گئی۔ صفدر کی چٹنی بھری پور دانتوں تلے کٹ گئی اور چٹنی کونڈی کے کناروں سے چھلک گئی۔

چودھری نے گیٹ کے پاس ڈھلے سائے میں پڑھتے ہوئے قاسو کی کتابیں جھپٹیں۔

''نہ تُو نے دو ہزار کا چپڑاسی بننا ہے کہ تین ہزار کا کلرک لگنا ہے، ان کتابوں میں تو ڈھونڈتا کیا ہے۔ ڈھائی مربعے کا اکیلا وارث۔ ڈیڑھ پکا مربع ایک گھوڑی پال۔ مربعے بھی سونے کے بھرے تھال...... تو یہ کتابیں چھوڑتا کیوں نہیں......''

قاسو چیخا ''نہیں چھوڑوں گا، پڑھوں گا...... بی۔اے، ایم۔اے کروں گا اور پڑھوں گا اور......''

''تُو بی۔آ، ایم۔آ کرے گا۔ بی۔آ، ایم۔آ...... اور ادھر تیری عزت کا بی۔آ، ایم۔آ۔ کال کٹے کر رہے ہیں...... تیری لک شریک سُونگھ رہے ہیں......''

چودھری نے کتابیں اُلار کر پھینکیں، جو سیدھی تنور کے مُنہ میں جا گریں۔ نذیراں نے تنور میں لگے دیسی گھی میں رچے پراٹھے، ہاتھ پہ پونا لپیٹ جھٹ جھٹ اُتارنے کی کوشش کی لیکن کتابوں کے ڈھیر کی بھڑک نے روٹیوں کو دھکا دیا اور تنور کی دہکتی ہوئی عنابی سطح سیاہ پڑ گئی اور گھنا گھنا دُھواں تنور کی گولائی میں سَر پٹخنے لگا، قاسو تنور کی سمت بھاگا، پیر کونڈی سے ٹکرایا جس میں بھری پودینے کی چٹنی، اُلٹ گئی، صفدر مُڑا پودینے کی گری ہوئی چٹنی میں پَیر پھسلا جتنی سرعت سے ہرے ہرے قطرے اُڑ کر سفید گرتے پر پڑے اتنی ہی تیزی سے وہ گیٹ سے باہر تھا۔ قاسو کڈنی (چھڑی) سے کتابیں اُٹھا تنور کے مُنہ تک لاتا اور وہ پھر نیچے گر جاتیں۔ تنور سے نکلتے کتابوں کے لانبوں میں آنسوؤں سے بھرا چہرہ لال انگارہ ہو گیا۔

''امی! بتا دے اسے جھوٹی کھول کر لے جاؤں گا منڈی میں اونے پونے بیچ کے ٹرک کے کتابیں خریدوں گا ایک کی جگہ دو دو لوں گا، ضرور لوں گا......''

نذیراں دھک دھک بج رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی جلدیں لے ہاتھ مار مار بجھاتی۔ پلو میں دبا دبا اُس کے ہاتھ ٹھنڈے کرتی اور پھر اُسی پلو سے آنسو پُونچھتی، جو پھولے پھولے گلابی گالوں پر میل کی دھاریاں بن گئے تھے۔

چودھری نے چھڑی بڑھا بجھی ہوئی کتابیں پھر تنور میں پھینکیں۔

''تیری وجہ سے بھڑوے تیری وجہ سے آج میرا گھر میلا بن گیا ہے جس کا جی چاہتا ہے۔منڈوا دیکھنے چلا آتا ہے۔''

نذیراں بازو سے کھینچ اوٹے میں لے گئی۔ چودھری یوں اپنی جگہ سے ہلا جیسے ہاتھی دھاگے سے بندھا تھا جو یونہی ذرا سی کھینچ سے ٹوٹ گیا ہو......اور اب وہ اوٹے کی مٹی سی دیوار میں مُنہ چھپا رو دے گا یا سو جائے گا۔

''چودھری!'' نذیراں کی آواز سرگوشی ہوگئی۔

''چودھری کملا نہ بن...... دیکھ، سوچ، لڑکا ابھی نیانا ہے جس کے سَر پر یہ دھریک سی مَیار بیٹھی ہے۔ چل دو گھڑی ہنس بول لے گی تو تھوڑی تسلی ہو جائے گی بہلی رہے گی۔ کہیں بھاگ تھوڑی جا رہی ہے۔ سَر پر تو میں بیٹھی ہوتی ہوں...... گھر کی عزت گھر میں ہی سنبھلی رہے تو کیا بُرا...... کاں کُتے تو نہ ہوتا......اُس دن ابروکمی کا چالا دیکھا ہی تھا تُو نے......''

اس عرصے میں چودھری چھپری کی چھت سے کڑوا تیل پی پی پلی شاماں والی سوٹی، کھینچ چکا تھا جس کی سناڑ ساڑ کے ساتھ نذیراں اوٹے میں اوندھا گئی۔ قاسو جلی ہوئی کتابوں میں سے ادھ جلی جلدیں اُٹھا کر باہر بھاگا۔ بالو اندر کوٹھے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھ باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ چودھری کی باچھوں سے اُگلتا جھاگ مُونچھوں کے کناروں سے ٹپکتا تھا۔

''گھر کی عزت گھر میں...... کیسے ہوگئی گھر میں، تیرا بھتیجا ہے میرا تو شریک ہی ہوا نا...... شریکوں کو اپنی عزت کا راکھی وال بنا لوں۔ بے غیرت عورت...... تُو نے گھر بھیدی ہو کے سینندھ لگوائی...... گولی ماردوں میں اُس سسرے کو...... جان سے مکا دوں تم دونوں کو......گھر کی عزت......گھر میں......'' ہر ہر جملے کے ساتھ شاماں والی سوٹی کی ساڑ سڑاں میں لسی والی چاٹی ٹوٹ گئی۔ سارا چوکا تر بتر ہوگیا۔ چولہے بجھ گئے۔ تنور کی مٹھ بھر گئی۔ بھڑولوں کی کمریں زخمی ہوگئیں۔ مال مویشی مُنہ اُٹھا بھاں،

بھاں بکانے لگے۔نذیراں ناک مُنہ پلو میں دباتی دیواروں، اوٹوں، کوٹھوں میں گھسنے لگی۔

اُس روز پورے مربعے کا وتر تھا۔ چودھری اذان سے پہلے ٹریکٹر کے پیچھے ہل لگا، سُرمہ بنی سُرمئی مٹی کو گھرا گھرا اُلٹا تا پلٹتا تا رہا تھا۔ ہل پھرولی مٹی میں چڑیوں، لالیوں، فاختاؤں کے پرے ترچھی اُڈاریاں مار اُترتے پچھلے سال کے گرے پڑے دانے لکھ کیڑے چونچوں میں بھر غوطے، لگاتے، اُڑتے۔ چودھری یکدم ٹریکٹر سے اُترا ناہلی کے تختے کو چار رسیوں سے جکڑے دو دو کونے پکڑے بنے بناتے ملازموں کو آواز دی۔

''اوئے صلابتا، اوئے فقیریا!......مَیں ذرا احاطے سے ہو کر ابھی آیا۔ ذرا ٹریکٹر پکڑو......''

نرم مٹی میں چودھری کے پَیر بڑے بڑے مورے بناتے چلے گئے جن کی اندرونی نمی میں پرندے گھسنے اور چگنے لگے۔

چودھری صفدر کے گھر والی گلی سے ہو کر گُزرا اور اُس کی بیٹھک کے تھڑے ہی سے اُس کا کھرا پکڑ لیا۔ کھرا سیدھا چلتا ہوا چودھری کے گیٹ میں داخل ہوا...... گیٹ بند تھا...... چودھری نے گیٹ کی چھوٹی طاقی پر پہلو کے بل وجود کا سارا وزن اُچھال کر مارا۔ اندر سے کُنڈی نہیں لگی تھی۔ چودھری اپنی ہی طاقت سے مُنہ زور دھکا کھا کر بے وزن تنکے کی طرح دو فٹ اَندر جا گرا۔ طاقی ہَوا کی مانند کُھل کر لرزنے لگی، صفدر بالو کی کھڑکی کے سامنے کھڑا کانپا، کھڑاکے کے ساتھ پلٹا، جتنی دیر میں چودھری نے چھپری کی چھت سے برچھی کھینچی، اُتنی دیر میں صفدر گیٹ سے باہر تھا۔ باہر گلی میں اُس کا کھرا دُور تک کہیں نکل گیا تھا۔ ایڑھی زمین کو نہ چھوئی تھی، بس پنجے ہی پنجے لگے تھے جیسے کوئی چوہا بلی کے آگے آگے دوڑا ہو۔ چودھری نے کھروں بھری گلی میں جھانکا اور پھر ایسا دھکا کھایا جیسے کوئی وزنی صندوق اُٹھانے کو سارے اعصاب اور قوتیں مجتمع کر کے پُورا زور لگائے، پر صندوق خالی نکلے۔

چودھری ناگہانی چوٹ سہلاتا، برچھی لہراتا بالو کی کھڑکی تک آیا۔

''یہ یہاں کیوں آیا تھا۔'' چودھری کی آواز کی غراہٹ کے ساتھ کتا بے تحاشہ بھونکنے اور گیٹ کی سمت زور لگا، رسہ تڑوانے لگا۔

''خالاں کا پُوچھ رہا تھا......'' بالو کھڑکی سے اُٹھی۔ اس بے نیازی سے جیسے اُس کے ہاتھ میں پکڑی برچھی نہیں سرسوں کی گندل ہو۔ زرد پھولوں سے بھری ہوئی جو بے قابو ہو کر جھڑنے لگی ہو۔

چودھری کو لگا وہ ذرا سا ہنسی بھی ہے یا ہونٹوں کو قوس بنایا ہے جیسے برچھی کی سنہری دھار پر تھوک دیا ہو۔

''وہ خود کدھر گئی ہے۔''

چودھری نے دھاڑنے کی کوشش کی لیکن آواز نرخرے میں گھڑ گھڑا سی گئی۔ جیسے بلغم کا گولا گلے میں پھنس گیا ہو۔

''سرسوں کی گندلیں توڑنے۔''

اب اُس نے چودھری کو بالکل سیدھا دیکھا...... اِس وقت اُس کی آنکھوں میں برچھی کی دھار کا قوسی عکس لہرایا، دوپٹہ ڈھلک کر گردن سے نیچے چلا گیا جس نے چودھری کا رُخ تیورا دیا اور برچھی کی دھار پھر گئی۔

''منی اور ننھی؟''

چودھری کی چنگھاڑ پَیروں تلے بھربھری مٹی میں جیسے دلی ملی گئی ہو۔

''وہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔'' برچھی کے لہراتے عکس والی آنکھوں کی جھلملاہٹ بلی کی آنکھوں کی رنگت جیسی تھی...... نری بے اعتباری عورت......

''اچھا سب کو ساتھ لے گئی اور بھتیجے کو یہاں بھیج گئی، عزت محفوظ کرنے، گھر کی بات گھر میں رکھنے...... پہلے تو اسی کا سیاپا......'' چودھری برچھی سر پر لہراتا گیٹ کی سمت پلٹا...... باہر نکلنے سے پہلے مُڑ کر دیکھا۔

''کس پیلی میں گئی ہے۔''

''پتہ نہیں......''

فضا میں اُنگلیاں لہرائیں کھڑکی سے اُٹھ کر دروازے تک آئی۔ ہر قدم پر بدن میں تین بل لہراتے تھے ایک کولہوں میں...... ایک کمر میں...... اور ایک سینے کے اطراف میں...... اور پھر تینوں کا ارتعاش مل کر آنکھوں میں تھرتھرا جاتا تھا جن میں برچھی کی دھار کا رنگ اُتر گیا تھا۔ چودھری نے سوچا ایسی عورتیں کم از کم تین قتل ضرور کرواتی ہیں اور آج پہلے قتل کی باری ہے۔

''یہ کب آیا۔''

''ابھی آ کر کھڑا ہی ہوا تھا۔''

بالو نے اُنگلیاں فضا میں پھر پھیلائیں۔ جن کے سَروں پر لہریئے سانپ زبانیں چٹخاتے تھے۔
باہر گلی میں صفدر کا کھرا بل کھاتا ہوا دور تک چلا گیا تھا جس کی ایڑھیاں زمین سے نہ چھوئی تھیں
بس پنجے ہی پنجے لگے تھے۔
آج تو عزت محفوظ ہونے سے بچ گئی لیکن کب تک وہ پہرے پر رہے گا اور یہ قاسو کھسرے کی
اولاد...... گھر کی عزت گھر میں...... ورنہ کاں کُتے۔ کُتے کاں...... شریک...... بھتیجے بھانجے...... نوکر
بردے......''
چودھری برچھی لہراتا واپس پلٹا اور برچھی کی نوک بڑھا کر بالو کی کھڑکی کا پٹ مار دیا...... آنکھوں
کی بلی رنگت کچی کیری کی طرح کچور ہوگئی۔
چودھری نے برچھی اُچھال کر صحن میں پھینکی جو کہ تک زمین میں دھنس کے کماد کے پاندے کی
طرح لرزنے لگی۔
بالو اُٹھی تو برچھی کی دھار سے لرزتے بدن کے تینوں بل بلبلا کر یکبارگی بیدار ہوئے۔ چودھری
نے حلق سے نکلتی گھڑگھڑاہٹ تلووں تلے پیس ڈالی۔
''وہ پوچھے تو کہنا صفدرا پھر کر چلا گیا تھا۔''

ماں بیٹا اور......

ڈاکٹر نے کہا تھا:

''یہ اب آپ کی دنیا میں نہیں ہیں، جیسے انہوں نے آپ کو کبھی پالا تھا، اسی طرح اب آپ انہیں پالیں، دیکھیں یہ اب کتنا عرصہ آپ لوگوں سے خدمت لیتی ہیں۔ یہ عرصہ دن بھی ہو سکتے ہیں اور مہینے بھی۔''

بات دن اور مہینوں کی ہو تو عمر بھر کی خلش خدمت میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ وہ سب خدمت میں لگ گئے۔ اپنی ماں کی خدمت میں، جو دیکھتی تھی۔ پر پہچان نہ پاتی تھی، سنتی تھی پر شناخت نہ کر سکتی تھی۔ اُٹھ بیٹھ سکتی تھی لیکن اپنے ضروری حوائج سے بے خبر تھی۔

صحن میں کھڑے اوکاں کے کھکھل کے نیچے پڑی چارپائی پر ہڈیوں کی ٹیڑھی میڑھی سلاخیں پڑی رہ گئی تھیں۔ گوشت، خون، رنگ روپ سب جھڑ گئے۔ پھول پتے، پھل، شاخیں سب جھڑ جاتے ہیں۔ لیکن ٹنڈ منڈ چھال اُترے ڈنٹھل، جھکڑ، آندھی، بارشوں کی مار کھاتے ہوئے کھڑے رہ جاتے ہیں، شاید عبرت کے نشان بن کر...... آدھے زمین کے اندر، آدھے باہر جن میں چمگادڑیں اور چوہے بسرام کرتے ہیں اور دیمک مٹی چاٹتی ہے۔

عارف اس حقیقت سے آگاہ تھا، اور عارف سے زیادہ اُس کی بیوی عائشہ جو شہری حقیقت

پسندی اور سائنٹفک بے حسی کی تعلیم یافتہ تھی کہ یہ تعلیم انسان کو الف ننگا اپنے مقابل کھڑا کر دیتی ہے۔ برہنگی خوبصورت نہ سہی پر ہوتی سچ ہے۔ عارف اس قبیح حقیقت سے آگاہ تھا کہ ماں دراصل سانس لیتے وجود میں مر چکی ہے۔ پر جسے قبولنے کو زمین ابھی اپنی آغوش کھولنے پر آمادہ نہیں ہے اور موت کی سپرداری میں زندہ وجود اپنی بازیافت کے کرب سے دوچار ہے، جس کی طوالت پہلے دُکھ دیتی ہے۔ پھر عبرت اور بالآخر بیزاری، ایسے میں مٹی کو مٹی کے اس تحفے کی قبولیت میں پس و پیش بڑی زیادتی ہے۔ اس حقیقت کا ادراک عارف کو دُکھی کر دیتا اور عائشہ کو فلسفی بنا دیتا۔ دنیا، انسان، اشیاء اور موت کے فلسفے سے آگاہ انسان کتنا کٹھور ہوتا ہے۔

''سینونٹی سے Above اس طرح کے پرابلمز فیس کرنا پڑتے ہیں۔ عرفی جانی! اس میں اموشنل ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ وقت تو سبھی پر آتا ہے۔ In these circumstances بہترین دُعا یہ ہے کہ خدا اُنہیں اس کرب سے نجات دلا دے۔''

عارف اس فیصلے سے اختلاف کی جرأت نہ کر سکتا اور دُعا کے لیے ہاتھ کھڑے کر دیتا پتہ نہیں آمین کہتا یا دُعا میں کچھ خفیہ خفیہ ترمیم کر دیتا کیونکہ دیہات کی خوش فہم معاشرت نے اُس کی عمر کے ایک حصے کی آبیاری کی تھی جس کا یہ پہلو اچھا ہے کہ بُرا کہ ایسے تابوت نما کھکھلوں سے بھی کسی شگوفے کے پھوٹنے کی آس لگائے رکھتے ہیں۔ گاؤں میں موجود عارف کے بہن بھائی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کے ریاضی کے جواب جیسے دوٹوک فیصلے کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے اور کسی حکیم یا پیر فقیر کے پاس جانے کو بے چین رہتے کہ اس علاج میں مایوسیت کا عنصر کبھی نہیں آتا۔ وہ مالش کرتے، سَر جھستے، ہاتھ پَیر دباتے اس یقین کے ساتھ کہ ماں اُٹھ بیٹھیں گی اور باتیں کرنے لگیں گی۔ وہ سب ماں کے گرد گھومتے رہتے۔ لسّی میں پڑی مدھانی کی طرح کہ جسے جتنا بھی گھماؤ لسّی کی سطح پر کبھی مکھن کی تہہ نہیں چڑھتی۔ اوکاں کے کھکھل کے گرداگرد بچھی سفید براق سوت کی چارپائیوں پر نیل لگے سفید کُرتوں اور رنگ دار تہمدوں والے رشتہ دار جمع رہتے، لسّی کی بجائے افسر بیٹے کی شہری کمائی سے آئی کالی ہری بوتلیں پیتے اور بڑے بڑے ڈکار مارتے۔

''گناہ جھڑ رہے ہیں، بیماری کا عذاب قبر کے عذاب کو کم کر دیتا ہے۔''

عارف حیران ہوتا، کولہو میں جُتے بیل کے چکر میں بھی کیا کبھی کوئی غلطی رہ جاتی ہے۔ بے زباں،

بے ارادہ، آنکھوں پہ چڑھے کھوپے ایک ہی دائرے کی گول لکیر بجھاتے ہیں اور دائرے میں سے کوئی سمت کوئی رستہ کوئی گلی نہیں نکلا کرتی۔ رات کو سوتے ہوئے جب کبھی بجلی چلی جاتی تو دوسرا فیز تبدیل کرنے یا جنریٹر چلانے تک عائشہ اور بچے بلبلا اُٹھتے۔ عارف نہ بلبلاتا نہ واپڈا کو دھمکاتا، خود پر اس عذاب کو چُپ چپیتے طاری کیے اس کی شدت کا اندازہ کرتا۔ گاؤں میں بجلی تو تھی۔ پنکھا اور کولر بھی وہ چھوڑ آیا تھا لیکن اے سی والی بات کہاں، اب تو گاؤں کے کچے مکان بھی پکے ہو رہے تھے اور چار دیواریاں پیپل اور برگد کے پیڑوں کو لپیٹنے لگی تھیں۔ یہ پکے مکان اور بلند دیواریں شہر جیسی ہی گرمی اور حبس چھوڑتے تھے۔ عائشہ اُس خاموشی میں چھپی کسی سازش کو بھانپ جاتی۔

''عرفی! تمہارے گاؤں میں بجلی کب آئی تھی۔'' سلیپنگ شرٹ کے پسینے میں گچ بنا آستینوں کے سٹریپ کو وہ ڈھیلا کرتی۔

''یہی پانچ سات سال پہلے۔''

کردہ گناہ کی تمام تر شرمندگی کے ساتھ عارف اقبالِ جرم کرتا۔

''یعنی Sixty سے تو Above ہی ہوں گی نا تب۔''

عارف کہنا چاہتا ''لیکن اُس وقت تو وہ صحت مند تھیں۔ سورج سَر پر رکھے ننگے پَیروں جلتی بلتی دُھول روندتی، پسینے میں گچ وجود کی سان پر شدائد کی تلوار کے وار سہتی تھیں۔ بھوکوں اور دُکھوں کے ترنجن کی ہُوک پر...... پر اب تو وہ بیمار ہیں۔'' لیکن ایسے میں ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری کی بیٹی، خود سیکرٹری سی لگنے لگتی، کئی کنال کی اس سرکاری رہائش گاہ میں کئی اے۔سی لگے تھے۔ جو چلتے ہی رہتے۔ کسی میں رشین ڈاگ سوتے تھے۔ کسی میں سیامی بلی، کچھ یونہی ملازم عادتاً آن کیے رکھتے، کہ ایسی کوٹھیوں میں آ کر انہیں بھی گرمی زیادہ لگنے لگتی ہے لیکن ماں کی گنجائش کہیں نہ نکلتی تھی، کیونکہ وہ ان سب سے اتنی بے جوڑ، اَنمل اور Below Standard تھی کہ ملازم سول لائن کی دوسری کوٹھیوں میں جا جا کر کیسی کیسی باتیں نہ کرتے، مٹی کے گھر سے سول لائن کے عالی شان بنگلے میں پہنچنے والے کے ساتھ چمٹی ہوئی یہ فکر بھی پہنچتی ہے۔ ''لوگ کیا کہیں گے۔ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔''

کچے گھروں میں دفن ماضی کی ناگوار بو کے جواہر، ایئر فریشنر اور یوڈی کلون کی مہک سے کہیں طاقتور ہوتے ہیں جس میں بیمار ماں کی باسی بسی ہمک بھی شامل تھی، لسّی کی کھٹی مہک اور پسینے کی کڑوی

واشنا تو اُس کے اپنے وجود کا حصہ بھی رہی تھی، انہی ساری بوؤں کی آغوش میں اُس کے دماغ میں حرفوں کی بوائی اور سنچائی ہوئی تھی، کثیف نہری پانی کی طرح کہ جس میں طرح طرح کی آلائشیں آمیز ہوتی ہیں پر فصلوں کو خوب شاداب کرتا ہے۔ جبکہ پیور واٹر انہی فصلوں کے لیے مضر صحت ہوتا ہے لیکن یہ تو اُس وقت کی بات ہے، جب بوؤں اور مہکوں میں سنی ہوئی ماں بولتی اور سنتی تھی۔ بھینس کا دودھ خود دھوتی، مکھن کا پیڑا نکالتی، خود لسی سے سُوکھی روٹی کھاتی، اور مکھن کے جمع کیے ہوئے پیڑوں میں آٹے کی چٹکی ڈال کر اُسے ہلکی آنچ پر گرم کرتی، ہلکے انگوری، ہلکے کیسری رنگے گھی کا منہ ململ کے بُراق کپڑے سے باندھ چاندی سی چمکتی دیگچی اُس کی سبز نمبر پلیٹ گاڑی میں رکھواتی، جسے دیکھ کر عاشی کے چہرے پر آئی مسکراہٹ جیسے عارف کے ماضی کی تضحیک اُڑاتی ہو۔ اسی لیے تو اب اُس کے دیکھنے سے پہلے ہی وہ دیگچی ڈرائیور یا کسی چپڑاسی کے حوالے کر دیا کرتا۔ پر ماں کو یہ بتانے کی اُس میں ہمت کبھی نہ ہوئی کہ اب شہروں کے ماڈرن لوگ دیسی گھی نہیں کھاتے کیونکہ وہ مضر صحت ہوتا ہے۔

وہ چائنیز فوڈ، منرلز اور فوڈ سپلیمنٹ کھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب اُن کی نظروں کے سامنے تیار نہیں ہوتے۔

عاشی جب بڑے بڑے سٹورز سے شاپنگ کرتی، تو پھر اُس کے چہرے پر منہ بند خاموشی سی کہیں سے نکل کر آ چپکتی۔ یہ بیوی بھی بدن میں اُترتی سرگرشیوں کی کتنی رازدان ہو جاتی ہے، جیسے پرندے موسموں کی تبدیلیوں کو ہوا کی مہک سے پہچان جاتے ہیں۔ اُسی طرح وہ اُس کے چہرے کے صاف مطلع میں کہیں دور اُڑتی ریت کی مہک سی سُونگھ لیتی۔ ذرا سا قہقہہ لگاتی، اس سوسائٹی میں ہنسنے، بولنے، رونے، سب کی مصنوعی پرتوں کی پیائش متعین ہوتی ہے، جن میں بدلتے موسموں کو معتدل رکھنے کے لیے مصنوعی آلات نصب ہوتے ہیں۔

"Come on عرفی یار! عادتیں نہیں بگاڑا کرتے، جو جس حال میں جینے کا ڈھنگ سیکھ جائے۔ اُسے اُسی میں مست رہنے دیتے ہیں۔ پُرانے سٹ اَپ کو تبدیلی اَپ سیٹ کر دیا کرتی ہے۔"

کبھی کبھار وہ بعد میں آ کر ویسے ہی ایک دو سوٹ لے کر گاؤں بھجوا بھی دیا کرتا، لیکن ماں کو پہنے ہوئے، اُس نے کبھی نہ دیکھے، یا اُس کی بہنوں کو پسند آ جاتے یا بھابیوں کو یا اُن کی بچیوں کو اور ماں کہتی۔

''لو اس عمر میں پہنتی کھاتی، میں اچھی لگتی ہوں کیا۔''

لیکن عارف کو لگتا ماں کے نحیف بدن کو یہ موٹے کھردرے کپڑے ضرور تکلیف دیتے ہوں گے۔ اگرچہ زندگی بھر اُس نے موٹے کھردرے کپڑوں کو ان سے بھی موٹے کپڑے کے پیوند لگا کر پہنا، اور اَن چھنے آٹے کی خشک روٹی لسی سے نگلی کہ چھان نکل جانے سے کہیں سال بھر کے اناج کا حساب گڑ بڑا نہ جائے۔

لیکن یہ سب کچھ تو اُس نے خود بھی کھایا اور پہنا تھا۔ پر اب ان کے تصور سے بھی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ تو اس کا مطلب ہے۔ عادتیں تھوڑے عرصے میں تبدیل ہو جانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یوں بھی جب ماں سب سہتی جھیلتی تھی۔ اُس وقت تو وہ بھٹے کا سب سے جلا ہوا کھنگر تھی اب تو وہ پلی اینٹ کی طرح ساری کی ساری بھر بھر کر پیلا پیلا سفوف سی ہو گئی تھی۔

عائشہ بدن میں اُترتی خاموشی کو پھر سُن لیتی شاید بدن کی سانجھ دل کی خفیہ کتاب کے حرف تک پڑھ لیتی ہے۔

''تم آسائش زدہ ہو گئے ہو عرفی! جبکہ وہ Used to ہیں۔ لسی پینے والے کو تم برگر کھلا نے لگو تو اُسے تو ڈائریا ہو ہی جائے گا نا۔''

عارف اُس وقت سوچتا، وہ اگر آسائش پسند ہوا ہے تو اس عہدے کی بدولت، تو یہ عہدہ اُس کے لیے کیسے ممکن ہوتا، اگر ماں دن بھر کپاس کانے اکٹھے نہ کرتی اور پھر ایک ایک کانا جلا کر رات گئے تک بیٹھی روشنی نہ کرتی رہتی، جس کی لو میں وہ کتابیں پڑھتا تھا، کیونکہ اُن کے پاس دیا تو تھا لیکن اُس میں تیل ڈلوانے کے پیسے نہ تھے اور ماں بجھا ہوا دِیا طاق میں رکھے اس پکے چوبارے کو دیکھ دیکھ کانوں کی بھڑک کم زیادہ کرتی رہتی، جس میں گیس کے ہنڈے جلتے تھے، اور اُس کا شوہر اور سوکن کے بچے آرام دہ بچھونوں پر سوتے تھے۔ وہ کتاب کے زیرہ زیرہ لفظوں کو آنسوؤں کا بگھار لگی، سرکنڈوں کی جلتی بجھتی لو میں چنتا۔

''ماں! اُس طرف مت دیکھ، اک روز تجھے اس سے بڑا اور روشن چوبارہ بنوا کر دوں گا۔''

اُس نے اپنا وعدہ پورا بھی کر دکھایا لیکن اُس وقت جب ماں اُس بڑے اور روشن چوبارے کی خواہش والا چراغ بجھا چکی تھی۔ اُس کے بھائی جو کپاس کانوں کی روشنی کے بھنگوں کے ہمراہ کتاب کا کیڑا

بننے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اس شہری طرز کے گھر کے نرم گدیلوں پر اینٹھتے اور اُس کے منی آرڈروں کا انتظار کرتے، جنہیں بانٹنے کے لیے وہ ڈکراتے اور دست و گریباں ہوتے، کہ ''مفت'' رشتوں کو بے حس اور انسانوں کو خود غرض بنا دیتا ہے اور خواہشوں کا دیا لوبھ کے تیل میں خوب بھڑ کنے لگتا ہے۔

ماں کے اندر تو خواہش والا یہ دیا بس اُس وقت پوری لَو سے بھڑکا تھا جب بطور پرائمری سکول ٹیچر وہ اپنی پہلی تنخواہ سے سیمنٹ اور ریت خرید کر لایا تھا اور اپنے ہاتھوں ماں کو وہ چوکا پکا کر کے دیا تھا۔ جہاں وہ اُپلوں کا دھواں نگلتی تھی اور مٹی کی ہانڈی میں پکے روڑ چڑھا مرچ نمک ملا سالن پکاتی تھی۔ پر اُس روز اُس نے قصوری روغنی ہانڈی میں گھنگھنیاں پکا کر بانٹیں تھیں، اور گاؤں بھر کی عورتوں کے سامنے کہا تھا۔ آج وہ خود کو سہاگن سی محسوس کر رہی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس پکے چوکے کی ملکیت میں اُس وقت کوئی دوسرا شریک نہ تھا لیکن اس شہری طرز کے پکے مکان کے سارے کمرے اس کے بہن بھائیوں نے بانٹ لیے تھے اور ماں کے حصے میں برآمدے کا ایک کونا ہی آیا تھا۔ اکیلی جان اُس نے کمرہ لے کر کرنا بھی کیا۔ کمرہ تو انسانوں کی سانجھ کے پردے کے لیے ہوتا ہے۔ ماں کے دل کی سانجھ والا دیا پتہ نہیں کب بجھ گیا تھا، جو سوکن کی پھونکوں میں بھی ٹمٹماتا رہا تھا۔ شاید اس روز بجھا ہو جب اس کی بھاوجوں نے باورچی خانے میں تبدیل ہوئے چوکے کا انتظام خود سنبھال لیا تھا، یا شاید اُس روز جب بھینس کا دودھ، گھی تینوں بھاوجوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ شاید دودھ گھی اور چولہے چوکے کی سانجھ ختم ہو جائے تو دیہاتی عورت کے جسم اور دماغ کی سانجھ بھی ٹوٹ جاتی ہے جس طرح شوہر کی بے وفائی بدن اور روح کی سانجھ توڑ دیا کرتی ہے۔

عارف کے کچھو چڑھا، پڑھا لکھا دیہاتی سائنس اور طب کو معجزوں اور کرامات کا تڑکا لگاتا رہتا...... ماں کا علاج ہونا چاہیے شاید...... یہ علاج شہر میں ہی ممکن ہے لیکن سرکاری رہائش گاہ کے آٹھ اے۔ سی بیڈ روم ایک دوسرے کی گود میں اس طرح چڑھے بیٹھے تھے جیسے سہمے ہوئے بچے ماں کا پلو مضبوطی سے پکڑے ہوں کہ کہیں میلے کی بھیڑ میں گم نہ ہو جائیں۔ یہ نئے ڈیزائن کے گھر اندر ہی اندر پھیلتے ہیں اور باہر کی سمت کم کم کھلتے ہیں۔ باہر سے آنے والے کو اس چور دروازے کے کھلنے کے لیے کھل جا سم سم جیسے کسی منتر کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور پھر اندر علی بابا کے خزانوں جیسی چکا چوند، اب عارف یہ تو اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب آسائشات اچھی پوسٹنگ کی مرہونِ منت ہیں اور اچھی پوسٹنگ اُس

جیسے Base Less شخص کے تصور میں بھی نہیں آ سکتیں یہ سب سیکرٹری کی عنایت ہے۔جس کی بیٹی عاشی ہے،سوکھی ساکھی تنخواہ میں تو وہ اپنے بیڈ روم کا اے۔سی بھی نہیں چلا سکتا چہ جائیکہ تین تین نکھٹو بھائی بہنیں اور بیمار ماں...... پر بیماری کے بھی تو کچھ آداب ہوتے ہیں چاہے وہ لا علاج کیوں نہ ہو۔دیہاتی مریض کی شان تعویذ گنڈے معجون اور مشوروں سے لدے عیادت داروں کی کثرت سے بنتی ہے، جبکہ شہری مریض کا وقار پرائیویٹ کمرہ،نرس کی ٹرے سے دی جانے والی ادویات اور صبح شام ڈاکٹروں کے مہنگے وزٹ بناتے ہیں۔وہ گاڑی ڈرائیور بھجوا کر چھوٹے بھائی کو ہدایت کرتا کہ فلاں لیبارٹری سے ٹیسٹ کروا کر فلاں ڈاکٹر سے مل کر رپورٹس اُسے بھجوا دے لیکن ڈرائیور واپس آ کر بتاتا کہ وہ کسی حکیم سے ہو کر کسی عامل کے پاس گئے تھے اور ٹیسٹوں کی رقم کے متعلق پوچھنے کا اُسے کبھی حوصلہ نہ ہو پاتا،اس معاملے میں وہ عاشی کا شکر گزار رہتا کہ اُس نے روپے پیسے سے متعلق اُس سے کبھی باز پُرس نہ کی تھی۔آخر وہ ایک رچے ہوئے خاندان کی بیٹی تھی ایسی کمینی باتیں اُس کی خاندانی عظمت کے منافی تھیں، جس نے اس کے تینوں بھائیوں کو منگتا سا بنا دیا تھا۔وہ اکثر اپنی ضروریات کی فہرست بنا کر آفس پہنچ جاتے۔ البتہ عارف کو اُنہیں گھر لانے یا خود انہیں گھر آنے کی جرأت کبھی نہ ہوتی تھی۔ایسی کوٹھیوں کے طفیلی بہن بھائی بڑے کمینے اور وارداتیے سے ہو جاتے ہیں۔واردات میں فرق تو طریق کار کا ہی ہوتا ہے جو فعل کو جائز یا ناجائز کی سند دے دیتا ہے اور یہ کیسا طریق کار تھا کہ ابھی اُس نے ڈی ایم جی گروپ کی ملازمت اختیار ہی کی تھی کہ سیکرٹری صاحب کی نظرِ انتخاب اُس پر ٹھہر گئی تھی، جیسے پکا پکایا بنا بنایا تر نوالہ بنانے والے کے ہاتھ سے اُچک کر کوئی دوسرا منہ میں رکھ لے،واردات کا مہذب طریق کار اُسے ڈیل کہتا ہے اور غیر مہذب جرم......لوگوں کی مرچیں نمک پیس پیس کر،اُس کے لیے کتابیں حاصل کرنے والا ہاتھ تو چکی کی دستی پر ہی پڑا رہ گیا اور اُس کی پہلی پہلی کمائی کو سمیٹنے کے ماہرِ اقتصادیات ہاتھ در آمد ہو گئے۔ منڈی کے بیوپاری کو پھل کھانے سے غرض ہوتی ہے۔پیڑ گننے سے تھوڑی، عاشی پھر بھی ایک دو بار ماں کو دیکھنے گئی ضرور، پر بچوں کو گھورتی ہی رہی مت پیو،مت کھاؤ، ڈرائیور سے کہو گاڑی میں سے منرل واٹر کی بوتل نکال دے۔چپس، بسکٹ، چاکلیٹ تو یہ ہینڈ بیگ میں موجود ہی ہیں۔ناک پر بار بار رومال رکھتی بیماری کی مخصوص بُو جراثیموں سے لتھڑی ہوئی ساری فضا، دیہاتی گھر کی کچیلی بوئیں،لسی، چاٹی، کاڑھنی، اُوپلوں، بھینسوں، بکریوں کے بالوں اور تھنوں کی ہواڑ، اُس میں رچی تیل، معجون، اچار، مختلف

پھکیوں کی باس اور سب میں بسی ہوئی لاعلاج بیماری کی بُو، اسی گھر، اسی کوکھ، انہی لوگوں کی سانجھ سے نکلا ہوا اور انہی مختلف بوؤں کا پلا ہوا عارف کتنا صاف صاف اور الگ تھلگ تھا، باقی سب ڈرٹی، سیلن زدہ تعفن مارتے ہوئے جراثیموں سے بھرے ہوئے ڈسٹ بن جیسے۔''

واپسی پر کہیں گاڑی رکوا کر وہ عارف کے ہاتھ منہ ضرور دھلواتی۔

''عرفی جانی! مائنڈ نہ کرنا تمہیں تو پتہ ہے اس ایج میں Infections ہو جاتی ہیں تم آدھ گھنٹہ ان کے ہاتھ پکڑ کر بیٹھے رہے ہو۔'' جراثیم کش صابن سے ہاتھ دھوتا اور اُس کی ہر بات کے جواب میں اثبات میں سَر ہلاتا، گکھ کانوں کی لو میں پڑھ کر دی۔ ایم جی گروپ لے جانے والا انگریزی سکولوں کالجوں کے نالائق فارغ التحصیلوں کے سامنے اتنا، بولا سا ہی رہتا ہے۔ بولتے کھاتے پہنتے نقل اور مشورے کی ایڈ کا منتظر۔ اپنی اچھی چیزوں پر بھی شرمندہ شرمندہ سا کیونکہ وہ اس کے اُس ماضی سے وابستہ ہوتی ہیں، جس کے فاش ہو جانے کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔ وہ کئی دنوں سوچتا رہا، کسی سرونٹ کوارٹر کو ٹھیک ٹھاک کروا کر اے۔سی وغیرہ لگوا دے اور ماں...... لیکن عاشی کی راجدھانی میں کسی خودمختاری کا اعلان غداری کے مترادف ہی تھا، چھوٹی موٹی مراعات تو وہ بے اعتنائی میں ہی دے دیتی تھی، جنہوں نے اُس کی بھاوجوں اور بہنوں کی گفتگو کو کپڑوں، گہنوں کے پیوندوں سے بوجھل کر دیا تھا اور گاؤں کی عورتیں ان بوجھل گفتگوؤں سے انہیں شہری شہری سمجھنے لگی تھیں اور وہ آدھے تیتر آدھے بٹیر کی کھال میں مست ماں کے نام پر آئی مدد کی ٹوہ میں ایک دوسری سے روٹھی روٹھی رہتیں پر اصل مسئلہ تو ماں تھی جس نے اپنے سینچے ہوئے درخت کا کوئی پھل بھی کھانا گوارا نہ کیا تھا اور ڈاکٹر کہتے تھے کہ اب آپ انہیں پالیں جس طرح انہوں نے آپ کو کبھی پالا تھا اور عارف کو لگتا اُنہوں نے بس اُسی کو پالا ہے۔ باقی سب تو اُس کے طفیل پَل گئے ہیں جیسے اب وہ سب ماں کے طفیل پَل رہے ہیں۔ اُن میں سے کبھی کسی کے پاس جوتی نہ ہوتی تھی لیکن وہ ہمیشہ ہوائی چپل پہن کر سکول جاتا اور خود کو اُن لڑکوں سے بہتر محسوس کرتا جو ننگے پَیر چل کر سکول آتے تھے۔ ماں دوسروں کے کھیتوں سے کپاس یا مرچیں چُن کر لوٹتی تو اُس سوئی سے کانٹے نکالنے بیٹھ جاتی جس سے وہ سب کے کپڑوں میں پیوند لگاتی تھی البتہ اُس کی ملیشیے کی وردی میں کبھی پیوند نہ لگے تھے۔ پھٹنے سے پہلے ہی وہ لوگوں کی نون مرچ پیس، لحاف تلائیاں نگند چھ ماہی نئی کا بندوبست کر رکھتی اور اُس کی اُترن چھوٹے پہنتے......سوئی کی موٹی نوک سے تلوے کا سخت ماس کیکر

کی چھال کی طرح تڑختا تو وہ کہتا۔

''ماں میری چپلی پہن جایا کرتو۔''

ماں سوئی کی چوبھ کو نرم گوشت میں گہرا نیچے ڈال کر کانٹے کو اُوپر اُٹھاتی۔

''نہ وڈے، بنے میں پَیر مروڑا کھا جائے۔چپلی ٹوٹ جائے تو کیا تو چار کوس ننگے پَیر چل کر سکول جائے گا، پہلے تو دو جگہ گانڈا لگا ہوا ہے۔''

ساروں کے کپڑے وہ جلے گلے پتوں سے بنے کھار، کے ڈھیلوں کو اُبال کر دھوتی، لیکن اُس کے لیے صابن کا چپکا صندوق میں سنبھال کر رکھتی جیسے سوکن کے آنے سے پہلے اپنی ڈنڈی جھمکی اور تو تیڑیوں کی پوٹلی وہ دانوں والے بھڑولے کی تہ میں دبا کر رکھتی تھی، جو سوکن نے آتے ہی شوہر کے ساتھ ساتھ اپنی تحویل میں لے لیے تھے۔شاید اُسے شوہر سے زیادہ ان گہنوں کے جانے کا دُکھ تھا، اور جب اُس کی پڑھائی کے خاتمے پر اُس روز کے لکھ کانے ختم ہو جاتے تو وہ سرد پڑتی راکھ کو چھڑی سے پھرولتے ہوئے بین کرتی تو اُن گہنوں کا ذکر ضرور ہوتا۔بنیوں کی آواز عارف کی نیند میں ہلکی ہلکی ضربیں لگاتی بین کی لمبی لے کے سوز میں جب کبھی عارف کی آنکھ کھل جاتی تو وہ پوچھتا۔

''ماں وہ گہنے کتنے تولے کے تھے۔''

ماں گلا کھنگار کر راکھ میں تھوکتی ناک سنکوڑتی اور چھڑی مار کر بجھتی چنگاریوں کو راکھ کے اوپر لے آتی۔

''تین تولے دو ماشے دو رَتی۔''

''ماں تجھے تیس تولے بنوا کر دوں گا، تو رو نہیں......''

اُس نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا کر دیا لیکن وہ سارے گہنے اُس کی بہنوں اور بھاجوں کو پسند آ گئے اور ماں موٹے کپڑے کی بُکل میں بچے کان، گلا چھپاتی۔

''لے اب میری نماز پڑھنے کی عمر ہے کہ گہنے پہننے کی......''

ایک روز جب وہ آٹھ کوس کا فاصلہ گانڈوں والی ہوائی چپل میں طے کر کے گھر پہنچا تو سارے بہن بھائی چوکے کے اوٹے کے پیچھے گتا وہ ہوئے پڑے تھے اور ماں دھواں دھنکائے دھیمے دھیمے پُرسوز ہولاروں میں بین کر رہی تھی کہ پڑوسن کے چوکے تک آواز نہ جائے۔پڑوسن نے ثابت ماش کی دال کی

رکابی بھجوائی تھی جو نہ اُس نے خود چکھی نہ بچوں کو دیکھنے دی۔ صندوق میں بند کر چابی پراندے سے باندھ لی تبھی ڈھارے میں سے اُس نے سُنا اُس کا چھوٹا بیٹا بڑی بہن سے کہہ رہا تھا۔

''میں ماں کے بازو قابو کر لیتا ہوں تم پراندے سے چابی کھول لینا۔ ہم لوون لے کر جھنڈوں میں چھپ جائیں گے اور کھالیں گے۔''

یہ سُن کر ٹھنڈی مٹی تپ کر تڑخ گئی۔ کئی ڈھیلے اُن سب کے سَروں پر پھوڑے اور نیچے نیچے سُروں میں چار پہر بین کئے۔

''یہ شکلیں ہیں لون کھانے والی، سکول بھیجو تو اخروٹ اور گیڈیاں کھیلنے کو تر کھانوں کے ڈھارے میں چھپ جاتے ہیں۔ گنوں کا گالا لگانے کو بیلنے پر بھیجو، جو دو پیسیاں ملیں رستے میں ہی کھا مکا کر آتے ہیں...... لون وہ کھائے گا، جس کے ماسٹر نے گھر بلا کر فیس معاف کی جس سے پورے پنڈ کے لڑکے سبق لینے کو آتے ہیں، جس سے نمبردار مالیے کا حساب کرواتا ہے اور چوکیدار رجسٹر لکھواتا ہے۔ سالن وہ کھائے گا جو کل اللہ کے حکم سے پٹواری بنے گا۔''

عارف نے سالن کی پلیٹ صندوق سے نکال کر کہا تھا۔

''ماں ہم سب مل کر کھائیں گے یہ سالن تو بھی کھا، ماں۔''

سارے بہن بھائی صبح کی پکی ہوئی ٹھنڈی کچی روٹیوں کے ساتھ دال پر ٹوٹ پڑے تھے۔ پر ماں نے آنسوؤں کے سالن سے لگا لگا کر روکھی ہی کھائی تھی۔ شاید دال سے لگا ایک نوالہ ان ندیدوں سے بچ کر عارف کو زیادہ مل جائے۔ ماں سارا سال اُن گھروں کی سیروں ہر چیں پیستی، منوں گیہوں صاف کرتی، دیواریں لیپتی، جن کے لڑکے اُس سے ایک جماعت آگے ہوتے تھے۔ اگر عارف کو یہ پرانی کتابیں نہ مل سکتیں تو آج وہ کیا ہوتا، جیسے ہر سال وہ ایک جماعت نہ پاس کرتا تھا۔ بلکہ یہ کوئی بھاری پتھر تھا جسے سر باندھے، پانچے چڑھائے پسینوں پسین ماں سال بھر کی اوگھٹ مینڈھ سے دھکے لگا لگا ٹاپاتی تھی۔

جب وہ افسر ہو گیا تو جن گھروں کی پرانی کتابوں کے بدلے ماں نے اُن گھروں کی گویا سیپ لے رکھی تھی۔ کیونکہ کسی گھر سے دو کتابیں ملتیں کسی سے تین کسی سے آدھی خالی کاپیاں، کسی سے پنسلیں دواتیں، ان گھروں کی عورتیں اُس کے پاس سفارش لے کر آتیں۔ میٹرک، ایف اے فیل لڑکوں کی

نوکری کے لیے جن کی اُن پڑھی کتابیں عارف نے پوری پوری پڑھی تھیں تو ماں اُنہیں چار پائی کے سرہانے بٹھاتی اور خود پائنتی بیٹھتی اور اُن کی ہر بات کے جواب میں ''اچھا جی'' کہتی، کیونکہ اُس کے سر پر اُن کا بڑا احسان لدا تھا۔ اگر وہ اُسے کتابیں نہ دیتیں تو اور اگر وہ اُن کے کام سال بھر نہ کرتی تو...... پر یہ خیال تو اُسے کبھی آیا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہی کہتی ''عارفے! لڑکے کا خیال کر لینا بڑا احسان ہے ان کا ہماری جان پر، تو کیسے افسر بنتا اگر وہ..''

اب یہی عورتیں اس کی چار پائی کے گرد بیٹھ کر اظہار افسوس کرتیں، پھر عبرت پکڑتیں کانوں کی لَویں چھوتیں اور پھر ہونٹوں پر آئی مضحک مسکراہٹ چھپائے ایک دوسرے کو ٹہلے دیتیں۔

''دیکھو تو اللہ بخش...... ساری عمر دوسروں کو ستایا، رلایا، بے زبانوں پر ظلم کیا لیکن موت کیسی سوہنی آئی، چائے کا پیالہ سامنے رکھا ایک گھونٹ بھرا دوسرے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہیں سو گیا جیسے۔''

''شیداں کی ساس کو دیکھ سارا پنڈ جانتا ہے، بہو کو اپنے ہاتھوں کھو دیا، پر موت قلندروں جیسی آئی۔ رات سوئی صبح اُٹھنے کا حکم نہ ہوا۔ میداں کی سُن کنجری مشہور تھی۔ سارے پنڈ میں، لے چڑا ہاتھ میں توے پر روٹی ڈالنی نصیب نہ ہوئی۔ پیر نیوں جیسی موت ملی اور دن بھی جمعرات کا اور مہینہ رمضان کا اور منہ میں روزہ جو شاید حیاتی میں پہلا ہی رکھا تھا۔''

''آہ آہ واہ واہ..... ایک یہ بیچاری حیاتی بھی بھوگی اور اخیر ویلا بھی بھوگ مرے گی۔ بس اللہ کی اللہ ہی جانے۔''

اُس کی بھابیاں اِک دوجی کے چٹکیاں بھرتیں، چہروں کی جلد کی اندرونی تہہ مسکراتی، جس سے بیرونی سطح پر چمک سی لہراتی۔

''ماں پہچانو تو بھلا کون آیا ہے۔''

ماں کا کندھا جھلاتیں، تضحیک اعضاء کی زبان ہو جاتی۔

سکڑے ہوئے دماغ کی تاریک بھلیوں میں اُڑتی ہوئی راکھ بینائی کے غار کو دھندلا چکی تھی۔ ساری چیزیں پوری کائنات، سب انسان، بے شناخت اجنبیت کے کہرے میں اٹے ہوئے، سارے ربط، رشتے، تعلق سب لاتعلق، بے تاثر چہرے پر بیزاری عود آتی۔

''ماں یہ عارف بھائی جان ہیں۔ آپ کا لاڈلا بیٹا۔''

''بھابیوں کی تمسخرانہ مسکراہٹ اور آنکھوں کی زبان اِک دوسری سے خفیہ اشارے کرتی، وہی انتقامی آسودگی والے اشارے، جو حاکم کے محکوم ہونے پر، دانش ور کے دیوانہ ہونے پر، امیر کے غریب ہونے پر اور صحت مند کے قریب المرگ ہونے پر اُن کے متعلقین ایک دوسرے کو کیا کرتے ہیں۔

''جسے دوسروں سے چھپا کر کھلایا اور جسے نا کی لگا کپڑا کبھی نہ پہنایا، وہی آپ کا افسر بیٹا اُسے بھی نہیں پہچانتی کیا...... جس کی افسری کی دیگ تلے دوسرے ساروں کو پکی لکڑیوں کی طرح جھونک دیا چولہے میں.....''

عورتیں ان اشاروں کو دُکھ اور عبرت کے خمیر میں گوندھ دیتیں۔

''بیچاری کو کیا پتہ، آنکھوں میں نور ہے، پر دید نہیں، کانوں میں ساز ہے، پر سُر نہیں، وہ اس جہان میں تھوڑی ہے، بس ماس ہی گلنے کو رہ گیا ہے۔ روح تو کہیں اُڈاری مار گئی ہے۔''

''اللہ معافی اللہ توبہ۔''

عورتیں زمین پر شہادت کی اُنگلیاں رگڑ کر کانوں کی لَویں پکڑتیں، ماں چارپائی پر بچھے کھیس کو کھینچتی کُریدتی بان کے ریشے توڑتی، اُنہیں گرہیں دیتی پھر کھولتی، قمیص کے گھیرے کو باندھ دیتی، پھر کھولتی پھر باندھتی جیسے ہر شے کو کھوجتی کھودتی کچھ کھویا ہوا ڈھونڈتی ہو۔ کچھ بکھرا ہوا سمیٹتی ہو۔ ہر شے کی کھال کھود، اندر سے کچھ نکالتی ہو...... شاید کہیں ریت کے ڈھیر میں گم ہوا کوئی موتی جیسے، اُٹھنے کی کوشش کرتی، اُٹھ نہ سکتی، زور لگانے سے بول پیشاب نکل جاتا، اس کی بھابیاں اور ان کی بھابیاں منہ میں پلو دے دبا ہنسی روکتیں، کانوں کو ہاتھ لگا عبرت پکڑتیں۔

''اللہ معافی کبھی محتاج نہ کرنا، کریں سریں اُٹھانا اس گندی دنیا سے۔ درود پھونکو، یٰسین پڑھو، پر لگتا ہے فرشتے سُن کر واپس چلے جاتے ہیں۔''

''ہمیں تو بڈھا بچہ پالنا پڑ گیا، بڈھے کا گو مُوت کرنا بڑا اوکھا، اللہ معافی دے۔''

بیان بڑھتے چلے جاتے۔ اُس نے تو ماں کو ہمیشہ دوسروں کے لحاف نگندتے، کانے کی باریک تیلیوں پہ لپیٹ دھنکی ہوئی روئی کی پونیاں بناتے، چرخے کی مال پر پونی سے پونی جوڑ سُوت کاتتے ہوئے دیکھا...... یوں بے کار کچھ کھوجتے ڈھونڈتے، کسی اَن دیکھی تلاش کا محتاج کبھی نہ دیکھا اور جن کی وہ محتاج تھی وہ اردگرد بیٹھے جیسے تماشے کے تماشائی، گرہیں کھولتے کپڑا سیدھا کرتے منہ چھپا چھپا ہنستے۔

''اس گنڈ میں اس پوٹلی میں سے کیا ڈھونڈتی ہے ماں۔ بالکل خالی، تیری طرح، بس کھوکھا، کیا گم ہوا ہے تیرا جس کی تلاش تجھے چین نہیں لینے دیتی۔ گھوگو بج رہا ہے۔ پر جان نہیں نکلتی۔''

یہ سب ہنسنے والے کبھی اُسی کے تو محتاج تھے۔ پر اُس نے تو کسی کو محتاجگی کا کبھی طعنہ نہ دیا۔ سب کو پالا پر کسی کی ہیئت کذائی کا مذاق نہ اُڑایا۔ پالنے پالنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، جو پلتا ہے اُسے پالنا بھی آنا چاہیے، کیا صرف ماں کو ہی پالنے کا فن آتا ہے اور ماں نے تو شاید بس اسی کو پالا تھا اور ڈاکٹر کہتے تھے اب آپ انہیں پالیں جیسے انہوں نے کبھی آپ کو پالا تھا۔ اب ماں کا پالنا یہی ہے کہ اسے ان سب نظروں سے اوجھل کر دیا جائے۔ ایک ایسی حالت انسان پر آجاتی ہے کہ انسانوں کی نگاہوں سے اُس کا چھپ جانا ضروری ہو جاتا ہے یا دھرتی اوڑھ کر یا پھر دُور کہیں کسی ہسپتال میں انجان ڈاکٹر اور نرسیں اپنے پیشہ وارانہ فرائض سے جڑے ہوئے قطع نظر مریض کی شناخت کے...... جہاں عزیزوں سے ملنے کے اوقات بڑے محدود ہوں، بس پھول چھوڑ کر واپس نکل آئیں اور اجازت بھی بڑے قریبی کو ہی ملے، پرائیویٹ کمرے اور اُونچے بیڈ پر لیٹا ہوا مریض کتنا معتبر لگنے لگتا ہے۔ مریض کی طرف نظر تھوڑی جاتی ہے۔ کمرے کی کشادگی نرس کی ٹرے، ڈاکٹروں کے وزٹ، دروازے پہ لگا اوقات کا چارٹ اور گراں چارجز، مریض کی ہر کوتاہی کا پردہ ہو جاتے ہیں۔ یکدم عارف پر کوئی جذباتی سا لمحہ وارد ہوا، اُس نے ماں کی ہڈیوں کی مٹھ کو کلاوے میں بھرا اور گاڑی کی سیٹ پر ڈال دیا، سارے بہن بھائی رشتہ دار، ساکت کھڑے رہ گئے، افسر بھائی سے کچھ پوچھنے کی ہمت کسی کو نہ تھی، افسری اور کفالت کا رُعب سب کو گنگ کر گیا تھا۔ سیکرٹری کی بٹی سول لائن کے ملازم، سرکاری رہائش گاہ کے اِک دوسرے سے جڑے ہوئے کمرے جن کی قربت میں منتقل ہونے والے جراثیموں کا خطرہ، کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔ بس ماں تھی...... بیٹا تھا اور مغرب کی اذان کی آواز کے ساتھ اوکاں کے کھکھل سے پھڑ پھڑا، پھڑ پھڑا نکلتی ہوئی چمگادڑیں سروں کے اُوپر اُوپر نیچی پرواز بھرتی، شاخوں سے اُلٹی لٹکتی ہوئیں۔

گاڑی گاؤں کے گرد بہتے کھال کے ساتھ ساتھ پختہ سڑک پر چلنے لگی، جس کے کنارے سرکنڈوں کے جھاڑ، کریوں کی جھاڑیاں، ساون کا پانی پی پی خوب شاداب ہوئی کنڈیاریاں لالو لال تھیں، جن کے ڈیلے اور جنگلی پھل توڑ کر ماں اچار ڈالتی اور ہانڈی پکاتی، نمک مرچ ڈال پانی میں گھلا ملا لیتی، تیل گھی کہاں جڑتا تھا، انہی سرکنڈوں کے جھاڑوں میں سے خشک کانے اور سروٹے کھود کر ماں

روشنی کرتی اور عارف کتابیں پڑھتا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے میلوں مسافتوں کے کھیت پھیلے تھے، جن پر ہری بھری فصلوں کے ہلکے، گہرے شیڈز کی جیسے رلی بچھی ہو، جن کی مینڈھوں سے ادھیارے کی گائے کیلئے وہ گھاس کھودتی تھی۔ پھٹی چنتی اور مرچیں توڑتی تھی۔ کھال کے ساتھ وہ کچی ہٹی بھی تھی۔ جہاں پھٹی اور مرچوں کے عوض وہ اُس کے لیے پن، پینسل اور سیاہی لیتی تھی۔ درختوں تلے بندھے جانوروں کے پیچھے پیچھے اب گھروں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ کچے پکے گھر، جن کی چھتیں لیپ کر وہ بدلے میں اُس کے لیے کتابیں لیتی تھی۔ وہ تنور بھی جہاں سے روٹی لگوانے کی اُسے کبھی توفیق نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ دائی چھ روٹیوں کا ایک پیڑا، بھاڑا لیتی تھی۔ تنور کے اُونچے چبوترے پر بیٹھی عورتیں ایک ایک آنکھ میچ کر گاڑی کو دیکھنے لگیں، میل خوری بکلوں میں کریری جمے دانتوں کی ہوا نکلی۔

''کیا شان سے مرنے جا رہی ہے۔ ساری حیاتی بس پہ چڑھنا نصیب نہ ہوا اور اب کاروں کے ہُوٹے۔'' گاڑی آگے بڑھتی گئی۔ سب کچھ اجنبیت کی لوئی میں لپٹتا چلا گیا کہیں کسی شناخت کی کوئی چنگاری نہ چٹکی تھی۔ دُور کھڑے حالی ٹریکٹر روک سرکاری گاڑی کی دہشت میں ساکت تھے۔ موتیا رنگ پھولوں سے بھری کپاس کے ہرے کچ کھیت، نسواری بال لٹکائے بھٹے، مینڈھوں پر باڑ بنائے کھڑے تل، سونف کے پودوں کی قطاریں بیچ بیچ انگوری رنگ دھان کے قطعات اور سبزیوں کی واڑیاں، پرے ہرنولیوں کے بوٹے اور سہاگہ پھرے سرمئی کھیت، مناظر گزرتے رہے۔ پچھلی سیٹ کے بند شیشے سے سَر ٹکائے ہوئے، پالا کھائے زرد پتے کے سے چڑ مڑ، ماں کے چہرے میں ہر پہچان منجمد تھی۔ اب گاؤں کے قلب میں سے تلوار کی مانند بلند ہوتا ہوا وہ پکا چوبارہ اُبھرا جس کی گیرو رنگ اینٹوں کی دیوار کے ساتھ ڈب کے اُونچے پودے اُگے تھے، جنہیں وہ مشعلیں بولتے تھے اور اندھیرے گھر میں اُجالا کرنے کے لیے ان کے گداز سِٹوں کو آگ لگا کر ڈانڈے زمین میں گاڑ دیا کرتے تھے، جن کی راکھ کے برادوں میں تارے جھلملاتے رہتے تھے۔ راکھ کے ان ڈھیروں پر بیٹھ کر ماں بین کیا کرتی تھی۔ جب کوئی نہ جاگتا تھا، حتیٰ کہ عارف بھی سو جاتا تھا۔ بس راکھ کا جھلملاتا ہوا ڈھیر اور اُس پر روتی ہوئی ماں۔ اُس وقت وہ چھینے ہوئے زیوروں کو بھی نہ روتی، بھوکے بچوں کی بھوک کو بھی نہ تڑپتی، سوکن کی کمینگی کو بھی نہ کوستی، وہ بس شوہر کی بے وفائی کو روتی اور جدائی کے زخم چاٹتی، گیروے چوبارے کا منظر قریب آتا چلا گیا، اب ٹھہری ہوئی سلیٹی پتلیوں کی راکھ میں ڈب کے جلے سِٹوں کی سی کوئی چنگاری جھلملائی اور پکے چوبارے

کی سرخ اینٹوں سے جیسے گلے مل گئی۔

اُس وقت ماں تھی۔ عارف تھا اور دونوں کے بیچ وہ پکا چوبارہ، جس میں گیس کے ہنڈے جلتے تھے اور ماں کا شوہر اور سوکن کے بچے آرام دہ گدیلوں پر سوتے تھے، جس کی اُونچی ممٹی کو دیکھ دیکھ ماں آنسوؤں کے لکھ کانے جلاتی تھی، جن کی لَو میں وہ حرف حرف چنتا تھا اور ماں بوند بوند پگھلتی تھی۔ اُس کی ہرے نمبر پلیٹ والی گاڑی کے قریب کسی بچے، کسی بڑے کو پھٹکنے کی جرأت نہ تھی جس طرح اُسے گاڑی بڑھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔ کیونکہ سلیٹی پتلیاں چوبارے والے مکان کی سرخ اینٹوں سے چپکی رہ گئی تھیں۔ درمیانی فاصلے پر کوئی تارسا جڑا تھا جس پر کوئی تارا سا جھلملاتا تھا جو کسی بازی گر کی طرح جست بھرتا تھا، یہ جست شاید بے شناخت پتلیوں میں شناخت کے کسی لمحے کی تھی جو تڑ مڑ راکھ میں دبا ڈِب کی چنگاری کی طرح کہیں پڑا رہ گیا تھا۔ اور جونور کے چھپاکے کی مانند لپک کر اُس لال چوبارے کی سرکنڈوں سے ڈھکی دیوار کو پھاند گیا تھا۔ عارف دیمک کھائے مٹی ہوتے کھکھل کو سنبھالتا رہ گیا۔

زُلیخا

گناہ کے احساس نے اُسے گوندھ کر توں سی جمادی جو خمیر مارتے مارتے کنالی کے کناروں سے بہہ نکلا۔ ڈاکٹر سرفراز حسین نے چشمہ ناک کی نوک پر اور کہنیاں میز کی سطح پر ٹکا کر اُسے تنقیدی نگاہوں سے جانچا تھا۔

''مسز سبحان! آپ اپنے معالج سے وہ سب کچھ کہہ ڈالیئے جو اندر کہیں کچرے کی مانند جمع ہو کر بُو مار رہا ہے۔ اس کی نشاندہی ضروری ہے جیسے پلمبر......''

لیکن نہ تو ڈارک رُوم کے دَر کھلے اور نہ ہی کاٹھ کے کھٹکھل میں جنبش ہوئی وہ اس بُو مارتے کچرے کے ڈھیر کو کنڈلی مارے چھپائے بیٹھی رہی۔ ذرا سی بلی نہیں کہ اندر کہیں پھیلتا خمیر کنالی کے کناروں سے پھڑ پھڑ بہہ نکلے گا۔ سارے گھر، سارے اڑوس پڑوس، سارے شہر میں بساندیں مارتا اور اُبھرتا ہوا۔

پتہ نہیں گناہ کی طلب اُسے نڈھال کیئے جاتی تھی کہ بیماری کی پیچیدگی نفسیاتی و دماغی عوارض کے معالج کے پاس لے آئی تھی۔

بیماری اور گناہ کتنی یکساں خصوصیات رکھتے ہیں دونوں۔ پتہ نہیں کب اور کس وقت اپنے اظہار کو کس کا انتخاب کر لیں۔ دونوں کو خمیر لگا ہے جسے وقت اُبھار دیتا ہے اور پوشیدگی کے کناروں سے بہاہر

ایک کو باخبر کر دیتا ہے۔

پتہ نہیں یہ بیماری ہے کہ گناہ کہ جب وہ اُس کے قریب سے گزرتا ہے تو کسی بیماری جیسا کسی گناہ کی طرح اَندر ہی اَندر پھیلتا زہرناب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آنکھ کی پتلی میں سمٹتا ہوا نگارخانہ جیسے، کسی فلم کا ہیرو جس کے گلیمر کو جان لیوا بنانے کو کیمرہ اُس کے وجود کی ہوشربا جزئیات فوکس کرتا چلا جاتا ہے۔ کبھی سلوموشن کبھی فاسٹ موشن، کبھی زون اَپ کبھی کلوز اَپ، پتلی ٹوہ والے سفید اور سلیٹی جوگرز دل کی ساخت میں بندھے تسموں کے پھندنے جیسے اُبھری ہوئی سرمئی نسیں جن میں لبریز لُہو دھڑ دھڑ دوڑتا ہو۔ ہلکے سلیٹی پتلون کی اکڑی ہوئی کریزیں جو بتدریج تناسب میں ڈھلتی رانوں کی ساخت پر منڈھتی ہوئی ٹماٹر رنگ شرٹ میں ضم ہو جاتیں۔ شرٹ کے ہم رنگ گردن کے پُرغرور مسل پسینے کے شفاف قطروں میں تھرتھراتے، تاب دیتے ہوئے کالر سے اُوپر ترشے ہوئے بال پسینے کا بھیگاؤ جنہیں اتنا سیاہ اتنا ملائم کر دیتا تھا کہ نگاہ پھسلتی گردن سینہ جسم، قد تکمیلیت اور جوانی اس شدت سے اُمڈ کر ہر جا غالب آ گئی تھی کہ اس سے زیادہ کا تصور خیال کے پریشر ککر کو بھک سے اُڑا دے اور پتلی کے کیمرے کا لینز پگھل جائے جوانی اور حُسن، مضبوطی اور تناؤ، نتیجتاً تفاخر، سب نے Display ہونے کو شاید یہی شوکیس چنا تھا۔

آنکھ کا کیمرہ قہقہے لگاتی اور تمسخر اُڑاتے اُڑاتے انتہائی سنجیدہ ہو جانے والی آنکھوں پر فوکس ہوتا تو وہاں تمسخر اور سنجیدگی کی وہی آمیزش ہوتی جو کسی عورت کے لیے کسی مرد کے چہرے پر اُس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ اُس کی پہنچ سے بہت اُوپر ہوتی ہے یا معیار سے بہت نیچے اور یہاں دونوں ہی کیفیات ہم آمیز تھیں...... وہ اُس کی پہنچ سے بہت اُوپر بھی تھی اور معیار سے بہت نیچے بھی۔

اور یہ ساری جزئیات اس حساس کیمرے میں بس اُس ایک لمحے میں رول در رول محفوظ ہو جاتیں جب آمنے سامنے سے آتے جاتے ہوئے وہ اُس کے قریب سے گزر جاتا اور قالب میں بھری ہر ہر شئے نوچ اُکھاڑ پھینکتا اُڑاتا ہمراہ لے جاتا اور اس خالی خولی وجود میں کچھ پھیلتا اور بڑھتا گناہ جیسا لذیذ اور بیماری جیسا اذیت ناک...... جیسے پُرانے زمانے میں چڑیلیں ہاتھ مار کر وجود کا بھرتا نکال لے جاتیں اور سینے پر دل والی جگہ پنجے کا نشان چھوڑ جاتی تھیں۔ اس وقت اسے محسوس ہوتا اَندر کہیں خمیر لگا ہے جو اُبھر گیا ہے اور اس خمیر زدہ تون کو وہ کنالی میں سمیٹتے سمیٹتے ہانپنے لگتی، قدم اپنے ہی وجود کے بار تلے سے پھسل جاتے۔ کل ایسے ہی لمحے میں مسز عاطف سامنے سے آ گئی تھیں اور کہا تھا۔

''مسز سبحان آپ کو اپنا بی پی چیک کروانا چاہیے۔ آپ کے چہرے کی رنگت چقندر کی سی ہو رہی ہے اور اعضاء کے سرے کملائے پتوں کی طرح مُڑ رہے ہیں۔''

اُسے لگا کہ دراصل یہ وہی خمیر ہے جو اُس کے منہ کے رَستے نتھنوں، کانوں اور آنکھوں کی پتلیوں سے بہہ نکلا ہے اور پھر وہ یوسف پھر سامنے آ گیا۔ آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حُسن۔

حسنِ صنفِ نازک تو بس شاعرانہ اصطلاح ہے۔ دراصل تو حُسن کا بیشتر حصہ حُسنِ یوسف کو عطا ہے۔ نگاہ پڑتی ہے تو پور پور کٹ جاتی ہے۔ کاٹھ قالب میں بھرا سب کچھ جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے اور...... اندر کہیں بہت دُور تک اور بہت وُسعتوں میں اور بہت باریکیوں میں، اور بہت پرتوں میں کچھ سرسراجاتا ہے۔ گناہ کی لذت جیسا بیماری کی اذیت جیسا۔

آٹھ برس تک سبحان جیسے اچھے شوہر کی شراکتوں میں برابر حصہ دار رہنے کے باوجود اس کے اندر اَبھی ایسا کُچھ موجود تھا کہ کوئی پلکوں کی باڑ سے اُکھاڑ لے جائے اور اس خالی قالب میں کُچھ اجنبی سا اُنڈیل دے۔ سات، پانچ اور تین سال کے اِن تین بچوں کو جنم دینے کے باوجود کیا اُس نے اُبھی ایسا کچھ سنبھال رکھا تھا کہ کوئی توازن وتناسب کے تیر سے اُچک لے جائے۔ کچھ چھیننے اور اُچکنے کے لیے ایسا کچھ بے لمس کیوں رہ گیا تھا۔ جب کہ لمسیات کے عمل سے وہ بارہا گزر چکی تھی۔ کیا مادی اور ظاہری لمس کسی غیر مرئی لمس کے لیے ایسے ہی جگہ چھوڑ دیتا ہے جیسے رُوح کے لیے یہ بھراپُرا قالب اور کیا یہ سب کچھ اُس وقت اُس کے اُندر موجود نہ تھا۔ جب اس شہرِ حُسن کے بند دریچوں پر کیسے کیسے دستکیں دینے والے نہ لوٹ گئے تھے۔ پر کوئی جھری تک نہ بنی تھی۔ کیا یہ زعمِ حُسن تھا کہ وہ ناصر جو پانچ برس تک دریا کنارے راتوں کو جاگتا اور اُسے نظموں میں پروتا رہا تھا اور جب وہ سبحان کی ہوگئی تو وہ پانیوں میں بسیرا کر گیا اور اُس نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا۔ خودکشی کرنے والے کبھی نارمل نہیں ہوا کرتے۔ ایک دیوانے کی دیوانگی میں بھلا کسی کا کیا قصور...... اور خود سبحان جو پچھلے آٹھ برس سے آدھوں آدھ کا شریک ہے وہ اُس ''کچھ'' تک کیوں رسائی نہ پا سکا جو ''یہ'' اک نگاہ میں اُچک لے جاتا ہے۔ ہر روز اور ہر بار...... نگاہ کے ہر ہر لمس سے...... پنڈلیوں میں ٹھنسی ہوئی ہموار سلاخیں، جن کے جوڑ ہاف سلیو شرٹ سے نکلتے بازوؤں میں کسے تھے۔ ہاتھ میں پکڑے ٹینس ریکٹ کی طرح اکڑی ہوئی گردن، ٹینس کورٹ کا نیٹ بھی جسے جھک کر سلام کرتا ہو۔ کلب کے ہر ہر ویٹر کی طرح...... ریکٹ کے تنے ہوئے سینے سے ٹکرا

کرشاں شاں ہانپتی ہوئی ٹینس بال جیسے کسی عورت کا لرزتا ہوا دل کس بے دردی سے ضرب کھاتی نیٹ کے آر پار منہ کے بل گرتی اور پھر بھی مار کھانے کو سلامت رہتی...... کاش یہ لڑکا آٹھ برس پہلے اُس سے ملا ہوتا۔ کاش وہ عمر کی دہلیز سے آٹھ برس نیچے پھسل جائے۔ یہ خواہش بھی موذی بیماری یا گناہ جیسی تھی جو بار بار اُبھرتی۔ جب بھی نگاہ کسی لمس سے مس ہوتی۔ چاہے وہ سینے کے بٹنوں بیچ گل رنگ بٹن کا ہم رنگ دھاگہ ہی ہو یا پتلون کی پاکٹ میں اُبھرا ہوا بٹوہ یا مضبوط قدموں کے لمبے ڈگ جن کے بیچ آیا سب کچھ پس جاتا ہے۔ اُسے بچپن کا وہ کھیل یاد آ جاتا جب وہ سب بچے خشک میوہ جات کے خالی چھلکوں کو پاؤں تلے روندروند اُنہیں توڑنے اور پیسنے کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔

اُس روز جب مغرب کی تاریکی اُن روشنیوں کو دُھندلا رہی تھی جو واکنگ ٹریک کے دونوں اطراف گڑھے کھمبوں کے سروں پر جھلملاتی تھیں اور نیچے لگے پتنگوں کے ڈھیر ہر چکر میں پہلے سے دُگنے ہو جاتے تھے۔ باغ کی بھیگی فضا میں جن کے جسموں کی بُو گلاب اور چنبیلی کی مہک کو کبابی بناتی تھی اور وہ برگد کی لٹکتی جڑوں کے ساتھ ساتھ بندھی چلی جاتی تھی۔ جب وہ چوڑی ہتھیلیوں کے سے پام کے پتوں کو وجود کے ریلے سے پایاب کرتا ہوا گزرا تھا اور توسی لبوں سے برگ گُل پر قطرہ سا ٹپکا تھا۔

''سمارٹی''

اُس نے ہڑبڑا کر پیچھے دیکھا تھا یقیناً اس شبنمی قطرے کا ہدف وہ لڑکی ہوگی جس کے بدن کی گلابیت مہین سفید کُرتے سے یوں چھلکتی ہے جیسے گلابی قمقمے پر دُودھیا فانوس جڑا ہو جس کے شباب کا اکڑاؤ ہر قوس ہر خم میں کس قدر متناسب تراش اور مقدار سے پُر غرور ہو گھورتا ہے کہ ہدف چاروں شانے چت ہو جائے۔ اور جسے دیکھ کر اُس نے سوچا تھا۔ یہ لڑکی اُس کا کتنا مناسب جوڑ ہے۔ توازن کا، تناسب کا، شباب کا، حُسن کا، عمر کا...... دونوں پازیٹو یا دونوں نیگیٹو تار پر یہ تو بس سپارک ہی دیتے ہیں۔ کرنٹ تو پازیٹو نیگیٹو کا ملاپ پیدا کرتا ہے لیکن وہ تو اُس جگہ موجود ہی نہ تھی اور اُس کی خالی جگہ پر وہی تھا جس کی نگاہوں میں تفاخر تھا، تمسخر تھا اور شاید اوباشی بھی، خمیر لگا اُبھارہ پھٹر پھٹر اُبھرا جب کوئی نوجوان اپنے سے بڑی عمر کی عورت کو کسی اور نگاہ سے دیکھتا ہے تو پھر اس نگاہ کے پیچھے بھی کچھ اور ہوتا ہے۔ شاید وہ جانتا ہے کہ وہ سبحان جیسے سرمایہ دار کی بیوی ہے وہ اُس سے ہتھیانا چاہتا ہے۔ بہت کچھ جو قیمتی اور مادی ہے۔ وہ شہر میں بڑھک مار سکتا ہے۔ شیخ سبحان کی حسین بیوی اُس پر عاشق ہوگئی ہے یقیناً

یقیناً یہی سب ہے اور اُسے محتاط رہنے کی از حد ضرورت ہے اور پھر اُسی لمحے وہ نگاہوں میں پھر تر از و ہو گیا وہ جس کے بوٹ کی ٹوہ بھی لاکھوں کروڑوں میں خلط نہ ہوتی تھی جوتی ہوئی سڈول گردن گھماتا ہے تو سارے درخت، پودے، کیاری، پھلواری، فوارے، روشنیاں پھریری سی لیتے ہیں۔ جو کسی تخریب کار کی طرح بسی ہوئی بستیاں تحس نحس کر دینے کا پورا ادہیکار رکھتا ہے آخر اُسے یوں کھلے بندوں پھرنے کا حق کیوں دیا گیا اور جس کے لبوں کی محرابی قوس سے تمسخرانہ انداز میں پھسلتا ہے۔'' سمارٹی''

جیسے لفظ نہ ہو تیز دھار چھریوں کا گچھا خول سے نکلا ہو اور بوٹی بوٹی پر برس گیا ہو پور پور لہولہان ہو جاتی ہے۔ پھر اگلے روز پھر اُس سے اگلے روز اور پھر ہر روز وہ اُسے دیکھتا ہے۔ زمردیں خط والی پوری گردن گھما کر دیکھتا ہے سبزۂ خط سے جھلکتی سنہری جلد لو دیتی ہے وہ اس کے دیکھنے کو دیکھنا چاہتی ہے لیکن اس کا دیکھنا تو سارا شہر دیکھے گا۔

'' چھی، چھی، چھی۔ مسز سبحان ایک نوجوان کو تاکتی ہے۔ زُلیخا سبحان جو مرسڈیز میں سوار ہو کر آتی ہے جس کے تین بچے آٹھ ایکڑ کے محل کے سوئمنگ پول میں نہاتے ہیں اور ٹینس کورٹ میں کھیلتے ہیں جو ہر سال شیخ سبحان کے ہمراہ چھٹیاں گزارنے فارن جاتی ہے وہی مسز سبحان ٹینس کے ایک خوبصورت کھلاڑی کو تاکتی ہے جو اُس سے عمر میں چھوٹا ہے...... وہ خود بھی تو شیخ سبحان سے بارہ برس چھوٹی ہے۔ بارہ برس کا معمولی سا فرق کبھی کسی نگاہ میں اُنکا بھی نہیں اور آٹھ برس کی وسیع خلیج پاٹنا کسی نگاہ کی جست میں ممکن ہی نہیں۔

یہ بیوی بھی کتنی بے رنگ کتنی بے ساخت شئے ہے۔ محلول کی طرح ہر اُس برتن میں ڈھل جاتی ہے جس میں اُنڈیل دی جائے دوگنی چوگنی عمر کے مرد کی ہم راز ہم مزاج ہو جاتی ہے۔ ایک جست میں سارے زمانی فاصلے پھلانگ ہمراہ ہو لیتی ہے اور یہ شوہر کتنا ساختہ پرداختہ پتھر سا کہ چند سال پہلے پیدا ہونے والی عورت کے حاشیے میں فٹ نہیں آتا عمریں لد جاتی ہیں اپنے ہی رکاب میں پاؤں پھنسائے اڑا رہتا ہے۔ مَیں، مَیں پوری شناخت، پورے نام پوری موروثیت کے ہمراہ، تم تم آدھی شناخت، آدھے نام، آدھی مورثیت کی محتاج۔ تکمیل کے اس عملی معاہدے کی رو سے زُلیخا سبحان اس گناہ یا بیماری جیسی خیانت کا کوئی حق محفوظ نہیں رکھتی۔ اگر زلیخا سبحان آدھی شناخت آدھے نام اور آدھی موروثیت ترک کر دے تو پھر وہ زُلیخا ہے۔ اس صورت میں تو وہ اُس دیکھنی کو دیکھ سکتی ہے کہ وہ کس انداز سے اُس پر

پڑتی ہے۔ پھر وہ تکمیل کے لیے اس دیکھنی کی محتاج ہو گی اور پھر وہ ڈلے نہ ڈلے اور پھر خودکشی کر لینے والے تو پیدائشی دیوانے ہوتے ہیں۔ اس میں کسی کا کیا قصور اور یہ گناہ یا بیماری بھی کب اور کس وقت کس کا انتخاب کرلے اس میں بھی کسی کا کیا قصور۔

اُس روز جب وہ خوبصورت لڑکی گلابوں کے کنج سے نکل کر اُس کے سامنے آئی تھی جس کے تناسب کا جوڑ اُس یوسف سے ایسے ہی تھا جیسے قالب کا ناپ سے تو اُس نے خوبصورت چہرے کو ہاتھ میں پکڑے ریکٹ کے تنے ہوئے جال کی طرح طنز کے فریم میں کس کر کہا تھا۔

''آنٹی ہے تو سمارٹ''

ذرا ذرا کیاریوں میں تنکا تنکا اُگی پنیری میں دھنسی اُس کی نگاہیں بچ کر لڑکی کے چہرے سے چپک گئیں جس کی نگاہ کا ہدف وہ یوسف تھا جسے دیکھنے کا وہ پورا حق رکھتی تھی کہ اس حق میں مزاحم کوئی شراکت نہ تھی...... پر وہ اُسے دیکھتا تھا جسے دیکھنے کے حق میں مزاحم شراکت بڑی کڑی تھی اور اُس وقت لبوں کی محراب سے سیٹی سی بجی تھی۔

''سمارٹی''

آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حُسن، وہ پور پور کٹ گئی۔

اس طبقے کا عجب دستور ہے۔ عورت یا فرینڈ ہے۔ بھابھی ہے یا پھر آنٹی۔ درمیانی تمام زینے نجانے کس مصلحت کے تحت کھسکا دیئے گئے ہیں۔ وہ شوہر کے کولیگز کی، پارٹنرز کی بھابھی ہے اور اُن کی سب اولادوں کی آنٹی فرق چاہے یہی دو چار سال کا ہو یا سرے سے ہو ہی نہ...... تو پھر دستور کے مطابق وہ اُس کی بھی آنٹی ہے۔

اُس روز چائنیز ہال کے یخ اور گف قالین کے سینے میں کچھ دلتا مسلتا ہوا وہ بغلی ٹیبل پہ آن بیٹھا تھا اور وہ سُوپ میں اتنی سپائسز ڈالتی چلی گئی تھی کہ سبحان نے ویٹر کو پیالہ اُٹھا لے جانے اور نیا پیالہ لا کر رکھنے کا اشارہ کیا تھا اور وہ خالی پیالہ چھوڑ کر جب واش رُوم کو پلٹی تھی تو لبوں کی محراب سے فوگ سا اُبھرا تھا۔ ''سمارٹی''

اُس نے بائیں ہاتھ براس کے گملے سے ٹھوکر کھا کر دائیں ہاتھ ساری میزوں کو دیکھا تھا۔ سارے سر احسان مندی کے بار تلے پلیٹوں پر جھکے تھے جیسے ہال میں موجود سب افراد کے بل کی ادائیگی

اُس نے کردی ہو خیرات کے طور پر۔ سجان کا سَر اُٹھا تھا اور وہ اُس گملے کو دیکھتا تھا جس سے وہ ابھی ٹکرائی تھی اور اُس کے بعد پھر وہ کلب کے چپے چپے میں بھر گیا چائینز ہال کے وال پیپر کے سارے رنگ اسی کے ٹراؤزر شرٹ سے کلر سکیم اَخذ کرتے تھے۔ کانٹی نینٹل ہال کی انٹری میں پڑے براس کے گملوں میں ہرے، انگوری، پیلے، زرد، نارنجی، سارے شگوفے اُس کی آنکھ کی ساخت اوڑھتے تھے۔ جب وہ داہنی آنکھ ذرا بھینچ کر سارٹی کہتا تھا۔ جیسے کہیں سمندروں میں قزاقی ہوگئی ہو۔ ہمہ رنگ روشنیوں پہ گرتی آبشار کی اُڑتی جھاگ میں، بار رُوم میں، ٹی وی رُوم، سیٹنگ رُوم، ٹینس کورٹ، سکوائش کورٹ، جم، ٹریک، سوئمنگ پول کیا پورا کلب صرف فردِ واحد کے لیے مختص ہو گیا ہے اور باقی سب کی رُکنیت منسوخ کر دی گئی ہے سوائے سجان کے...... اور ایک شخص ہر ہر جگہ ہر ہر لمحے کیسے موجود ہو سکتا ہے۔

تاریکی کی وزدی کی طرح مقدس معاہدے کے بطن میں سیندھ لگی تھی۔ سیندھ لگاتے چور کے کچے قدم لڑکھڑاتے تھے اور وہ برگد کی لمبی لمبی جڑوں میں سمٹ جاتی تھی۔ ہلاکت خیز بیماری نے خلیہ دَر خلیہ اپنا زہر بھر دیا تھا۔ اُس کے وجود پر اُگ آنے والی علامتوں نے شاید کہانی کا کچھ حصہ کہہ دیا تھا اور باقی کہنے کو تھیں۔ جب اُس رات سجان نے اُس کی سمت سے کروٹ لے لی۔

''جب تم اپنے وجود میں موجود ہو تو پھر مجھے بتا دینا، اس طرح تو کسی چڑیل کا مسکن لگتی ہو۔''

عزیزِ مصر جب زُلیخا کے قریب جاتا تھا تو زُلیخا چڑیل بن جاتی تھی۔ زُلیخا ایسے ہی چڑیل بن جاتی تھی کہ خالی خولی ڈھنڈار وجود تو چڑیلوں کا مسکن ہوا کرتے ہی ہیں۔ جب سجان سو جاتا ہے تو وہ چڑیل سی سارے گھر میں گھومتی ہے۔ آنکھ کی پتلی کا کیمرہ آن ہو جاتا ہے جس میں فوکس ہوئے مناظر کے پرنٹ پہ پرنٹ نکلتے ہیں۔

جھاگ سے بھرے کُشادہ ٹب میں وہ شاور لیتا ہے اور وہ بھر بھری برف سے جھاگ میں چھپ جاتی ہے۔ آسمانی رنگ ٹائلوں والے سوئمنگ پول میں کبھی ڈائیو Dive کرتا ہے، کبھی Back Stroke اور وہ کبھی Breadth میں کبھی Length میں ہاتھ پَیر مارتی ہے۔ اُس کے پنجوں سے چھٹتی لہروں میں غوطے کھاتی ہوئی۔

تین فٹ ضخیم گدے پر اُس کے پہلو میں کروٹ لیے کوئی پڑا ہے جیسے وہ کوئی مجسمہ ساز تھی اور عمر بھر کی ریاضت کا شہکار یہ یوسف کا مجسمہ مکمل کر اپنی خواب گاہ میں سجا لیا ہو۔ اس فن کی اتھاہ کی داد دینا

چاہیے۔ وہ بتدریج آنکھ کھولتی ہے...... یہ کون اجنبی...... ہاں سبحان اور اگر سبحان کہیں جھانک لیتا تو پھر...... بے حد اور بے حساب نیگیٹو ڈارک رُوم میں پڑے ہیں جانے کس وقت کس کس زاویے سے پرنٹ نکلنے لگیں۔ دِل کی نازک شریانوں جیسے دھڑکتے ہوئے تسموں کی گرہیں مضبوط رانوں پہ منڈھی ہوئی سیاہ رنگ نیکر کے لال حاشیے، ٹھوڑی کے ڈمپل کے اُوپر بھرویں ہونٹ کا کٹ جس سے گرم تنفس سا مَس ہوتا تھا۔

''سارٹی''

یک حرفی کہانی......جس کی پنہائیوں میں اور پرتوں میں سب بہہ جاتا تھا۔ موجود اور ناموجود، زاویہ بہ زاویہ، رُخ بہ رُخ، پرنٹ پہ پرنٹ نکلتے تھے......کرٹن کے سنہری راڈ تک، کرسٹل فانوس کے دودھیا بلبوں تک بخ بنی فالس چھت تک ڈھیر لگ چکے تھے۔ جب ارج نے پانی مانگا تھا اور اگر ارج جھانک لیتی تو یہ آرٹ لیگری کتنی اجنبی ہوتی اُس کے لیے اور وہ ماں کے مقامِ مقدس سے کیسے دھکا کھا کر گرتی۔

اُس نے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ سمیٹ سارے نیگیٹو ڈارک رُوم میں چھپا لیے اَرج کی تیسری آواز پر سبحان اُٹھ گئے تھے۔

''زُلیخا، اَرے منی پانی مانگ رہی ہے۔''

اگر وہ آنکھ کھول دیتی تو بیوی کے مقامِ اعتبار سے کیسے دھکا کھا کر لڑھک کر نیچے آتی دُودھیا مرکری بلب والے کھمبے کے نیچے پروانوں کے جلے بھنے پروں کے ڈھیر پر۔ جو اُڑنے کی صلاحیت دوبارہ کبھی نہیں پا سکتے اور سبحان اس اجنبی آرٹ گیلری کو اپنے بیڈ روم سے باہر نکال پھینکتا اور پھر...... پھر......دُھند اور کہر......

تو پھر یہ طے پایا کہ اَب وہ کبھی وہاں نہ جائے گی جہاں وہ ہوتا ہے اور وہ تو ہر جگہ ہوتا ہے جہاں وہ چلی جائے سو وہ کہیں بھی نہ جائے گی اور نہ ہی اُس ڈارک رُوم کا دَر کبھی کھولے گی جس میں لاانتہا نیگیٹو بند پڑے ہیں......بس اتنی سی تو احتیاط تھی جو بہت ضروری تھی کہ سبحان کو، بچوں کو، سب ملنے ملانے والوں کو اُس کا رویہ ابنارمل معلوم ہونے لگا اور نفسیاتی و دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹرز اس بیماری کو سمجھنے سے عاجز آ گئے۔ بس اتنی سی تو بات تھی......

ماں ڈائن

آ سانی جھولے کی طرح چکرا کر درد کی پٹخنیاں کھاتا ہوا سر ، حوالات کی سلاخوں سے ٹکرایا۔ لمبے لمبے ہولارے سے دل کی اُٹھک بیٹھک میں منہ بھر بھر اُلٹیاں اور اُبکائیاں نکلنے لگیں۔ صوباں نے مڑا ہوا زخمی ہاتھ لوہے کی سلاخوں میں اُڑسا اور بین کا سرا پکڑا۔

''ونتر دلا ورا! پردیسی تھیوؤں، تے ماں نمانی کس کھوہ سے تجھے ڈھونڈ نکالے۔ پر سپاہی کہیں تیرے جُنبشے میں ہاتھ ڈال اُسے باہر کھینچ لائیں گے۔ تُو ہی گندی ہے جس نے ڈاکو جنا ہے۔ صوباں کرموں جلی کہے...... ماں تو بیٹا جنتی ہے۔ ڈاکو تو اُسے دنیا بناتی ہے اور سپاہی اُسے اشتہاری کہتے ہیں۔ بخت پٹی ماں کیا جانے کب بیٹا ڈاکو بن کر اشتہاری ہو جائے۔''

ابھی وہ پہلی تفتیش کی غشی کے بعد ہوش میں آئی ہی تھی کہ بیرک کا بھاری دروازہ کھلا، جیسے کئی قیدیوں کی بیڑیاں مل کر جھنجھنائی ہوں۔ وردی پر اتنے ہی بلے سجائے داخل ہونے والے نے چھڑی کی نوک اُس کے بھرے بھرے سینے میں کھبوئی۔

''اچھا تو یہ صاحباں ہے...... اوئے اس صاحباں کا مرزا لاؤ اُداس دِکھتی ہے وچھوڑے کی ماری...... چچ چچ چچ۔''

افسر نے چھڑی کولہوں، رانوں، گالوں میں گہری گہری چبھوئی جیسے قربانی کے جانور کی کھال

کے نیچے چربی کی تہہ کا اندازہ لگا رہا ہو۔

''سر جی! ہر زے ہی ہر زے، ترکش میں سے تیروں کی طرح چھٹنے کو بے تاب ہر زے۔ آپ حکم تو کرو۔ ہر زے حاضر باش۔''

جٹے دار مونچھوں والا سپاہی صدا لگانے کے انداز میں منہ کے دونوں سمت ہاتھ کھڑے کر کے گھڑکا۔

صوباں دندانے دار پہیے میں پور پور کٹتے وجود کی پنڈ باندھ کر اُٹھی۔

''میرا نام صاحباں نہیں صوباں ہے۔'' منہ میں بھری اُبکائی کی پچکاری سلاخوں پر چھڑکی۔

پولیس افسر اُس کے سارے ہی نازک حصوں کو چھڑی سے ٹوہتے ٹٹولتے ہوئے جیسے جنونی ہو گیا۔ بے تحاشہ چھڑیاں برسانے لگا، ہاتھ سے بھی اور زبان سے بھی۔

''تُو صاحباں ہے کہ صوباں، ہے تو اُسی حرامی کی ماں، جس کے پیچھے پورے ضلع کی پولیس خوار ہو رہی ہے، جس کے سر کی قیمت دو لاکھ ہے اور جس کے متعلق صرف تُو جانتی ہے کہ وہ کہاں چھپا ہے بول وہ کدھر ہے۔''

صوباں نے چکی کے پُر کی طرح گھومتے سر کو سیاہ چادر کے پلو میں کس کے باندھا، دھڑکتی ہوئی کنپٹی پر کسی ہوئی گرہ دھک دھک بجنے لگی۔ اُجاڑ چہرے کو ذلت کے احساس نے گوندھ کر ٹھوس ٹھوس پکی اینٹ سا تپا دیا۔ گچھے دار مونچھوں اور ماتھوں والے ہاتھوں میں ایذاء رسانی کے اوزار پکڑے پل پل حملہ آور ہوئے۔

''بول دلا ورا کدھر ہے...... بول ورنہ ہم بکوائیں گے۔ ہم جو دل کے ہر زے، دماغ کے ہٹلر اور شکنجے کے جگے ہیں، ان سب کو ملا کر جو ایک بنتا ہے۔ اُسے کیا کہتے ہیں۔ بول صاحباں بول، اسے سپاہی کہتے ہیں۔''

''یہ سپاہی بڑی باکمال شے ہوتے ہیں صاحباں، ان کی وردیوں میں ہٹلر آرڈر دیتا ہے۔ ان کے دل میں ہر زا ڈھولے گاتا ہے اور ان کے دماغ میں جگا سنگھ دھاڑتا ہے۔''

یہ دل کے ہر زے صوباں کے گرد دھمالیں ڈالتے چیخنے چلانے لگے۔ اذیت رسانی والی آسودگی کی وحشت انہیں دیوانہ بنا گئی تھی۔

''پچھلے دس روز سے مجھے اُس کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ربّ کی زمین ڈھیر پڑی ہے، جاؤ ڈھونڈلواُسے۔مَیں نے اُسے کوکھ میں نہیں چھپار کھا۔''

صوباں دونوں ہاتھوں کے زور سے اُنہیں خود سے دور دھکیلنے کی کوشش میں ڈھیتی چلی گئی۔

''تیری کوکھ سے ہی حرامی نکلا ہے۔یہیں سے تفتیش شروع ہوگی۔اوئے فقیریئے! ذرا سنوار کے تلاشی لو نا، صاحباں کی...... مرزا بن کے...... ایک ایک تو پا اُڈھیڑ دو کنجری کا...... ابھی بھی عورت والے سات نہیں تو چھ مصالحے بھرے ہیں بدذات میں۔''

تھانیدار نے لہُو بھرا اُس کا چہرہ انگلیوں میں دبوچ کر یوں نوچا جیسے سَر سے الگ کر کے پھینک دے گا اُسے۔

''سپاہی گالی نہ دے مجھے، میں ماں ہوں۔تُو ماں کو گالی دیتا ہے۔تو دھرتی تجھ پر پھٹکار بھیجتی ہے۔ماں اور دھرتی کی حرمت ایک ہوتی ہے۔''

اب سپاہیوں پر خاص تفتیشی پاگل پن طاری ہو چکا تھا۔ ایذاء رسانی والی جنونی لذت کا نشہ چڑھ گیا تھا۔اس تفتیش کے دوران جب وہ بے ہوش ہوئی تو دلا ورا جیسے سَر پر آن کھڑا ہوا۔

''اماں! تیری حرمت بچانے کو ہی تو میرا باپ قتل ہوا، اور مَیں ڈاکو کہلایا،تُو میری جان بچانے کو بے حرمت ہورہی ہے؟ بتادے اماں میرا پتہ ان شکروں کو بتادے،تُو خود تو کہتی تھی۔ جان عزت کی میل ہوتی ہے۔''

وہ جاگی تو بین والی اُنگلی بدستور فضا میں گھوم رہی تھی۔

''دلاورا جا بھاگ جا ایسی جگہ...... سپاہی پینڈا (سفر) کرتے کرتے ہف جائیں پر تیرے تک کبھی نہ پہنچ پائیں اور اپنا پتہ ماں کو بھی نہ بتا...... تیری ماں عورت ذات...... عورت تو کچا گھڑا ہوتی ہے۔ چوڑا پاٹ پار نہیں کر پاتی...... بیچ دریا پھوٹ جاتی ہے......''

دوبارہ تفتیش شروع ہوئی تو نئے آنے والے افسر نے تو یہ بھی نہ پوچھا۔

''بتا دلاورا کہاں چھپار کھا ہے تُو نے۔''

اُس کے سینے پر بوٹوں کی ٹوہیں مارتے ہوئے سپاہیوں سے بولا۔

''چڑھ دوڑو، اس کتیا پر، جیسے بھیڑ پر بھیڑیے حملہ کرتے ہیں۔'' وہ زخموں کی گانٹھ وجود کو غیرت

کی گٹھڑی میں کس کر اُٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے دانت نکوستے ہوؤں کو پرے دھکیلا، تہمند کے ڈھیلے ڈب دائیں بائیں اُڑسے، چادر کی بُکل میں وجود سے کہیں بھاری فیصلے کے پتھر کو گرہ مار کر سر پر لپیٹا۔

''اگر میں بتادوں کہ دلاورا کہاں ہے تو پھر تم اُس کے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔''

افسر نے چھڑی ایک طرف رکھ دی اور سپاہیوں سے ڈپٹ کے کہا۔

''اماں جی کو شربت پلاؤ اور کرسی پر بٹھاؤ۔ بڑی عزت کے ساتھ ہماری بڑی ہیں، اماں جی! ہم دلاور کو پکڑیں گے اور اُسے پھر سے شریف آدمی بننے میں مدد دیں گے۔ بھلا آپ کو یہ کوئی اچھا لگتا ہے کہ وہ اشتہاری مجرم بن کر چھپتا پھرے۔'' صوباں نے بانہیں سیلے گھٹے پنجرے کی سلاخوں میں گھما کر بین کھینچا۔

''صوباں کرماں جلی سب جانے کہ سپاہی جھوٹ بولتا ہے، پر اُسے اپنا خُبجہ پیارا ہوا۔ اس نجس تن پر بیٹا وارنے کو راضی ہوئی۔ صوباں بوجنی (بندریا) کے پَیر جلے تو اپنے ہی بچے پر رکھ بجھائے۔ چھپ جا دلاور کہیں دھرتی کی دراڑ میں اُتر جا، ماں سپنی تجھے کھانے کو نکلی......''

نوجوان اے ایس پی نے جیپ کا دروازہ خود کھولا اور سپاہیوں کو ڈپٹا۔

''ماں جی کو بڑے احترام سے بٹھاؤ یہ قانون کی مدد کرنے جارہی ہیں۔ یہ بڑی عظیم عورت ہیں مَیں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔'' دروازہ لاک کرتے ہوئے اے ایس پی نے سیلوٹ مارا اور دوسرا دروازہ کھول کر خود سوار ہوا۔

''اماں جی! آپ کو جگہ تو صحیح صحیح معلوم ہے نا۔''

صوباں نے دونوں بازو جیپ کے اندر چھت کے ساتھ ساتھ گھمائے۔

دلاورا، جا نکل جا ایسی ٹھار جسے نہ مَیں جانوں نہ سپاہی ڈھونڈ سکیں۔ سپاہی تُو اُسے کیوں نہیں پکڑتا، جس نے دلاورے کے ہاتھ سے کتابیں چھین چھری پکڑا دی۔ ماں نمانی دس سال کتابیں گن گن پوری کرتی رہی کہ بیٹا مُڑ آئے گا اور دسویں کے پرچے ڈالنے جائے گا، جس روز گھر سے نکلا تھا۔ اگلی صبح پرچہ ہی تو ڈالنا تھا۔ روز سویرے بستہ سینت، پراٹھا پکا، پونا باندھ رکھتی کہ بیٹا مُڑ آیا تو کہیں سکول سے دیر نہ ہو جائے اور ماسٹر نہ مارے، پن پینسل دھو دھو رکھتی کہ دوبارہ ماں نمانی کہاں سے خریدے گی۔ روز دُعا کے وقت جا کر ماسٹر سے پوچھتی دلاور کا نام تو نہیں کٹا۔ ماسٹر مخول میں پڑ جاتا۔'' دلاورے

کا نام تو اگلے سے اگلے رجسٹر میں چڑھ رہا ہے کٹ کیسے سکتا ہے......اماں جی۔''

''دلاور پڑھا لکھا آدمی ہے، مجھے پہلے ہی معلوم تھا اماں جی۔''

اے ایس پی نے بین کے لہن میں روڑا اُنکایا۔

جیپ گھور تاریکی میں اندھی کچی دُھول اُڑاتی کسی درخت کے ٹنڈ سے ٹکرا کر لڑکھڑائی۔ صوباں اُچھل کر جیپ کی چھت سے بجی۔ اے ایس پی نے ڈرائیور پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اگر بوڑھیا مَر گئی تو دلاور ہاتھ سے گیا اور اُس کے ساتھ ہی ترقی، اچھی پوسٹنگ، اے ون اے۔ سی۔ آر اور......اور......اور......کس قدر قیمتی تھی اس وقت یہ بوڑھیا۔

''سپاہی تُو اس بردے غریب کو نہ ڈانٹ۔ آپ بھی نہ گھبرا۔ ماں ڈائن بیٹا پکڑوا کر ہی مڑے گی......''

بین والی اُنگلی پھر گھومنے لگی۔

''غریب کی عزت تو بزرامٹی کا گھگو گھوڑا...... بہتیرا سینت سینت ٹوکرے میں ڈال سَر پر اُٹھا رکھو، پھر بھی کبھی تڑک جائے، کبھی مڑک جائے، کبھی بکھر جائے......جس کسی کا ہاتھ سَر تک پہنچ پائے جھپٹا مار سارا ہی اُچک لے جائے۔ بڑی منت کی اس گھگو کا کھیڑا (پیچھا) چھوڑ دے......مَیں غریب کی جورو تُو بادشاہ، تو عزت دار، مَیں عزت بچا کے بھی بے عزت...... پر نہ مانا کھیڑے پڑ گیا......گھاس کھودنے جاتی...... پانی بھرنے جاتی۔ پاتھیاں چگنے جاتی......گھوڑا دوڑا سَر پر آن کھڑا ہوتا......صاحباں مَیں تیرا مرزا...... چل گھوڑے پر بیٹھ۔ میرے ساتھ محل میں چل۔ بہتیرا سمجھایا......مَیں صاحباں نہیں صوباں ہوں......غریب کا تو نام بھی تہمت...... دہائی دی۔ محل میں نہیں جھگی میں سجتی ہوں۔ جہاں جو شئے سجتی ہے اُسی جگہ کے لیے بنی ہوتی ہے کسی اور تھاں گاڑو تو اُوپری دکھتی ہے......''

جیپ دھچکے کھاتی تاریکی کی گھور سُرنگ میں اُترتی چلی جا رہی تھی۔ صوباں کے سینے کے گہرے غار سے چھنتا بینوں کا دُھواں گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں آمیز ہو رہا تھا۔ سپاہی بینوں کے احترام میں چپ تھے۔ ایسے ہی جیسے پھانسی گھاٹ پر چڑھنے والے کے ہذیان خاموشی سے سنتے ہوں۔ اُس وقت جب وہ تمام آلائشوں، تمام ضرورتوں سے ماورا ہو کر ننگا بچا آدمی نکل آتا ہے اور یہ جو جیپ میں بیٹھی بین کرتی تھی۔ یہ بھی تمام ضرورتوں، تمام آلائشوں سے صیقل ہو کر صرف ماں نکل آئی تھی اور عورت جب بس ماں

نکل آئے تو دھرتی کا بطن کانپ جاتا ہے۔

صوباں کے دونوں بازو باہر جھلتے جھکڑ کی طرح ہولارے کھانے لگے۔

''وہ رات صوباں کے نصیب سی کالی تھی، جب منڈا سے مارے وہ آئے اور دلاورے کے باپ کو وَڈ (کاٹ) کر چلے گئے، جیسے مُولی گاجر کتر گئے ہوں......''

ہَوا کے کئی جھولے جیپ کے کھلے شیشوں سے صوباں کے منہ پر تھپیڑے مارتے ہوئے گزر گئے، جیپ کے ٹائروں سے چھٹتی منوں کچی ریت دانتوں تلے کرکرائی۔ بین والی اُنگلی شیشے سے باہر پہاڑ سے اُڑتے ریتل میں گھومنے لگی۔

''صوباں تو صبر شکر کر بیٹے کو ڈھال بنا رنڈاپا کاٹنے بیٹھ رہی۔ دُکھ کی مٹی ابھی آنسوؤں کے پانی میں بھیگی تھی۔ صوباں کرماں سڑی مکیاں مار مار ابھی تون جما رہی تھی...... صوباں بخت پٹی! تیری جھگی کا کمزور دروازہ توڑ کر وہ اندر آیا اور نمانی بانہہ (بازو) پکڑ کر بولا۔ ''چل صاحباں مَیں تجھے لینے آیا ہوں۔'' صوباں کرماں سڑی نام کی کالک متھے پہ مَل کے کڑوا دُھواں نکلتی بجھتے دِیے کی لاٹ اُونچی کر کے بولی...... نہ بادشاہ! ابھی صوباں کے گھر میں ایسا اندھیر نہیں مچا کہ تو وریام کی بیوہ اور دلاورے کی ماں کو صاحباں بنا کر لے جائے۔''

''واہ آپ شروع سے ہی دلیر تھیں......''

اے ایس پی نے سامنے چڑھتے ریتلے ٹیلے کو گھورا، جس میں سے گزرتے ہوئے فور ویل گاڑی کے ٹائروں میں سے چھٹتے ریت کے پہاڑ رائی بن بن اُڑ رہے تھے اور ٹوکرے بھر بھر اندر بیٹھے سپاہیوں کی وردیوں پر بچھنے لگے تھے۔

صوباں نے اے ایس پی کی ہمدردی کو منہ میں بھری دھول میں بلو کر باہر تھوکا اور دونوں بازو سپاہیوں کے سَروں کے اُوپر اُوپر گھمائے۔

''تب وہ انسان سے شیطان ہو گیا۔ دلاورے! تیری تو ابھی پڑھتے پڑھتے آنکھ ہی لگی تھی۔ سانجھرے پہلا پرچہ ڈالنے سکول لے جانا تھا۔ دسویں جماعت کا...... ربا چپا! تُو اسے سلائے ہی رکھتا۔ غریب ماؤں کے جوان بچوں کو تُو گہری نیند سلائے رکھا کر...... پر وہ جاگ گیا۔ پتہ تو مجھے اُس وقت لگا، جب چھری شیطان کی پچھلی پسلیوں کو چیرتی سینے سے باہر نکل گئی اور ابلیس کا نجس لہو میرے سارے وجود

کو گوندھ گیا......''

''اوہو''

اے ایس پی نے پھر اظہار ہمدردی کیا۔

''ہاں اماں جی! اُس کیس کی فائل مَیں نے دیکھی ہے۔ بڑا ظلم ہوا تھا آپ کے ساتھ، نجانے یہ جاگیرداری نظام کی لعنت کب ختم ہوگی ہم پر سے۔ ویسے اماں جی! آپ کو رستہ تو صحیح صحیح یاد ہے نا۔''

صوباں نے اُس کی بات سُننے کو توقف نہ کیا۔ بین لپیٹے دونوں باز و فضا میں لہراتے رہے۔

''سپاہی تو اُسے کیوں نہیں پکڑتا، جس نے کتابوں والے ہاتھ میں چھری پکڑا دی، جس نے غریب کی جورو پہ ننگی نظر ڈالی، جس نے رات کے اندھیرے میں انا بولا اندھیر مچایا......''

صوباں نے جنگل میں گھومتے اک کچے رستے پر جیپ کو مڑنے کا اشارہ دیا۔ ''اماں! صحیح صحیح رستہ بتاتی جا تجھے سب پتہ ہے، کئی بار پیدل چل کر انہی اندھیرے رستوں میں مجرم کو ملنے گئی ہے۔ سب مخبری ہے ہمارے پاس۔''

پیچھے بیٹھے تھانیدار نے بندوق کی نشست اس طرح بدلی کہ اُس کی نالی صوباں کی کنپٹی سے ٹکرائی۔

گھنے پیڑوں کی شاخیں جیسے فضا میں باہیں لہراتی بین کرتی تھیں۔ باہم اُلجھے جھنڈ کسی جواں مرگ کی پھوڑی پہ بیٹھے سیاہ ماتمی چادریں سَروں پہ ڈالے اک دوجے سے گلے بل روتے تھے۔ تیز جھکر خشک ہرے پتوں کے سینوں پہ ضربیں مار مار نکلتے، پُرانے درختوں کی کھوؤں میں کُوکتے اور ماتمی ہتھیلیاں فضا میں تاڑ تاڑ مارتے۔

''دلاورا پتر! اماں ڈائن سپاہیوں کی کتیا بن گئی اور تیری راہوں کی مٹی سُونگھنے کو نکلی......انی بولی (اندھی بہری) رات کو گھر کا رستہ چھوڑ، بے راہ زمینوں کو نکلنے والے! ماں نمانی دروازہ کھلا رکھ اُڈیک (انتظار) میں بیٹھی بیٹھی آپ ہی تیری مخبر ہوگئی...... جس نمانی کی نیندر تیرے پیروں کے کھڑکے میں لپٹ تیرے ساتھ ہی کہیں اُچل گئی تھی...... ماں بجنت لٹی جھگی کا پٹ کبھی نہ ڈھوتی (بند کرتی)......کیا پتہ رات کے کس پہر تو لوٹ آئے اور بند دروازہ دیکھ پلٹ جائے......ساری رات دُھواں دہنکائے ککھ کانے ساڑتی۔ چادر کا پلا پھاڑ دیئے کی وٹیاں مروڑ مروڑ رکھتی کہ کہیں بجھا دیا دیکھ تُو مُڑ نہ جائے......''

اے ایس پی نے لہجے میں امرت گھول دیا، جو اُس کے سینے کے زہر میں مل کر تلخ ہو گیا تھا۔

''اماں جی! کتنا فاصلہ رہ گیا ہے۔''

''نہ ابھی ڈھیر پینڈا (کافی فاصلہ) ہے......''

بازو چار چو فیرے گھما کر جگر کے ٹکڑے پھرا گلے۔

''یہ پینڈا تو اُس اندھی رات سے نکلا، جب خون نچڑتی چھری انگوچھے میں اڑوس تُو نے کہا۔ ''ماں! ہم پر ہونی آئی۔'' صوباں بخت پٹ پتھر ہو گئی۔ پَل کی پَل میں بیٹا ماں کا نہ رہا، سپاہیوں کا مجرم بن گیا...... اور گھر سے نکل بے منہ سَر زمینوں میں گواچ گیا، جن میں سے نکلتا رستہ بس آگے ہی آگے جاتا تھا...... جس میں کبھی کوئی موڑ نہ آیا...... گھر مُڑ نے کو تو رستہ پھرا ہی نا...... سیدھا رستہ کچھاڑ بنتا چلا گیا...... جب ملا، کہا۔ ماں! ایسے مل جیسے آخری بار ملنا ہو...... ایسے رخصت کر، جیسے ماں بیٹے کا جنازہ رخصت کرتی ہے...... ونٹر دلاورا! ماں ڈائن آج تیری پھوڑی پہ بیٹھی بین الارے......''

جیپ دھچکے کھا کھا درختوں کی گپھاؤں میں رستہ بناتی تنوں اور کھکھلوں سے ٹکرا ٹکرا اُچھلتی۔ کھلونے کی طرح پٹخنیاں کھاتی اندھیرے سے ٹکراتی چلی جا رہی تھی۔ پیچھے بیٹھے تھانیدار نے تاریکی کی کوکھ میں گھور گھور ہر سمت دلاورے کا ہیولا کھوجا۔

''دیکھ اماں! یہ نہ ہو کہ تو ہمیں جیپ سمیت اُس کے اتنا قریب لے جائے کہ وہ کھڑکا پا کر بھاگ نکلے۔ وہ تو چھلاوہ ہے۔''

کھکھلوں سے نکلتے جنگلی چوہوں کے پیچھے بھاگتی بلیوں کی آنکھوں میں موت کی برہنگی دیکھی اور صوباں نے چادر کی کسی ہوئی بُکل کھول کر گٹھڑی بنا سَر پر رکھی۔

''دلاورا پترا! ماں مخبر موت کی پنڈ سَر پہ اُٹھا، تیری گھات میں نکلی تو موت والی گاڈی کی آواز سُن لے گا۔ پر ماں ڈائن کی بُو پا کر کبھی نہ بھاگے گا، جس ڈائن کی حرمت پر قربان ہو مجرم کہلایا۔ ونٹر دلاورا! ماں مخبر تجھے پھاہی لگوانے کو نکلی......''

گھنے درختوں کی گنجھل سرنگوں میں اب جیپ کے گزرنے کو رستہ نہ رہا تھا، جن میں سوّر اور بھیڑیئے سانپ اور بچھو رہتے تھے۔ انہی میں کہیں دلاورا بھی چھپا رہتا تھا۔ صوباں نے ہاتھ کے اشارے سے اب جیپ روکنے اور پیدل چلنے کو کہا۔

سپاہیوں کے پنڈلیوں تک چڑھے، لمبے بوٹوں پر بچھو، سانپ لہرا لہرا گزرتے۔ غصیل بھیڑیئے، سؤر اکڑ کر سامنے کھڑے ہوتے پھر بندوقوں کی نالیوں سے چندھیا کر چوبی چٹانوں سے ٹکراتے، جن کے چمکتے ہوئے ڈیلے گھپ اندھیرے کی آنکھیں معلوم ہوتے۔ جنگلی کیکروں اور جھاڑیوں کی لمبی سولیں سپاہیوں کی وردیوں میں چبھ چبھ ٹوٹتیں، زہریلے پتوں کا رس منہ آنکھوں میں ٹپکتا، گھٹنوں گھٹنوں چڑھی جنگلی گھاس کی مہک سَر درد بن چڑھتی۔ صوباں نے دونوں بازو فضا میں گھمائے، پتھری اُنگلیاں سوئی سوئی شاخوں میں اُلجھیں۔ بین کا دھواں تاریکی کی بے داغ چادر پہ چھٹا، درختوں کی ٹیشیوں پہ چڑھا۔

''زہری سانپ بچھو سپاہیوں کے بوٹوں سے بل کھاتے اور وردیوں پہ ڈنک مارتے ہیں۔ ماں ڈائن کے ننگے پَیروں پہ کیوں نہیں ڈنکتے ...... ارے ماں ڈائن تو آپ سپنی ہوئی...... سپنی جب ماں ہو جاتی ہے تو زہر بھری تھیلی ہو جاتی ہے۔'' اس زہری کو ڈنکیں تو آپ مریں۔

اب پولیس والوں کو پہلی بار یہ احساس ہوا، کہ صوباں کے پَیر ننگے ہیں اگر کسی سانپ بچھو نے ڈس لیا تو دلاورے کی مخبری سینے میں سمیٹ مَر جائے گی، بندوقیں تانے سپاہی اُسے چاروں اور سے گھیرے پتہ پتہ پھونک پھونک چلنے لگے۔

صوباں کے بازو دائیں بائیں گھومتے، سیاہ چادر کی گٹھڑی سَر پر دھرے سوکھے پتوں کی ڈھیریوں اور کمر کمر چڑھی جنگلی گھاس میں پتھر سے پیر رکھتی تو اُن کے زخمی بدن کراہتے، جیسے بسمل کی تڑپ سے پتھر کا دل پگھلتا ہو۔ آنسوؤں کے تقاطر میں سینے کے زخم ذرا ذرا چھدتے......

''ارے کوئی تو پوچھے۔ صوباں بوجنی! اس خالی گٹھڑی میں کیا باندھا ہے۔ ماں ڈائن کہے یہ موت کی دلہن کا تحفہ ہے جو اک ماں اپنے بیٹے کو دینے لے جا رہی ہے۔ سپاہیوں کی بارات ساتھ لیے۔ دلاورے! تیرے جیسے غیرت مند بیٹوں کی بے کس مائیں ایسی ہی دلہن لاتی ہیں......'' اُس نے سَر سے اُتار کر خالی گٹھڑی کو چوما۔

اے ایس پی نے صوباں کے رستے سے کانٹے دار جھاڑی کو اسٹک سے اُٹھا کر پرے دھکیلا، اور پیشہ ورانہ نرمی سے بولا۔

''اماں جی! ذرا آہستہ چلیئے۔ کھڑکا پا کر وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔'' پیچھے جُوئے تھانیدار نے

سرگوشی میں کہا۔

''اگر وہ بھاگ گیا تو یاد رکھ بوڑھیا! یہ تیرے ساتھ آنے والے سارے بھیڑیئے اور سوٗر کی اولاد میں سے ہیں تیری بوٹی بوٹی یہیں چکھ لیں گے اور ہڈیاں ان گپھاؤں میں چھپے درندوں کے آگے ڈال جائیں گے۔''

اے ایس پی نے تھانیدار کی بڑھی ہوئی توند میں چھڑی کھبوئی۔

''نہ نہ اماں جی سے تمیز کے ساتھ بات کرو۔''

صوباں جیسے بیٹے سے ملنے کی خوشی میں اُس کے انجام سے بھی بے فکر ہو چکی تھی۔ سب درندوں چرندوں کو پھلانگتی، کانٹے دار زہریلی جھاڑیاں روندتی کھکھل اور ٹنڈ منڈ ٹاپتی، انسانی قد برابر چڑھا ٹیلا اور گھاس چیرتی، دوڑتی چلی جا رہی تھی جیسے وچھوڑے کی آگ چھوگئی ہو۔

پولیس پورے جنگل میں پھیل چکی تھی۔ ہر درخت کی کھوہ میں، ہر جھاڑ میں، سپاہیوں کے غول پوزیشنیں لیے ہوئے تھے۔ کئی مچان بنائے جھنڈ میں چھپے تھے۔ ساتھ تو تھوڑے ہی آئے تھے لیکن اب جیسے ہر درخت کے تنے سے چیونٹیوں کی قطاریں بن بن نکل رہے تھے کہ کہیں آسمانوں میں تیرتے ٹڈی دل نیچے اُتر آئے تھے۔

''اماں جی! آپ کو ٹھکانہ تو صحیح طرح سے یاد ہے نا۔''

اے ایس پی نے لہجے میں ساری شیرینی گھول دی تھی۔

''ٹھکانہ تو اُس روز چھٹ گیا۔ سپاہی پترا جب لہو بہاتی چھری انگو چھے میں اڑوس وہ گھر سے نکلا اور پھر سناٹے کے پیروں کا کھڑکا (آواز) ہو گیا...... ڈاکو پتروں کے ٹھکانے نہیں ہوا کرتے۔ ماں ڈائن بیٹے کی مہک پکڑ اُس تک پہنچتی ہے۔ کہتا تھا اماں تُو نہ آیا کر...... سپاہیوں کو پتہ لگ گیا، تو تجھے سُونگھنے والا کُتا بنا ڈالیں گے۔ تب مجھے خبر کر دینا...... مَیں آپ ہی آ جاؤں گا...... پر ماں کھندی (پوائنٹر کُتا) بن گئی۔ شکاری کُتے ساتھ لگا تجھے ڈھونڈنے کو نکلی۔ کھندی تجھے باہر نکالے گی۔ شکاری کتے تیری بوٹی بوٹی چیر ڈالیں گے۔''

سامنے جنگل کو کاٹتی ہوئی ریلوے لائن تاریکی کی کوکھ میں اُترتی چلی گئی تھی۔ سگنل ڈاؤن تھا۔

صوباں نے لائن کی بجری پہ پَیر دھرا، اے ایس پی نے سرعت سے اُسے اٹھا کر واپس پھینکا۔

تھانیدار بندوق کی نالی اُس کے سینے پہ تان کر دھارا۔

''سَر جی! یہ فریب کار بڑھیا لائن پر لیٹ جائے گی اور گاڑی کو اوپر سے گزار کر قیمہ ہو جائے گی اور دلاورے کا سراغ ساتھ لے جائے گی۔ ڈاج دے رہی ہے سَر جی۔ یہ ہمیں خوار کر رہی ہے۔''

اے ایس پی نے پستول کی دستی تھانیدار کے سینے میں کھبوئی۔

''خبردار! جو ماں جی سے بدتمیزی کی بات کی۔ یہ ہم سے تعاون کر رہی ہیں۔ قانون کی نظر میں کسی مجرم کی کوئی ماں نہیں ہوتی۔ مجرم مجرم ہوتا ہے، بیٹا نہیں ہوتا۔ اماں جی خوب سمجھتی ہیں۔''

تبھی تیز رفتار گاڑی دُھول کے ٹوکرے اُچھالتی بچھاتی دھرتی کا دل دہلاتی، لرزاتی گزر گئی۔ تادیر آہنی پٹڑیاں صوباں کے بدن کی مانند کانپتی رہیں۔ دھول کے غبار لپیٹے سپاہی صوباں کے گرد زنجیر بنا گئے تھے، جیسے وہ غبار کی آڑ میں اُن کی سنگینوں سے کہیں نکل بھاگے گی۔

صوباں نے بازو سَر پر اُلارے، سَر پر رکھی موت والی گٹھڑی کانپی۔

''اے گڈیئے! صوباں ڈائن پر تو بھی تھوک کے چلی گئی۔ اس ڈائن کا سینہ تو گھسوٹ لے جاتی تو دلاورے کی بو والی پہچان بھی تیرے پہیوں میں قیمہ ہو لپٹ جاتی...... یہ مجھ سے سونگھوالیں گے...... دلاورے تجھے سونگھوالیں گے...... ماں نمانی کہے۔ بیٹے مجرم پیدا نہیں ہوتے۔ مجرم تو انہیں وڈیرے بناتے ہیں اور تم انہیں اشتہاری کہتے ہو...... بیٹے کی ماں کو مجرم کی ماں کہتے ہو۔ صوباں نمانی پوچھے ماں کو سُونگھنے والی کتیا بنا لینا کہاں کا انصاف ہے...... جاؤ مَیں نہیں سُونگھتی اُسے......'' وہ پٹڑی پر لمبی لیٹ گئی۔

''جاؤ خود ڈھونڈ لو اُسے، اسی جنگل میں پڑا ہے کہیں...... وہ ایک تم جتھوں کے جتھے، ارے کیسے لشکری ہو۔ ایک بیٹے کے پکڑنے کو اُس کی ماں سے اُسے سونگھواتے ہو......''

سپاہیوں نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر تقریباً فضا میں اُٹھا کر اُسے لائن پار کروائی۔ اے ایس پی نے تھانیدار کے کان میں سرگوشی کی۔

''اس کی ہذیانی کیفیت بتاتی ہے کہ دلاورا کہیں قریب ہی چھپا ہے۔ بڑھیا پُوری پاگل ہو گئی ہے۔''

لائن پار جنگل میں ٹیڑھے میڑھے کھو کھلے تنوں والے کیکروں کے سیاہ چھال سے زرد گوند ٹپکتا

تھا، جن میں گلہریاں سوتی تھیں۔ جہاں کیکر اور شرینہہ کے زرد پھولوں اور پیلی نمکولیوں کی مہک بھرتی تھی، جس میں خشک پتوں اور بھیگی مٹی کی بُو گھلی تھی اور درندوں کے بدن کی وحشی بُو، سپاہیوں کی وردیوں سے چھنتی بارودی مہک رچی تھی۔ صوباں نے دونوں نتھنے پھلا کر سُونگھا۔ درختوں کی پھننگوں میں ٹوٹتا ہوا آدھا چاند...... جس کی زردی صوباں کے چہرے پر مَلی گئی تھی اور جس کا آدھا حصہ کرچی کرچی ہو کر صوباں کے بینوں میں پرو دیا گیا تھا۔

''دلاورے! موت والی واشنا تیرے گرد پھیلی ہے۔ سارے جنگل میں گھلی ہے۔ ماں ڈائن نے موت والی بُو سونگھ لی ہے۔ ارے سُونگھ لی ہے۔ بھاگ جا دلاورے ایسی تھاں جہاں موت ملی واشنا کبھی نہ پہنچ پائے۔ سن، ماں ڈائن موت والی گٹھڑی سَر پر رکھے آ پہنچی۔''

گھنے پیڑوں کے بعد اب چھدرے اور خشک درخت اور جھاڑیاں شروع ہو چکے تھے۔ دُور دُور اُبھرے ٹیلوں پر آک، کنیر، بھکھڑا، کنڈیاریاں، ورلی ورلی پھیلی تھیں۔ روڑ، گیٹے بھرے میدانوں میں کریاں، تھور، آک، زہری بُوٹیاں، زرد چاندنی کی مہین تہہ میں سب لپٹے تھے، جیسے موت کی زردی سب کے چہروں پر پھینٹ دی گئی ہو۔ صوباں کے بین حلق میں گھڑ گھڑائے، پیر گھسٹنے لگے، جیسے چکّی کے بھاری پُڑ پنڈلیوں سے بندھے ہوں۔ حلق کے کنویں میں بھراؤ کا چکرا تا تھا۔

''اُٹھ جاگ دلاورے ماں ڈائن آ پہنچی، سپاہی ساتھ لیے تیرے سَر کا انعام لینے آ پہنچی، اگر انعام نہ لے تو وجود کی بے حرمتی کروائے اس وجود کی جس نے دلاورے جیسے شیر کو جنما، باہر نکل دلاور! موت کے فرشتے ساتھ لیے ماں تجھے لینے کو آئی۔''

اُس نے سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا اور کچی ریتلی دھول میں ٹخنوں ٹخنوں کھبتی ٹیلا چڑھنے لگی۔ پنجوں میں بھر بھر اُڑتے گیٹے بھری دھول، سَر پر جھڑتی، پلکوں، ابروؤں، نتھنوں میں گھستی۔ سورج کے جلتے الاؤ میں نہا نہا تانبا ہوئے ٹیلے پر زرد چاندنی کا میلا غلاف چڑھا تھا، جس کی چاروں ڈھلانوں کو خشک سرکنڈوں کے جھاڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ صوباں جس ٹیلے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ سپاہی اندھیرے کی اوٹ میں اُسے چاروں اطراف سے گھیر چکے تھے۔ خود اے ایس پی اس ٹیلے کے بالمقابل قدرے بلند ٹیلے پر پھیلی جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ میں پوزیشن لے چکا تھا۔ ٹیلے کی بغل میں کری کا چھاپا پھیلا تھا۔ آدھا خشک آدھا ہرا، جس نے ٹیلے میں بنی سرنگ کے دروازے کو ڈھک دیا

تھا، جیسے مدتوں سے یونہی پڑا ہو۔

''یہ مکار بوڑھیا وقت گزاری کیوں کر رہی ہے۔ بہانے بہانے سے، جان بوجھ کر دیر کر رہی ہے۔ کہیں کوئی چال نہ چل جائے۔ ہم اس ٹیلے کو گھیرے رکھیں اور وہ کہیں کسی مچان پر سے ہم پر فائر کھول دے۔''

اے ایس پی نے چاروں اطراف پھیلے سپاہیوں کی پوزیشنوں کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی، جن کی وردیاں اندھیرے اور ڈھول میں اٹی دکھائی نہ دیتی تھیں۔ آنکھوں کے شعلے کہیں کہیں سجائی دیتے یا پھر بندوقوں کی نالیاں چمک جاتیں۔ اُس نے وائرلیس سے دو چار ہدایات جاری کیں اور اردگرد کے سارے ٹیلوں، ٹبوں، جھنڈ، مچانوں کو ہائی الرٹ کیا۔ صوباں اب کری کے خشک حصے کے پاس کھڑی تھی۔ آدھی رات کا چاند ٹمٹماتا دیا سا درختوں کے جھنڈ میں اُتر گیا تھا، جس کی زردی سلیٹی ہو چکی تھی۔ اب دل والی اُنگلی پورے سینے کے گھاؤ میں گھومی۔

''دلاورا پتر! باہر نکل کے دیکھ پورے ضلع کی پولیس تیرے لینے کو آئی تو ماں کا اک پتر جس کے گرد سپاہیوں کی گاردیں گڑ گئیں۔ دلاورے یہ ماں نمانی کیوں نہ وڈیائی کرے جس نے یہ شیر بچہ جنا جس کے پکڑنے کو پورا جنگل کتوں، شکروں سے بھر گیا۔ باہر نکل دلاورا ماں گھمنڈی تجھے ملنے کو آئی......''

تبھی خشک چھاپا بلا اور کمر ڈہری کیے دلاورا باہر نکلا، صوباں کے پَیر چھو کر بتدریج بلند ہوا جیسے دیودار کا پیڑ کسی پہاڑی چوٹی سے اُکھاڑ اس ٹیلے پر گاڑ دیا گیا ہو۔ حلق سے کھنگار نکلی۔

''ماں تُوں۔''

دل والی اُنگلی موت چہرہ زرد اندھیرے میں گھومی۔

''ماں نہ آکھ ڈائن آکھ (کہہ)......''

ٹیلے کے چاروں اور تنی بندوقوں کے منہ یکبارگی کھلے، شعلے اور انگارے جھڑے، جیسے بالمقابل اکیلا دلاورا نہ ہو دشمن کی پوری مسلح فوج ہو۔ پورا ٹیلا گولیوں اور گولوں سے چھید و چھید تھا لیکن دلاورے کا بُت اپنی جگہ کھڑا تھا، کہ اُسے صوباں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ درندے، چوپائے بلوں کھچاڑوں سے نکل جھنڈ جھاڑوں سے ٹکرائے تو زمین و آسمان گولیوں میں گندھ گئے۔ پرندے گھونسلوں سے غوطے کھا اوندھے منہ گرنے لگے۔ تو کلاشنکوف کے برسٹ ساری فضا میں بھر گئے۔ بارود بھری ہَوا کے شرلاٹے

جھنڈ جھاڑیوں میں منہ کے بل گرے، جس میں چھروں کا مینہ برستا تھا۔

سامنے ٹیلے پر پوزیشن لیے ہوئے اے ایس پی نے بھونپو میں اعلان کیا۔

''دلاورے! تم چاروں اطراف سے گھیرے جا چکے ہو، ذرا سی حرکت پر تمہیں بھون کے رکھ دیا جائے گا۔ زندگی چاہتے ہو تو ماں کو ڈھال بنا کر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔''

صوباں نے با آواز بلند بارود بھری ہَوا کا ہَو کا بھرا۔

''سپاہی تُو تو کہتا تھا۔ دلاورے کی مدد کرے گا پر صوباں ڈائن جانے یہاں مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ سب مارنے والے ہیں بچانے والا کوئی نہیں......''

''بوڑھیا تُو آگے سے ہٹ جا ورنہ......''

اے ایس پی کا لہجہ بارود پکڑ گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ صوباں کی پشت کو چھیدتی دلاورے کے سینے میں اُتر گئی تھی۔

بین والی اکلوتی اُنگلی ابھی بھی بارود بھری فضا میں سیدھی کھڑی تھی۔ زبان پہ تھرتھراتا بین کھلی آنکھوں میں ساکت تھا۔

''مائیں تو بیٹے جنتی ہیں۔ دُنیا انہیں مجرم بنا دیتی ہے۔''

بڑی خبر

''ابو! اس احمق ڈرائیور کو منع کریں، رستے میں باتیں کر کے مجھے ڈسٹرب کرتا ہے، جب کہ میں نے سکول پہنچنے تک اپنا ٹیسٹ ریوائز کرنا ہوتا ہے۔''

ایمن کے ہاتھ سکول بیگ تیار کر رہے تھے، منہ سینڈوچ نگل رہا تھا اور نگاہیں سامنے ٹی۔وی سکرین پر جمی تھیں۔

''بیٹا! آپ جواب نہ دیا کریں، خود ہی بول کر چُپ ہو جایا کرے گا۔''

یہ لوگ ایک وقت میں کئی کئی کام کرتے تھے تب ناظم سوچتا، یا خدا دو کی بجائے دس ہاتھ اور ایک کی بجائے دس دماغ دے آج کے دَور میں سروائیو کرنے والوں کو۔ پر زندگی تو پھر وہی ایک ہی ہے۔

''پاپا! کیا میں پاگل ہوں کہ اُس فولش کی بات کا جواب بھی دوں، خبریں سنانے کے لیے کسی جواب کی ضرورت ہوتی ہے کیا، خود ہی بولتا چلا جاتا ہے۔ فلاں سڑک پر ایکسیڈنٹ ہو گیا فلاں پر ڈاکہ پڑ گیا۔ کس نے خودکشی کر لی، کون مر گیا، پورے شہر کی ڈائری تو اُس کی زبان پر لکھی ہے، جو موقع بہ موقع خبرنامہ پڑھنے لگ جاتی ہے۔''

نزہت نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پہ اُنگلیاں گھماتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں نگاہیں سکرین پر جمائیں، سینڈوچ کا ٹکڑا حلق سے اُتارا، چولہے پہ چڑھی ہانڈی کی بُو سونگھی کہ جل تو نہیں گئی۔

''اس کلاس کا یہی تو مسئلہ ہے امی! اپنی تمام تر توانائیاں محض زبان پر خرچ کر ڈالتے ہیں۔ نہ سوچ نہ فکر، نہ لکھنا نہ پڑھنا، یہی دیکھو، جب میں اہم انفارمیشن لے رہی ہوتی ہوں تو کام والی رات کا دیکھا خواب سنانے کو آ کھڑی ہوتی ہے۔ ارے بھئی جب بارہ گھنٹے سوؤ گے تو خواب ہی نظر آئیں گے نا، تین گھنٹے کی نیند میں مجھے تو کبھی خواب دکھائی نہیں دیا۔''

''ہاں ماما! مجھے تو خود کبھی خواب دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے ہاں تو تمام مرے ہوئے نانوں دادوں کی محفل رات بھر بجی رہتی ہے۔ Talk-tive, Lazy, Idle تا کام لوگ ہمیشہ فنتسی کا شکار رہتے ہیں۔''

امی حال کے عدسوں سے مستقبل کی نبضیں کمپیوٹر سکرین پر ٹٹول رہی تھی۔

''بھئی اب خواب تو رہنے ہی دو اِن غریبوں کے پاس، گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سردیوں کی لمبی راتیں گزارنے کو مستقبل کے منصوبے تھوڑی ہیں ان کے پاس، ان کی زندگی تو بس لمحہ موجود میں اُونگھتی ہوئی جمائی ہے۔ یا پھر ماضی کی جکڑن میں ٹوٹتی ہوئی انگڑائی ہے۔'' ناظم نے اردو اخبار کی دل دہلا دینے والی سرخیوں والے صفحے میں لمبی سی آہ لپیٹی۔ ''ابو تو ہر وقت انہی کے دفاع میں کھڑے رہتے ہیں۔ وہی ملتا ہے نا انسان کو جو جس کے لیے جتنی محنت کرتا ہے جو Deserve کرتا ہے۔''

''یہ دیہاتی پس منظر بھی نا، بندے کو بس جنگل جیسا فراخ بنا دیتا ہے اور پھر اُردو اخبار کے ریڈر کا گلا تو یونہی رندھا رہتا ہے۔''

نزہت کاغذات بیگ میں بھرتے ہوئے ان کے اہم پوائنٹس دماغ میں فیڈ کر رہی تھی۔

''ہاں ماما! مالی، باورچی، یا توتی ڈرائیور حد صفائی والی ماسی بھی ابو کے نیوز رپورٹرز ہیں، ڈیڈ! آپ کمپیوٹر کیوں نہیں سیکھ لیتے کہ پرفیکٹ نیوز امیجیلی لے لیا کریں، اب یہ اُردو پیپرز پڑھتا کون ہے؟ بیک ورڈ کلاس کے اموشنل فیڈرز۔''

''کالا باغ ڈیم یا پاکستان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' اس مضحکہ خیز منافقانہ بیان پر نگاہ جیسے جھلس ہی گئی۔

''ویسے تم لوگوں کی کلاس کا بھی عجب مسئلہ ہے۔ ہر وقت فلسفے گھڑتے اور نتائج اخذ کرتے رہتے ہو۔ اپنی ہی ذات کا طواف کرتے ہو اور سمجھتے ہو دنیا کی چھت ہمارے ہی کندھوں پر کھڑی ہے۔''

عامر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اُترا کوئی پھلانگنے والا کھلونا ہو جیسے جس کے ریموٹ کنٹرول کے آف والا بٹن خراب ہو گیا ہو۔

''عامر! ذرا بات سُن کے جانا۔''

''ڈیڈ! اب وقت نہیں بچا ہے میرے پاس صرف تین منٹ 42 سیکنڈ میں پہنچنا ہے۔ انٹرویو کال پر پہلا نمبر میرا ہی لکھا ہے اور پھر زن زن زنین، سیدھا اور ڈیو نیورسٹی وہ جیٹ طیارے کی طرح فضا میں تیرتا ہوا باہر نکلا۔ آواز کی رفتار اس کی اپنی رفتار سے پیچھے رہ گئی تھی۔

موٹر بائیک کی چنگھاڑ کے ساتھ ہاتھ میں پکڑا اسینڈوچ بھی اُس نے کھایا ہو گا یا کہ نہیں، ویسے تو یہ لوگ ایک وقت میں کئی کئی کام کرنے کے عادی ہیں۔ نزہت دستی آئینے میں لپ اسٹک لگانے کے ساتھ ڈرائیور پر برس رہی تھی۔

''پہلے سٹارٹ کر کے رکھا کرو اتنا وقت ہو تو خود ہی نہ چلا لیا کریں تمہاری محتاجگی کیوں لیں، کوئی کام بھی ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا سوائے آبادی بڑھانے اور بے کار گپیں ہانکنے کے، یہی کاہل، ہڈحرام کلاس ہی تو بوجھ ہے اس ملک پر......''

گاڑی شاید ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ڈرائیور سلف پہ سلف مار رہا تھا لیکن بدحواسی میں وہ سٹارٹ نہ ہو رہی تھی۔

وقت کی قلت صبر اور برداشت کو کھا گئی ہے، بے صبری، افراتفری اور غصے کا خام ڈیزل زندگی کی گاڑی کے دھویں اُڑا رہا تھا۔

نزہت کی کسی فارن ڈیلیگیشن سے اہم میٹنگ تھی۔ رات سے جو منٹس وہ تیار کر رہی تھی وہ ابھی جی ایم کو دکھانے تھے۔ ایمی کالج سے لیٹ ہو رہی تھی۔ ڈرائیور کی بولتی بند ہو چکی تھی، جس کے باتونی پن کی وجہ سے اُسے روز نکال دینے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں لیکن کمپنی کوئی ری پلیسمنٹ نہ بھیج رہی تھی۔ اسی لیے برداشت کیا جا رہا تھا۔

اُسے بھی اپنے کالج کے لیے نکلنا تھا، لیکن ابھی نہیں ڈرائیور سب کو چھوڑ چھاڑ کر واپس آئے گا تو اُسے لے جائے گا۔ رستے میں اُس سے باتیں بھی کرے گا۔ کس سڑک پر ایکسیڈنٹ ہوا۔ کیسا خوبصورت نوجوان زد میں آ کر کچلا گیا۔ کار چھین کر بھاگنے والوں کی خبر بھی اُس کے پاس ہو گی۔ گٹر میں

گھس کر نشہ کرنے والے بھی اُس نے واپسی پر دیکھے ہوں گے۔ کچرے کے ڈھیر پر نومولود کی لاش بھی پڑی تھی، جسے کتے سونگھ رہے تھے۔ پیٹرول کی مزید بڑھی ہوئی قیمت کی خبر بھی وہ لائے گا اور کہے گا۔

''پیٹرول تو قد نکالتی بیٹی کی طرح ہے، سر جی! جو رات رات میں بڑھتی ہے۔'' وہ جو اپنی دانست میں بڑی بڑی خبریں سنا کر ان حادثات سے بھی کہیں بڑے حادثے کا شکار نظر آتا کہ اونٹ جتنی خبر کا زیرہ برابر بھی کسی پر کچھ اثر نہ ہوا تھا، جیسے حیران ہو اس پہاڑ جیسی بے حسی کو کیسے جھنجھوڑ ڈالے۔ تب ناظم کہتا'' قادر ڈرائیور! تُو اسی لیے تو ترقی نہیں کر سکا کہ ابھی تک تیری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ اب خبریں نہیں رہیں بڑے شہروں کا معمول ہوگئی ہیں۔ اگر نہ بھی ہوں تو کسی کے پاس دوسرے سے متعلق کچھ سننے یا جاننے کا وقت ہی کہاں، اپنی ذات کی رفتار اور پھیلاؤ اتنے بڑھ چکے ہیں کہ دوسروں کی ذات اس کی اپنی زد میں آکر کچلی گئی ہے۔ اب تو دوسروں کے گلے شکوے اور ٹوہ کا وقت بھی نہیں بچا ہمارے پاس۔ بائیں ہاتھ والوں کی فوتگی ہوگئی تھی۔ اُس نے نزہت سے کہا بھی ہو آتے ہیں لیکن فرصت تلاش کرتے کرتے اتنی دیر ہوگئی کہ پھر جانا ہی بے کار لگا۔ اُس روز کریڈٹ کارڈ کا فارم بھرتے ہوئے دو پڑوسیوں کا نام لکھنے کی ضرورت پڑی تو اُس پر انکشاف ہوا کہ اُسے کسی ایک کا نام بھی نہیں آتا۔ تب قادر ڈرائیور ہی کام آیا۔ دائیں ہاتھ والے کی مشکوک حرکات پر توجہ دینے کی فرصت کس کے پاس تھی وہ تو اخبار میں پڑھا بڑا اسمگلر نکلا، جسے بند کرنے کے روز ڈراوے ملتے ہیں اخبار اور وہ بھی اُردو اخبار اس دور میں کون پڑھتا ہے۔ اُس نے کمپیوٹر سیکھنے کی کئی بار کوشش کی بھی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کوشش میں بد دلی تھی کہ دماغ میں پسماندگی کہ ایسے لوگ بیس پچیس برس کی عمر تک جو کچھ سیکھ پاتے ہیں پھر عمر بھر اُسی دائرے میں گھومتے رہتے ہیں۔ اسی لیے تو اُس کے پاس کافی وقت بچا رہتا ہے اور وہ خود بھی قادر ڈرائیور کی حیرتوں میں کبھی کبھی شریک کار بن جاتا ہے۔

ابھی اخبار پڑھ رہا تھا کہ صفائی والی آ گئی وقت کی افراتفری کا ثبوت آدھا گھر اُلٹا پڑا تھا۔ ماسی کے پاس بھی وقت کی تنگی تھی۔ کئی گھروں میں ابھی اُس نے مزید جانا تھا۔ البتہ خبریں اُس کے پاس بھی بہت تھیں بچہ بیمار تھا، بڑی لڑکی کا جہیز بنانا تھا، خود کو ڈاکٹر نے طاقت کی دوائیاں کھانے کا مشورہ دیا تھا۔

ماسی کی مانگنے تانگنے کی عادت سے گھبرا کر اُس کا دل چاہا وہ وقت سے پہلے کالج چلا جائے لیکن

وہاں بھی تو لوگ پیریڈ شروع ہونے کے پانچ منٹ بعد کمرۂ جماعت میں پہنچتے ہیں اور پانچ منٹ پہلے چلے بھی جاتے ہیں۔ سٹاف روم میں اگر کوئی بیٹھتا بھی ہے تو بس وہی جنہیں اپنے ڈاکومنٹس مکمل کرنا ہوتے ہیں۔ باہر کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کوئی ویزہ یا پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے یا کسی اورادارے میں ملازمت کے لیے۔ کوئی شخص بھی تو اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہ تھا۔ کسی کے پاس دوسرے سے بات کرنے کو وقت نہ تھا۔ خود وہ چاروں ایک کمرے میں گھنٹوں بیٹھے رہتے لیکن قلم کی گھسٹ، کمپیوٹر کی سوں سوں یا ٹی وی کی آوازوں میں کوئی زندہ آواز شامل نہ ہوتی تھی۔ وہ سوچتا اب تو بچوں کا شور بھی گھروں سے نہیں اُٹھتا۔ ٹی وی کی آوازوں سے نکلتا ہے۔ کہانی سننے کی ضد مووِیز کی پیشکش میں بدل گئی ہے۔ کارٹون چینلز نے کھیلنے کودنے کا وقت چھین لیا ہے۔ شاید اسی لیے تنگیٔ وقت کا شکوہ ہمارا محاورہ بن گیا ہے کہ ہم زندگی کو نہیں زندگی کے لوازمات کو وقت دینے لگے ہیں۔

ڈرائیور عبدالقادر اکثر پوچھتا ہے۔

''سر جی! یہ پڑھے لکھے لوگوں کے پیچھے وقت کا لٹھ کیوں لگا رہتا ہے۔'' وہ سوچتا ہے شاید یہ انٹلکچول اسٹائل بن چکا ہے۔ یہ انسٹنٹ ایج ہے جس میں انتظار کا لفظ خارج ہو چکا ہے۔ ہانڈی پکنے کا انتظار نہیں ہو سکتا۔ تیار برگر، سینڈوچ جگہ جگہ پڑے ہیں بلکہ اُس کے کھانے کا وقت بچانے کو فوڈ سپلیمنٹ اور وٹامنز زیادہ مفید ہیں۔ ڈائننگ نے گھروں کے باورچی خانے تو یوں بھی بند کر دیے ہیں۔ دودھ اُبل جاتا ہے۔ نوکرانی کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا وقت کس کے پاس ہے۔ ملک پیک خرید لیے جاتے ہیں۔ سالن جل جاتا ہے باورچی کو ہٹا کر ٹن کی خوراک اپنا لی ہے۔ نیند نہیں آ رہی کتاب کون پڑھے سلیپنگ پلز ہاتھ کی دوری پر موجود ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ قربت کے لمحات کو بھی وقت کی کمی نے ٹکینکی بنا دیا ہے۔

نزہت تو جھنجھلا جاتی ہے۔'' ارے کچھ کرنا ہے تو کرو ورنہ...... بے مقصد چھیڑ چھاڑ کا وقت نہیں ہے میرے پاس...... کل کی میٹنگ کے منٹس تیار کرنے ہیں ابھی، واشنگ مشین باہر لگی ہوئی ہے۔ ہانڈی چولہے پر ہے۔ تین گھنٹے کی نیند بھی پوری کرنی ہے۔''

وہ سٹنڈ ہو جاتا۔'' ارے اس میٹنگ کی تیاری کے لیے بھی تو کچھ منٹس تیار کرنے ضروری ہوتے ہیں نا۔''

اسی لیے تو قادر ڈرائیور کہتا ہے۔ ''سر جی اتنی مصروف اور تیز رفتار زندگی میں یہ موت سسری کیسے گھس آتی ہے۔ یہ بھی اس دَور کی تیزی کا شکار ہے پتہ ہی نہیں لگتا کب کس وقت کہاں سے چلی آئے۔ یہ بڑے شہروں کی زمین جو سونے کی دھات جیسی قیمتی ہوگئی ہے تو لوگ اپنے مردے کہاں دفنائیں گے۔ سر جی!......''

''ہاں عبدالقادر اب تو موت بھی انسٹنٹ ہونی چاہیے، بیمار کو سنبھالنا، عیادت داری اور پھر تکفین تدفین اتنا وقت کس کے پاس ہے۔''

''دفع کرو جی ایسی زندگی کو کیا کرنا جہاں موت بے حرمت ہو جائے۔ جہاں مردہ دفنانے والے نہ ملیں وہاں رہنے کا کیا فائدہ کبھی کوئی ختم درود، کوئی خوشی غمی پر کچھ آیا ہے گھر میں...... میلاد، شب رات، عید سب سوکھا ہی گزر جاتا ہے۔ اگر کچھ بٹنا بھی ہے تو بازار سے خرید کر۔''

اُس کی کتنی خواہش تھی کہ گھر میں ماں جی کی جمعرات کا ختم دلوائے لیکن نزہت اس رجعت پسند خیال پر خوب ہنسی تھی۔ ''ارے کچھ دینا ہے تو خیرات کے طور پر کسی مدرسے میں دے آؤ، جیسے میں ہر مہینے خاموشی سے کچھ نہ کچھ دے آتی ہوں۔ نمائش کا فائدہ۔''

''یقین کریں صاحب جی! اماں جی کو فوت ہوئے بیس سال ہو گئے کوئی تہوار ایسا نہ ہوگا کہ حاضری نہ دی ہو اور کوئی جمعرات ایسی نہیں کہ ختم نہ دلایا ہو۔''

نزہت ہوتی تو اُسے جواب دیتی۔ نا تو اور تمہاری زندگی کا مصرف ہی کیا ہے۔ بیکار فنتسی، ناظم نے سوچا ہمارے تو بزرگ بھی نئے دَور کے تقاضوں کو سمجھ گئے ہیں۔

اماں جی بمشکل ایک ہفتہ بیڈ پر پڑی تھیں کہ اُن دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ قصور نزہت کا بھی نہ تھا۔ اُس کے اوقات میں سے دس منٹ بھی نکل آنا مشکل تھا اور وہ خود پریشان تھا کہ اب تو زندگی کے لیے وقت نہیں بچا۔ موت کی نگہداشت کون کرے گا، اماں جی نے اُس کی پریشانی دیکھ کر تسلی دی تھی۔ گھبراؤ نہیں تمہاری مجبوریاں سمجھتی ہوں، اگلے ہی روز جب وہ ذرا دیر سے گھر پہنچا تو وہ پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھائے بڑھائے پیاسی ہی سو گئی تھیں جیسے سروائیول آف فٹ ایسٹ کے اصول کی علامت بن گئی ہوں۔

ایمی ایف ایس سی کے میرٹ کی جنگ لڑ رہی تھی، جس کا بڑا ہتھیار وقت ہی ہوتا ہے جس میں

اکیڈیمیاں، ٹیسٹ، تعلقات سب جھونک دیئے جاتے ہیں۔ ناکامی کی صورت کے لیے کوئی ایک کشتی بھی تو بچا نہیں رکھی جاتی۔

عامر کسی امریکن یا یورپین یونیورسٹی سے اسکالرشپ کی اُمید میں پورا دن انٹرنیٹ کی لہروں پر سوار رہتا۔ اگرچہ کسی کے رویئے میں کوئی بے حسی، لاپرواہی یا اُکتاہٹ ہرگز نہ تھی۔ پر اماں جی سمجھتی تھیں کہ قصور ان بیچاروں کا نہیں اس دَور کی تنگیٔ وقت کا ہے، جو کسی تیز رفتار گاڑی میں بھرے ایندھن کی طرح پھونکا چلا جا رہا ہے۔

وہ کار پورچ کے ساتھ ذرا سے لان میں بیٹھا خود کو نیچرل لائف کے قریب محسوس کر رہا تھا۔

عبدالقادر گاڑی دھوتے ہوئے کسی جواب کے انتظار کے بغیر بولتا چلا جا رہا تھا کہ اب تو جواب دینے کی عادت بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔

''سر جی! آج شب رات ہے۔ عامر بابو کے لیے شرلیاں نہ لے آؤں۔''

اُسے بے تحاشہ ہنسی آئی۔

''ارے عامر شرلیاں چلائے گا، وہ تو خود ہَوا میں اُڑتا ہے تو وقت کی کمان میں خود کو کس پاتا ہے۔''

''ویسے سر جی! ان تہواروں سے ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بچے جڑے رہیں تو زمین سے جڑے رہتے ہیں ورنہ ان کے پیر اُکھڑے رہتے ہیں۔'' اُس نے گلاب کے اکلوتے پھول کو دیکھا جس پر سے تتلی اُڑی تھی۔ اب تو تتلی بھی نظر آتی ہے تو ٹی وی سکرین پر، پھول بھی مسکراتا ہے تو کمپیوٹر میں، پرندے کی چہچہاہٹ سنی جاتی ہے تو موبائل کی گھنٹی پر۔

''ارے قادرے! اب تو لوگوں کے پاس پورا لفظ بولنے کا وقت نہیں بچا ہے۔ بیسیوؤں وٹامنز سے بھرے کیپسول کی طرح عمر کا عرصہ بھی اک نقطہ سا لگتا ہے زندگی تیز رفتار ہوئی ہے کہ عمر برق رفتار ہو گئی ہے۔ نام تک سکڑتے سکڑتے بس اشارے ہی رہ گئے ہیں۔ خود اُسے بچپن میں ناظم الدین کہا جاتا تھا۔ نوجوانی میں ناظم ہو گیا۔ نزہت نے نازی بنا دیا۔ وہ فارغ الذہن والی ہنسی ہنس دیتا۔ ارے اب میں نے ایسا کون سا ظلم ڈھایا ہے تم پر جو نازی کا لقب دے دیا ہے۔ مختصر سا ایمن مزید سکڑ کر امی رہ گیا۔ نزہت، نزی ہو گیا عامر عمی ہو گیا۔ بعض اوقات یہ سب ایسے گڈمڈ ہو جاتے کہ سمجھ ہی نہ لگتی کہ کون کس کو

پکار رہا ہے ناموں کی تذکیروتانیث ہی ختم ہوگئی تھی۔

انسانوں کو بھی نمبر الاٹ ہو جانے چاہئیں، جیسے درختوں، گھروں اور قیدیوں کے نمبر ہوتے ہیں، پہچان کے لیے۔ تب وہ خود کو بے کار سا سمجھتا ہے جسے کمپیوٹر نہ آتا ہو جس کے پاس باتیں سننے اور کرنے کا وقت بچا رہتا ہو۔ وہ اس دَور کی مشین کا ناکارہ پُرزہ ہی ہوا نا۔ تبھی ساتھ والوں کی ماسی شب برات کا حلوہ لے آئی تھی۔

قادر نے پلیٹ پکڑ کر اُس کی گرم سوندھی واشنالی۔

''ماسی! بڑی مہربانی تیری تو حلوہ لائی تو شب رات کی بھی کچھ عزت رہ گئی ورنہ بیچاری رات بھر کی مہمان کس کے گھر جاتی۔ سارے دروازے تو سرِ شام بند ہو جاتے ہیں۔ ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ رحمت کے فرشتوں پر بھی بند کر دیے جاتے ہیں۔ ویسے صاحب جی! آج ہلکا سا چراغاں نہ کر دیں گھر پر بچے دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔''

''ارے قادرے! اب بچوں کی خوشیاں ایسی ذرا ذرا سی نہیں رہ گئیں۔ چراغاں تو ہر شاپنگ مال پر پورا سال رہتا ہے۔ اتنا سب کچھ اتنی شکلوں اور افراط میں موجود ہے کہ تسکین کی خوشی ہی جاتی رہی ہے، اب امریکہ یا یورپ کا ویزہ مل جائے یا کروڑ دو کروڑ کی لاٹری نکل آنے کی خبر ہی شاید خوشی کا اشارہ دے سکے۔ اب تو بچوں سے یہ خوف بھی جاتا رہا ہے کہ وہ کسی عاشقی معشوقی کے چکر میں گرفتار ہو جائیں گے۔ خط لکھنا، آہیں بھرنا، چوری چوری فون کرنا۔ ارے اب ایسا سلوموشن کا دور کہاں ہر قسم کی جنس ایک بٹن کے فاصلے پر موجود ہے۔ چیٹنگ اور ڈیٹنگ سے لے کر XIII تک، اب ترساؤ کا زمانہ نہیں بلکہ سیری کی بدہضمی ہے۔ جا جا اُبکائیاں، الٹیاں، اسہال پھیلے ہیں۔ خوشی کے لوازمات کی کثرت خود خوشی کو ہی نگل گئی ہے۔

قادر نے پلیٹ اور چمچہ اُس کے سامنے رکھا۔

''سر جی! چکھیں تبرک ہے۔''

''اے میں یہ حلوہ کھاؤں گا......''

''سر جی! یہ نیاز نہ کھانے کی سزا ہے کہ پورا سال نعمتیں امیروں کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں لیکن اُنہیں منہ میں رکھنے کا حکم ربی نہیں ہوتا۔''

ارے قادرے ڈرائیور! بس تیری چھٹی ہونے والی ہے۔ انہی باتوں سے تو...... تیرا تو نام ہی مس فٹ ہے۔ ایسے پھیلاؤ والے نام کی تو آج کے گلوبل ولیج میں جگہ ہی نہیں بنتی۔ ''عبدالقادر'' اسی لیے تو ایسے سب نام بھلا دیئے گئے ہیں۔ بس ماسی، مالی، کک، ڈرائیور کے سائن دے دیئے گئے ہیں۔ تُو بس اپنے سائن کی زبان ہی بولا کر چھوٹے منہ سے نکلے یہ بڑے بڑے فلسفے ہضم نہیں ہوتے۔

''ویسے صاحب جی! آپ عامر بابو پر نظر رکھا کریں۔ بہت تیز رفتار بائیک چلاتے ہیں۔ سڑکوں پر تو آندھی چلی ہے، جس میں انسان روڑوں، گیٹوں کے چھٹوں کی طرح اُڑ رہے ہیں۔ کوئی جتنا تیز بھاگے گا اتنا ہی گرنے کا خطرہ زیادہ، ست رفتار تو گر کے بھی سنبھل جائے گا۔ ویسے جتنی جلدی پینڈا مک جائے سر جی! اتنی جلدی بندہ بھی فارغ۔ تو پھر وہ کیا کرے گا......؟''

''ویسے قادر باتیں تو بڑی گہری کرتا ہے۔'' وہ کئی بار بچوں سے کہتا۔ ان لوگوں کی بات پر دھیان دیا کرو یہ خام دانش کے ذخیرے ہیں۔ انہی کو پالش کر کے آرٹیکل لکھو، اور انٹرنیشنل جرنلز میں چھپواؤ، تمہارے علم اور نظریات کا شہرہ پھیل جائے گا۔

وہ تیار ہونے کے لیے اُٹھا کیونکہ وہ ایک وقت میں ایک ہی کام کرنے کا عادی تھا۔ اسی لیے وقت سے پہلے اُٹھ گیا۔ قادر کی آواز پیچھے رہ گئی۔

''سر جی! یہ بڑے لوگ بولتے کیوں نہیں ہیں زبان جڑ نہیں جاتی تالو سے، پھپھوندی نہیں لگ جاتی دماغ کو بس پڑھو کمپیوٹر پر بھی پڑھو، ٹی وی پر سنو، کی بورڈ پر لکھو، حد دیکھیے عورتوں نے چغلیاں تک چھوڑ دی ہیں۔ بس وقت ہی نہیں رہا اُن کے پاس۔ کل جگ ہے سر جی! جب مرغی اذانیں دینے لگے اور کتے بھونکنا چھوڑ دیں تو پھر سمجھو کہ بستی پر آفت آنے والی ہے، یہ اتنی تیزی اور لاغرضی مرن مٹی ہوتی ہے۔ لگتا ہے دنیا جلدی مر جائے گی مرن مٹی اُٹھا رکھی ہے اس نے کیا پتہ کوئی قیامت ہی......''

اُسے پھر ہنسی آ گئی اگرچہ اس درجے کے کسی شخص کی بات پر اگر وہ نزہت کے سامنے ہنس دیتا تو وہ اُس کی Low Mentality کا ماتم کرتی۔ ''قادر یار! قیامت کی سوچ کا وقت کس کے پاس ہے بس یہ تو ناکام لوگوں کے کھلونے اور بہلاوے ہیں، جنت، دوزخ، اگلا جہان، اب تو یہیں سب کچھ موجود ہے۔ یہی تو دوڑ لگی ہے انسانوں کے بیچ۔''

تبھی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اطلاع دینے والے کو بھی بڑی جلدی تھی۔ قیامت کا صور ایسے ہی

پھونکا جیسے بس ریڈیو پر خبر پڑھ دی ہو۔ وہ چیختا رہ گیا۔ کب، کہاں، کیسے۔''

لیکن انفارمیشن فیڈ کرنے والے کمپیوٹر کی بیٹری شاید لو ہو گئی تھی۔ یا شاید اتنا ہی فیڈ کیا گیا تھا اُس کے اندر، اُس روز قادر نے سب گاڑیوں سے زیادہ تیز گاڑی بھگائی تھی، پھر بھی پیچھے ہی رہ گئے وہ جب پہنچے تو پہچان کا ٹیگ نمبر لگ چکا تھا۔ عامر کا اکیس نمبر تھا جو اُس کی اکیسویں سالگرہ سے صرف دو دن پیچھے تھا۔ پر وہ یہ دو دن بھی انتظار نہ کر سکا تھا، نئے دَور کی تیزی تو وہ خمیر میں لے کر پیدا ہوا تھا، اُس نے چلتے وقت بھی تو یہی کہا تھا۔

''ابو جی! وقت نہیں بچا ہے اب میرے پاس۔'' اُس کے پاس صرف تین منٹ اور بیالیس سیکنڈ کا وقت تھا لیکن سامنے سے آنے والی بس کے پاس شاید دو منٹ بیالیس سیکنڈ کا وقت تھا۔ ایک منٹ کی تنگی بیالیس سیکنڈ کو مات دے گئی۔ یہ سروائیول آف فٹ اسٹ کا دَور ہے۔

وہ کہ جس میں زندگی پوری توانائی اور رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ وہ یکدم ایسے سڑک آف ہوئی جیسے جیٹ طیارہ کریش ہو جائے۔ اُسے لگا وہ یہ خبر نشر نہ کر سکا تو وہ پھٹ جائے گا۔ اُس کے پورے وجود، دل، دماغ سے کہیں بڑے سائز کی خبر تھی، جو اُس کے اندر کسی طرح بھی سما نہ پا رہی تھی۔ کبھی دل کے ایک دو توپے توڑ دیتی، کبھی دماغ کی سلائیاں اُدھڑنے لگتیں، کبھی بدن چھدنے لگتا، کبھی ہڈیاں تڑخنے لگتیں۔ وہ اکیس نمبر کے سرہانے بیٹھا دو گھنٹے تک وقت کے کند دندانوں تلے سلتا اور اُدھڑتا رہا اور ٹیلی فون پر مختلف نمبر گھماتا رہا، وہ تھوڑا تھوڑا پھٹ رہا تھا اور جو بھی چھیدوں، سوراخوں، موریوں میں سے نکلتا ریسیور کے دوسرے اینڈ پر منتقل کرتا چلا جا رہا تھا۔ پر اُسے وصولنے کو کسی کے پاس گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ کہنا چاہتا۔ سنو کتنی بڑی خبر ہے۔ اتنی بڑی خبر تو آج تک روئے زمین پر بنی ہی نہیں ہے۔ سنو دنیا کی سب سے اہم خبر، سب سے المناک خبر، لیکن سننے والے مصروف تھے۔ کچھ شہر سے باہر تھے کچھ ملک سے باہر۔ اُن کے پاس سننے کے لیے بس اتنا ہی وقت تھا جتنا ٹی وی کی خبر سننے کے لیے یا اخبار کی سرخی پڑھنے کے لیے......

اس خبر کو اگر پوری دنیا میں بھی تھوڑا تھوڑا تقسیم کر دیا جائے تو پھر بھی اُس کی جھولی میں منوں ٹنوں وزن پڑا رہ جائے گا، البتہ امی اور نزہی منہ میں انگلیاں ٹھونس اس منوں وزن کے بڑے بڑے باٹ اُگل نگل رہی تھیں۔ کھربوں ٹن ملبے تلے دبے دبے جب اُن پر کئی گھنٹے گزر گئے تو اس زمینی حقیقت کے

کئی لرزتے ہوئے کمزور ستون اُن پر آن گرے کہ یہاں کوئی ریسکیو ٹیم نہ پہنچے گی اُنہیں خود ہی اس ملبے کو اپنے چور چور وجود سے ہٹانا ہوگا۔

غسال کا انتظام، کفن کی سلائی، گورکن، مولوی، جنازہ، تدفین ارے انسان مر کر بھی کتنے کام کرنے کو چھوڑ جاتا ہے۔

اگر وہ یہ انتظامات کرنے کو نکل جائے گا تو پھر صفِ ماتم پر کون بیٹھے گا، پُرسے کے لیے آنے والے افسوس کس کے پاس کریں گے لیکن صفِ ماتم بچھی کہاں تھی۔ کوئی آتا تو صف بچھتی، ورکنگ آورز تھے ویک ڈے تھا۔ موسم بھی کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ فاصلے زیادہ تھے۔ مصروفیات بے انتہا تھیں۔ زندگی کے لیے وقت نہ تھا۔ موت کے لیے کہاں سے کوئی نکال لاتا۔ ایمی اور نزہت عامی کے شارٹ کٹ پر ابھی اندر ہی اندر اُبل رہی تھیں۔ ان کی بند چمنیوں سے بھاپ خارج کرنا ضروری تھا۔ جتنا بوجھ ان کے اندر بھرا تھا۔ اُسے سمانے کو کہیں کہیں سے کٹ لگا کر گنجائش بنانے کی ضرورت تھی۔ جب کام والی نے ٹی وی لاؤنج میں رکھی عامر کی میت کو دیکھ کر چنگھاڑ ماری اور نزہت کے گلے لگ بین کیا تو نزہی اور ایمی جیسے پوری کی پوری اُدھڑ گئیں، اندر کا بوجھ ادھر ادھر بکھر گیا، چھرے، گولیاں، دُور دُور ہدف کر گئے۔ اردگرد کی کوٹھیوں میں کام کرنے والی ماسیاں اکٹھا ہو گئی تھیں۔ کوئی مسجد سے صف بھی اُٹھا لائی تھی اور عامر کی چارپائی کے گرد بچھا دی تھی، جس پر بیٹھی وہ بین کرتی تھیں اور نزہت غش کھا کھا کر گرتی تھی شاید پانی پلانے والیاں موجود تھیں ورنہ پچھلے دو گھنٹے سے تو وہ خود کو اپنے ہی حصار میں سمیٹے بت بنی بیٹھی تھی کہ ذرا سی ہلی نہیں کہ کچی فصیل کی اینٹیں دھڑ دھڑ اُسی کو ہدف کرنے لگیں گی۔

پر وہ ابھی وہیں گم سم بیٹھا تھا۔ ایک بار پھر اُس پر یہ حقیقت بم کی طرح پھٹی تھی کہ اُس کے پاس ماتم کا وقت نہیں ہے بلکہ جوان بیٹے کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے اَن گنت انتظامات کرنے باقی ہیں۔ اب انتظار کس کا تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی مصروفیت کی ڈور سے بندھا اپنے ہی کھونٹے کی سمت کھنچ رہا تھا۔ دوستوں، عزیزوں کے کرنے والے سارے کام اب اُسے خود کرنا تھے۔ قبر کی جگہ کا حصول، کفن کے لیے درزی کی تلاش، غسل کے لیے جنازے کے لیے، کتنے ہی افراد کا بندوبست کرنا تھا۔ جبکہ وہ کسی سے بھی واقف نہ تھا۔ اب جب کچھ نہیں بچا، تو اک عجب سی خواہش نے سر اُبھارا تھا، اُس کا جنازہ ایسا شاندار اُٹھے کہ مدتوں یادگار رہے جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوں۔ جنازہ بھاری اُٹھنا چاہیے لیکن

یہاں تو...... وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ باہر قادر ڈرائیور کے پاس اردگرد کی کوٹھیوں کے ڈرائیور، مالی، چوکیدار افسوس کے لیے جمع تھے۔ اُسے دیکھ کر وہ سب بھیگی آنکھوں کو صافوں سے پونچھنے لگے لیکن ناظم کے پاس افسوس کے اشتراک کے لیے اب وقت نہ بچا تھا ڈاکٹر نے کہا تھا تدفین میں دیر نہ کیجیے گا پر وہ پہلے ہی بہت دیر کر چکا تھا پتہ نہیں کس موہوم اُمید پر۔

اُس نے قادر سے کہا'' گاڑی نکالو۔''

'' کیوں صاحب جی! آپ بیٹے کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے۔''

اُس کے چہرے کی بے بسی کو اُنہوں نے خود ہی زبان دے دی۔

غالباً وہ ساتھ والی کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ ہاتھ میں پکڑے سیاہ شاپر کو اُس کے سامنے پیش کیا۔

'' صاحب جی! ابھی کچھ دنوں پہلے ہی مکہ شریف سے منگوایا ہے چھوٹا بیٹا وہیں ہے نا۔ خاکِ پاک سے کلمہ شریف لکھا ہے اُوپر۔ باری میری تھی۔ پر بیٹا بازی لے گیا۔''

چوکیدار کا گلا رُندھ گیا تھا۔ اطمینان کی لہر سی الم کی چادر پر سرسرائی۔ دُکھ کے باٹ بدن میں ہموار ہونے لگے۔ اُس وقت ناظم حقائق کے خوفناک جبڑوں میں ہاتھ دیئے میکانکی سا ہو گیا۔

'' پر غسال۔''

''غسل ہم خود دیں گے اپنے بیٹے کو۔''

وہ پانچوں آنسوؤں سے وضو کرنے لگے۔

زمینی حقائق رومانی کرب پر غالب آ رہے تھے۔

'' قبر اور جنازہ بیس پچیس لوگ تو درکار ہوں گے پر یہاں تو......'' تبھی نزہت فون پر کئی گھنٹے ریسکیو کی تلاش میں ضائع کرنے کے بعد آپ ہی اپنے بوجھ سے باہر نکلی۔

اُسے دیکھ کر روحانی کرب زمینی حقائق پر غالب آیا۔

'' میت کو اکیلا چھوڑ آئی ہو؟''

''نہیں ماسیاں بیٹھی ہیں اُس کے سرہانے لیکن تم کیا کر رہے ہو، چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ لڑکے کا رنگ بدل رہا ہے۔ ڈاکٹر نے......''

بے بسی متشدد ہو جایا کرتی ہے۔ قادر نے وضو کے لیے چڑھائے کف کھولے۔

''سر جی بیس پچیس بندے ارد گرد کی کوٹھیوں کے چوکیدار، ڈرائیورز...... ہم خود ہی ہو جائیں گے۔ پر بیٹے کا جنازہ تو شان سے اُٹھنا چاہیے، جس شان سے وہ جوانی چڑھا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں اگر آپ پسند کریں تو ادھر ہماری بستی میں کئی بستیوں کے لوگ مل کر جنازہ پڑھیں گے، سر جی! اور پھر قبر کی جگہ بھی اپنی پسند کی، گورکن اپنا بھائی ہی سمجھیں۔ سر جی! میڈم جی! اگر آپ پسند کریں......''

ناظم نے نزہت کو دیکھا اُس کی آنکھوں میں جھلملاتے شیشے جیسے بے بسی کی آب میں ڈھلک گئے کہ ماتم کے لیے بھی تو اک ذہنی فراغت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

آپاں

چاندنی سے لبالب چھلکتے انڈ تے چکنی مٹی کا پوچا (روغن) پھرے آنگنوں میں قلعی کی ڈلی حرارت پا کر گھلی۔

اُک دیاں لکڑاں کڑک دا تیل
آ جاوٗ سہیلیو کھیڈن دا ویل

چاندی کے بجروں سے ہرنیوں کی ڈاریں پھلانگیں، کلیلیں بھرتی، اڑ نکلے مارتی چنگیاں نبو کے لگاتیں آبادی سے پَرے کھیتوں سے ادھر چاندنی سے اٹا اٹ میدان میں سونے کے تار جھلملا گئے۔ رنگ برنگی اوڑھنیاں چاند کے نہروں بہتے دودھ میں بھیگ گئیں جیسے ابرق لگا ہو۔

''آوَنی سکھیوَ! گدا ناچیں۔''

تاروں کی قوسیں اور جھرمٹ چھاجوں برستے نور میں لتھڑ پتھڑ، چاندنی کی چلیاں (منھیاں) بھر بھر تالیاں بجانے لگیں۔ نیچوں بیچ بجو اور کولو کمر کو خم دے پیروں کی تھاپ کے سنگ ہتھیلیوں کی کسڑ رر کسڑ رر ملاتیں گدِ اڈالتیں ایک دوسری کو بغل سے کاٹتیں، گھوم کر پھر آمنے سامنے آتیں، اوڑھنی میں لپٹے لمبے پراندے بل کھا کمر پہ جھولتے پٹخنیاں کھا گلے سے لپٹتے۔ قدم ایک گول چکر میں تیز تیز تر ہو گئے۔ کمروں کے خم گولائی میں مڑ گئے۔ ''کو کو کو کو۔''

آٹے کی چکی کی آواز مُنہ سے نکالتی ہاتھوں کی مٹھیاں کسے بنا ایک دوسرے سے گھسیڑتی پڑ میں کھڑی گڈے کا اختتامی ناچ سب مل کرنا چنے لگیں۔ میلوں اُٹھتی گرد چاند کی چلمن ہوگئی جس میں ذرا ذرا افشاں کتری گئی۔

کولاں کی چیخ نے ہونٹوں کی قوس سے نکلتی آٹے والی چکی کی ''کو کو کو'' اور مٹھیوں کی کسور ر کسور ر کو گڈے کے پڑ میں ساکت کر دیا۔

''نی گدھیو! میرو کدھر کو گئی۔''

گڈی نے بُکل کی اوٹ میں ناک چھپائی، جس کے پیالے سے نتھنے پہ پھیلا گہرے زخم کا نشان کھائی سی بن گیا۔

''میرو گئی جدھر کو جاتا تھا۔ اُدھر کو گئی کوئی پہلی بار گئی۔''

چاندنی کے ترچھے لہراتے پردوں میں لپٹے اوکاں اور ون کے جھاڑ اور فصلوں کے گنجان ذخیروں میں بکھرتی نقرئی پھوار میں نظروں کے کھوجی سب رستے بنا گئے۔ سارے گھر سے گڈی کے چہرے پر گُھدے مندمل زخموں کے گہرے نشانوں اور ادھ بھرے گڑھوں میں اُترتے تھے جو بُکل میں مُنہ لپیٹے کھر کھر ہنستی تھی، نشان اور گڑھے مُنہ کھولے ہو نکلتے تھے۔ ''یہ کوئی نویکلی (نئی) بات ہے۔ ازیو! کل اوڑے ویلے (پچھلے پہر)...... چوبارے پہ کھڑا صوبے دار کا لونڈا...... نیچے گلی سے گزرتی پر سگریٹ کا ٹوٹا بجھا کر پھینکا، اشارہ دیا، جھنڈ کی ڈونگی ساول میں ملاقات کا...... وعدہ...... بھلا گڈی سے کون چھپا ادھر گڈے کی دھول آسانی چڑھی۔ اُدھر میرو کی دوجی اڈی (دوسری ایڑھی)، انے جنڈ (چھتنارے) کی داڑھی پہ پڑی۔''

لڑکیاں ہنسیں اور چاندنی کے گالے اُٹھتی چھنتی دھول میں تلے کے گوکھڑو پرو گئے۔ ریت کے ذرے اور کانچ کے ٹوٹے شعاعیں چھوڑنے لگے۔ جھل مل چتکبری سولوں (کانٹوں) کا مورچھل کھینچتی سبہ اور روئی کے مٹھے سے خرگوش چاندی کی پرات سے میدانوں کے بیچوں بیچ دوڑتے، لالو لال پھولوں سے بھری کریوں میں اُتر گئے جن سے پرے ہرے کھیتوں کے بیچ الاؤ میں گرتی چاندنی کی آبشار میں شعلوں کے لال چہرے دودھیا ہو گئے تھے۔ اچھو نے نقرئی دہک والا کوئلہ پوروں سے اُٹھایا۔ چلم میں رکھا، سلفے سے دھوئیں کے ابر یئے اُٹھے اور چاندنی میں گھُ دودھیا ہو گئے۔

''چاچا گلو! پنڈ (گاؤں) میں بڑی خرابی آئی۔''

گلو نے کھیتوں کی ہریاول پر چاندنی کی پھوار کو دبے پاؤں اُترتے ہوئے دیکھا۔

''ناوہ کیسے اسلمیا!''

''کنک دیکھ چاچا! ایک ایک مٹھ پر تیرہ تیرہ سٹے۔ یہ سٹہ۔''

اسلم نے کہنی تک بازو پر دوسرے ہاتھ کی پوریں رکھیں، ''اور دانہ کنک کا نہیں پیلوں کا لگے۔ یہ موٹا...... نہری پانی پی پی پلا ہُوا۔ اس سال دکن خوب چلا۔ مینہ ویلے سر (بروقت) برسا، نہروں میں بندیاں گھٹ ہوئیں۔ سجھو کمیوں کے بھڑولے بھی مُنہ تک آ گئے۔ اس سال سارا علاقہ ٹوکریاں، چھابڑیاں، کڑاھیاں چھوڑ درانتیاں پکڑ، واڈی (کٹائی) پر ٹوٹ پڑے گا۔''

''پر یہ ہے بڑا فساد۔ جٹ زمیندار کا بھرا پیٹ اور بھرا کھیسہ فساد ہی تو ہے۔ ننگی برچھی کی طرح ہر ایک سے کھیتا پھرتا ہے۔ روز پر یا پنچائیت، تھانہ کچہری۔ جب کھیسوں اور ڈب کی گٹھڑیاں ٹھس کر پھنڈر بھینس کے تھنوں کی طرح نچڑ جائیں تو پھر قرضے میں جکڑا بال بال چھڑانے کو مٹی کے سینے میں شہ زوری اور جوانی کھودنے لگتا ہے۔''

اس نے بھڑکتی آگ پر سنہرے سردے کا پورا بوتا لیٹا دیا۔ بھڑ بھڑ پورے کا پورا یکبارگی جلا۔ چاندنی کے گھونٹ بھر بھر شعلے سُرک سُرک نکلے۔

''تیری بات سولہ آنے کھری الٰہی...... پر مجھے اس سے بھی بڑا خطرہ سُنائی دے رہا ہے۔''

''وہ کیا چاچا۔''

اسلم اور الٰہی دونوں نے چاندنی کی برف سی قاشوں میں لپٹی گیہوں کی سنہری پڑتی بالیوں کو دیکھا۔

''سُن، سُن ذرا......''

بہک میں بیٹھے کسانوں نے کانوں سے مولھیں ہٹائیں، حقوں کی نَے ہونٹوں سے الگ کر خطرے کی آواز کو بھانپا اور سانس اندر کھینچ کر بُو کو سُونگھا۔

ساڈی کدھی توں ماری او اکھ وے

ساڈا دل تیرے نال جتھ وے

ساڈی کدھی توں ماری او چھال

اڑ گئے چھتے ترٹ گئے وال

گیت کی لے اور تالیوں کی دھمک چاندنی کے وفور میں گتھی بہے چلی آتی تھی۔

"اس فصل کو بھی اب کی بار بڑا اجھاڑ لگا۔کوئی گھر کوئی بہنی نہیں بچی جہاں کوئی لڑکی،مٹیار نہ ہوگئی ہو کوئی لڑکا گبھرو نہ ہو گیا ہو۔"

"ہاں چاچا! پر جس طرح گاموآرائیں اور اکرم ساہی کی فصل سارے پنڈ کی موری ہے۔اسی طرح مریاں چدھڑن اور کولاں آرائین سارے پنڈ کی مٹیاروں کا سرا ہیں اور جس طرح احمے مسلی کی فصل میری جوتی کے قد کی اور دمی سٹی میرے قد کے برابر ہے۔نانواں نانواں سٹ، پاڑو پاڑ۔اسی طرح یہ کنڈی گجری اک گٹھ تے اک منھ (بالشت بھر) چھید و چھید، نزار ید کھوند۔"

بہک کے مردوں نے باری باری نے منہ سے لگا اُگلی۔دبی ہنسی کی سسکار سُوٹوں میں چھوڑ دی۔

"ورلی فصل اور کوڑھی جوانی پنڈ کا بھلا ہے۔بھرویں فصل اور بھرواں حُسن بڑا فساد ہے اسلمیا دیکھو دیکھو"

بہک کے مردوں نے منہ میں نے دبا حقے کے چندے کی گڑگڑاہٹ چوس لی۔بھوسے کے اوھڑے ڈھیر کے ادھر کوئی موبل مارے چاند کی چلمن سے لگا گِدے کے پڑ میں جھانکتا تھا۔

مردوں کے چہرے گردنوں سے ہاتھ ہاتھ بھر آگے بڑھ ایک دوسرے سے گھسر گئے۔

"حکیموں کا عمران لگتا ہے۔دیکھو کس کی تانگ میں بیٹھا ہے۔کس کی......؟"

"کولو آرائین اور کوئی بھی نہیں۔"

اسلمے نے جلتی ہوئی لکڑیوں کو آپس میں مار مار انگارے جھاڑے۔کڑکڑکی آتشیں آواز عمران کو دھڑکی اُدھڑی ہوئی کھوہ میں رگید گئی جس پر گِدا اڈالتے درختوں کے جھنڈ کا سایہ گتھ گیا تھا۔پر چاندنی کی باڑھ سارے بند توڑ سب ہموار کر رہی تھی۔پتوں کے سائے کا جال چھدرا ہو گیا تھا۔گِدے والے پڑ (دائرے) کے وسط میں ناچتی لڑکیاں کولو کی ماں کی دہائی سے ساکت رہ گئیں۔

"نی کولو کدھر کو گئی نی کولو....."

ناچنے والیاں گدّے کی ادھوری تال میں اکڑوں ہوسیدھی ہونے لگیں۔

''ابھی تو ادھر تھی۔کدھر گئی......ابھی تو......'' چاندنی میں نہائے ٹیلے کے وسط میں چوہوں کے بلوں میں سے دھول اُڑتی تھی۔

''ابھی کب وہ تو گئی کب کی......گئی......''

گڈی اکڑوں بیٹھ دھول میں دبی ٹھیکریاں پھرولنے لگی جن پر جمے ریت کے ذرّے تاروں سے چمکتے تھے۔

''اڑیو! جب دوجی بولی کا نذر کھا میں نے۔سوٹی سوٹی......نالے منڈارات رہ گیا نالے دے گیا چوانی کھوٹی......اُسی وقت تو کولو کا پیر پڑے سے پھسلتا بنے سے اُکھڑتا غڑاپ جنڈ کی ڈونگل میں۔''

کولو چاندنی کی اوک میں سے نکلی۔

''کیا ہوا امی۔''

امی نے دو ہنٹروں کا مینہ برسا دیا۔

''نی تو کہاں گئی کس خصم کو ملنے گئی۔اڑیے بتا مجھے، کون ہے وہاں چھپا...... جہاں سروٹے ہلتے ہیں اور پاندے کھڑکتے ہیں۔''

''امی! مَیں تو جھاڑا پھرنے گئی تھی، ادھر......'' گاؤ دم دودھیا کلائی پر چھنکتی لال چوڑیوں کی درجن گھٹ کر آدھی رہ گئی تھی۔امی نے کماد کے سرسراتے پاندوں میں جھاڑے کی بُو سُونگھی اور سروٹوں میں سے بھاگتے ہوئے چوہوں کی دھڑ دھڑ سنی۔

''نی کتنی بار کہا بتا کر جایا کر......مَیں تو فکر میں پڑ گئی۔سو بھگیاڑ سو باہر لا......'' (بھیڑیئے، سوّر)

امی کولو کو بازو سے پکڑ سمیٹ کر چلی۔

گڈی کا قہقہہ ساری بھکوں میں پھر گیا۔

''جھاڑا پھرنے گئی تھی۔جھاڑا ہی تو پھرنے گئی تھی اڑیو۔تبھی تو ماتھے پہ جمی بالوں کی پٹی آلا نہ ہو گئی ہے اور چوڑیوں کی درجن......''

لڑکیاں اور مائیں گڈی کے گرد حلقہ بنا گئیں۔

گڈی نے دانتوں تلے دبا سیٹی سا سانس باہر کھینچا۔

''تمہیں پتہ تو ہے میری اور اُس کی چنی (اوڑھنی) ایک جیسی کیسری رنگ کی ہیں۔ کل سویرے ویرے (بھائی) کی روٹی لے، یاراں مربعے کو گئی پیچھے پیروں کی چپ چپ دیکھوں تو حکیموں کا چھوکرا عمرانو، کھرے پہ کھرا دھرے۔ کچھ دور تک تو کبھی اپنی راہ پر ہے پر پھر چنی (اوڑھنی) یاد آئی اور کولو بھی۔ مڑ کے سیدھی کھڑی ہوگئی۔ گھوری ڈال کے کہا۔''

''بکل گیا ایں حکیماں دیا منڈیا۔'' ڈاچی کے منہ والا مینڈھ اُتر مہار موڑ گیا۔ پیچھے سے ہانک لگائی۔ ٹھہر ذرا سور ما! بوووں سمیت سب کچھ توڑ مروڑ ہاتھ میں نہ پکڑا دوں تو گڈی نام نہیں۔ میں بھی ذات کی گجری ہوں کوئی تیلن نہیں جو چنبیلی کا تیل مانگتا ہے تو ڈھنگی سے ...... جو بھاگا ہے تو ڈھول آسمانی چڑھی۔ لواور سنو پھجو جٹ کی پیلی میں گندلیں توڑتی تھی۔ پھجو جٹ کی سرسوں میٹھی تے لوی۔ پورے پنڈ کی موری۔ ساگ بنے مل دل کے نری پالک۔ دیکھوں کیا پھجو جٹ کا نطفہ ...... اکرما ...... لالو کمہار کے گدھے بار بنگا۔

''گندلاں توڑ دیئے نیارے نی ذرا مکھنوں ...... ایدھر موڑ ''

او پھر جو میں مڑی ...... ''گڈی پلو میں دانت لپیٹ ہنسی ...... لفظ بکل اور ہنسی میں گتھ گئے۔ خراب مسوڑھوں کی بُو عورتوں کے نتھنوں میں اڑنے لگی۔ جو اس کا حال، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔ آپاں جی معاف کر دیو غلطی ہوگئی ...... حرامی! بھلیکھا کھا گیا تا۔ مریاں چدھڑن کا۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ ایک جیسے پراندے باندھے تھے ہم دونوں نے پار سال ...... ''

گڈی نے پراندہ بکل سے نکال عورتوں کے بیچ گواہ کے طور پر پیش کیا ...... جتنی چھو سکتی تھیں چھو کر اطمینان کیا۔

''ایک جیسے ہی تو ہیں۔ شیشے جڑے پھنکوں والے ...... '' ساریوں نے مسوڑھوں کی بُو کو نگلا۔ پچھو نے کھنکار کر تھوکا۔

''لے پھر سُن۔ کماد کے بنے بنے جھولی باندھ گھاہ (گھاس) کر رہی تھی کہ نصرو میراثی ...... رانے کے کھیت میں سے اکڑوں اکڑوں اُٹھا اور لک (کمر) میں ہاتھ ڈالا۔''

''لک پہ ہاتھ ...... '' عورتوں کے حلق میں خشکیریاں اٹک گئیں ...... ''ہاں بھلیکھا۔''

''لے جو پھر میں نے کی اُس کی ...... رنبی لے پلٹی، بنے پہ مرے چوہے کی طرح کیچڑ چاٹے،

ہاتھ جوڑے آپاں جی معاف کر دو۔ کان سے پکڑ کھڑا کیا۔ کہا پہلے نام بول۔ کس کا بھلیکھا پڑا۔ بکا......
پھر آپ ہی بکا......حرامی بکا......''

عورتوں کی بکلوں پر جگہ جگہ کان اُگ آئے۔ دلوں کی دھڑکن ایک ردھم میں آ گئی۔

''اڑیو کیا بتاؤں یہی بلی جیسے پَیر دھرتی ہوئی...... سبو...... یہی کوے کی رن...... جو سک مل پونچھوں والا کجلا لگاتی ہے، اور ونگی چیر نکال جارجٹ کی چنی دوہری کر سَر پر لیتی ہے۔''

''نہ تو گُڑ تے مٹھ...... وہ پھلائی کا بوٹا، اُس کا بھلیکھا کیسے پڑ گیا تجھ پر کسی بٹن کی آنکھ والے کو......'' سدو جٹی بکل کا لڑ جھاڑ کر اُٹھی دھول ساری آنکھوں کو دُھندلا گئی۔ گھٹے (دھول) میں لبریئے دار کھرے بناتی نائیوں کی پچھال میں چھپ گئی۔

گُڈی نے اُس کے کھروں پر اُڑتی دھول کو بیٹھتے ہوئے دیکھا۔

''لو پھر مجھ سے کچھ اور بھی سُن لو...... یہ اشناک جو ابھی بول کر گئی ہے، کل نمبروں کے ڈھارے سے نکلتے کھرے مَیں نے آپ دیکھے۔ یہی لکب والا پنجہ یہی تو...... کل سے سوچ رہی تھی کس کا کھرا۔ اب پتہ چلا کس کا...... پتلی کھری اور ورلے پنجے والا......''

سیدو گجری تنتنا کر اُٹھی۔

''گُڈی کسی کو نہیں بخشتی تو......تُو نے تو مُلا کی رن کو بھی نہ چھوڑا اُسے بھی امرو تیلی کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھ لیا مسیت (مسجد) کی چھت کے پیچھے سے......''

''نہ تجھے شک ہے کیا۔'' گُڈی نے اوڑھنی کا پلو زمین پر بچھایا۔ ''ایسی ہی تو تھی۔ سبو کی اوڑھنی، دونوں نے اکٹھی ہی تو میاں خیرے کے میلے سے خریدی تھیں۔'' گُڈی نے پلو لہرا کر اُٹھایا۔ دھول ساری آنکھوں کو بند کر گئی اور چاندنی کی لہریں پپوٹوں کے آر پار اُتر گئیں۔ گلی کی نکڑ مڑتی کمو لوہاری پر گُڈی کی نظریں سَر سے پَیر تک اُترتی چڑھتی رہیں۔

''ذرا کمو لوہاری کی ٹور (چال) تو دیکھو......'' گُڈی نے عورتوں کے سامنے بجھارت رکھی اور پھر پلو مُنہ پہ لپیٹ کھڑکھڑائی۔ راز کی کھوج عورتوں کو نیلے کی کوہان سے گُڈی کے پَیروں پر لڑھکا گئی۔

''اس کی بھی سُن لو چوتھا مہینہ لگا ہے۔ جاتی تھی سبق لینے مُلا سے۔ الف زبر آ بے زبر با۔

پڑھا دیئے سارے سبق، طاق ہو گئی سارے علموں میں...... یہ بل بل پڑھتی وہ سنتا...... وہ بل بل پڑھتا۔ یہ سنتی۔''

ماؤں نے اگلے روز سے لڑکیوں کو مسجد سے اُٹھا لیا اور سب کا قرآن پاک ادھورا چھٹ گیا۔ لڑکے لڑکیوں کی فصل ایسی پُر جھاراب کی بار ہوئی تھی کہ گُڈی کو کاتنے سے فرصت ہی نہ تھی۔ پونی سے پونی جڑتی چلی جا رہی تھی۔ گوڑھے پہ گوڑھا اُتر رہا تھا۔ ساری چھابیاں اور پٹاریاں بھر گئی تھیں۔ گھوک گھوک تکلا خالی ہو کے نہ دیتا تھا......

کولو آرائین اور مریاں چدھڑن نے پتہ پتہ پالک کا سرسوں کے کھیت میں سے چنا۔

''آپا معاف کر دے۔'' نہ تو اور کیا کہیں، گڑ تے مٹھا اوپر جھولے میں سے اُٹھا کر لے جانے والے کتے نے اچھا ناشتہ کیا۔ سارا منہ چھید و چھید، چاہے موٹا چھان او چاہے باریک...... پنڈ میں لڑکوں کا انت...... ''اُتوں قہر دی جوانیاں......''

پرلی بہک سے سیٹیوں نے تال دیا۔ مریاں نے دھاگا سی گاجر گیلی مٹی سے کھینچ کر نکالی، ہاتھ سے جھاڑ منہ میں رکھی۔ مٹی اور گاجر کا ذائقہ منہ میں گھلا۔

''پر کسی نے مڑ کر اسے بھی کبھی دیکھا کولو کے ہملیکھے مریاں کے ہملیکھے......''

''کبھی اس کے ہملیکھے میں کسی نے کسی کو نہ دیکھا......'' حد جبرو میراثن کو بھی نہ دیکھا......

لڑکیوں کی ہنسی ٹیوب ویل پر بیٹھے لڑکوں کی تاش کی گڈیوں میں پھینٹی گئی۔

چلے پُرے دی ہوا اُتوں پوہ دا مہینہ
اج پنڈ دی کڑوی راہواں بُھل گئی اے

گُڈی نے تنور پر پیڑے گھڑتے ہوئے اوپر تلے خشکے کی کنالی میں پھینکے۔

''نہ کس ماں کے جائے کی جرأت جو گُڈی کو آنکھ کے کونے سے بھی دیکھے۔ بودوں سمیت سب کچھ کھو مچھ کے ہاتھ میں نہ پکڑا دوں۔ قرآن شریف میں نے پورا ختم کیا۔ کوئی ساتویں سپارے سے آگے نہ گئی روز سویرے نماز کے بعد دو رکوع پڑھتوں۔ پورے دو رکوع...... پانچ جماعتیں کس نے پاس کیں۔ گُڈی نے کوئی دوجی سے (دوسری) سے آگے نہ گئی۔ نہ کل کی سن...... رقعہ حکیموں کے نطفے کا...... پھینکا تو اسی کیری کچی پر۔ پر...... پر بجا آ کے میرے سَر پر...... لے

دیکھو......''

گڈی نے قمیص کے گلے میں ہاتھ ڈال مڑا تڑا رقعہ نکال مدعا پیش کیا جس کی کچی کچی لکھائی پسینے میں مسل کر جگہ جگہ سے مٹ گئی تھی۔ ''پر پڑھے کون؟ گڈی......'' گڈی کنالیاں دھکیل چوکڑی مار بیٹھی۔

''سنو......، جان سے پیاری مریاں...... جان کل رات تمہارا انتظار کروں گا۔ امرودوں کے باغ میں......''

عورتیں تنور کے مُنہ پر کنڈلیاں مار گئیں۔ ابھی رقعہ مرن پرن کی کٹھوں میں ہاتھوں ہاتھ پھر ہی رہا تھا کہ جیلو گجری منیاری والے رزاقو کے ساتھ بھاگ گئی جسے بھاگتے ہوئے چوکیدار بھی نہ دیکھ سکا۔ اُسے بھی سرگی ویلے اونگھ آ گئی تھی۔ پر نہائی دھوئی سک سُرمہ کیے جیلو کے بدلے ہوئے تیور گڈی نے تو سرِ شام ہی بھانپ لیے تھے۔ پر وہ بھاگی تھوڑی تھی جو کھرا (نقشِ پا) ملتا وہ تو موٹر سائیکل پر چڑھ کر گئی تھی جو نمبر شناخت ہونے سے پہلے ہی پکی (سڑک) پر ہَوا ہو گئی تھی اور گڈی نکلے پر وضو ہی کرتی رہ گئی۔ نماز بھی قضا پڑھی دو نمبر تو پڑھ بھی لیے پر تیسرا مِٹا مِٹا تھا۔

درگاہ پہ جھنڈا باندھتے مسجد میں تیل ڈالتے، سپارہ پڑھتے، نماز نیت کرتے تہجد کے لیے وضو کرتے، گڈی پر سارے مناظر الہام ہونے لگے۔ رات جھاڑا پھرنے والیوں، گدّا بولیاں ڈالنے والیوں کے بھلیکھے گڈی پر دو گنے ہو گئے۔ یہ بھلیکھے ماؤں کو اندھیرا چیرتے جیلو کے موٹر سائیکل پر آگے پیچھے بیٹھی دو سواریوں کے سایوں کی طرح ڈرانے لگے۔ ماؤں نے پیٹیوں کے ڈھکنے کھول دیئے، نیم اور تمباکو کے پتوں کی مہک والے کروشیے کے رومال اور چار سوتی کی جھالریں لگی چادریں نکال دھوپیں لگوائیں۔ پینجے گھروں میں بیٹھ روئی دھنکنے لگے اور مجنوں کھیس تانیوں پر چڑھ گئے اور میٹھے سلونے چاولوں کی دیگیں دم پر لگیں۔

لڑکیاں کہتی رہ گئیں۔

''یہ بھی کوئی بیاہ ہے بھلا بندہ بیاہ کر چار کوس دور جائے۔ مہینے دو مہینے بعد مُڑے کسی کو سک بھی لگے۔ اڈے پر بس سے اُترے۔ ہاتھ میں پچھی ہو...... سَر پر بُرقعہ ہو۔ ساتھ میں واسکٹ پہنے بندہ ہو...... موڈے (کندھے) سے لگا کا ہو...... سارے پنڈ میں خبر لگے۔ سورے پنڈوں گڑی

آئی..... (سسرال سے لڑکی آئی) یہ بھی کوئی بیاہ ہے اپنے گھر سے اُٹھ کے ساتھ والے گھر میں چلے جاؤ۔ نہ کوئی ساس نندوں سے کہے راوی کا بہرا بیاہ لائے ہو۔ نہ کوئی پوچھے کس پنڈ کی ہے۔'' دور بیاہی گئی کرلاتی رہیں۔'' کیوں پائے نی ماں لمبے وچھوڑے۔ نہ ویر دکھے نہ باپو نظریں آوے۔ جا دھیئے راوی نہ کوئی آوی تے نہ کوئی جاوی۔'' گڈی کانوں کان بتاتی پھری'' اڑیو وچھوڑا یار کا بہانہ ویرے کا.....''

جس طرح اوسط زیادہ ہو جائے تو مول گھٹ جاتا ہے اور فصل اونے پونے بک جاتی ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کی بھری کھلیان بھی جوڑ بے جوڑ اُٹھ گئی لیکن ربیع کٹی تو خریف پک گئی۔ لڑکیوں لڑکوں کی دوسری پود نے منظر خالی نہ ہونے دیا۔ گڈی تمتی کاتتی رہی۔ چرخہ گھوک گھوک تکلے توڑتا رہا.....

گڈی جواب سارے گاؤں کے لڑکوں کی آپاں بن گئی تھی۔ جو کوئی گڈی کا نام لیتا کانوں کو ہاتھ لگا زبان چھوتے۔

''توبہ توبہ آپاں..... ماں کر سمجھی ہے سدا..... نیلا تھوتھا کھامروں پر آپاں.....توبہ توبہ بڑا گناہ پاپ.....''

گڈی کی ماں جس کسی لڑکے کی ماں کے پاس آ بیٹھتی ڈلار سے کہتی'' گڈی اللہ رکھے اپنے انور سے دو مہینے چھوٹی ہے۔'' لڑکے کی ماں بھری فصل کو منہ مارتی بکری کو ہانکنے لگتی۔

''نہ نی پھپھو! تو بھی کاکی ایانی ہوگئی ہے۔ گڈی بس نام کی گڈی ہے۔ عمر سے تو تیری بھی آپاں ہوگئی ہے۔ گڈی میری شیدا سے بھی ڈھائی مہینے بڑی ہے۔ شیدا کے اللہ رکھے چار نیانے (بچے) ہیں۔'' دائیں بائیں چوکوں سے آوازیں گڈمڈ ہوتیں۔

''چھوڑ بہن میری ناصرہ سے پورے سات مہینے بڑی ہے گڈی، ناصرہ کا بڑا کاکا (لڑکا) سکول جاتا ہے۔''

گڈی جن سے بڑی تھی۔ اب تو اُن کی چھوکریوں کے بھلیکھے بھی اُس پر پڑنے لگے تھے۔

راہ جاتے مرد بھی پوچھتے۔'' آپاں کس کی چھوکری کس کے ساتھ بھاگنے والی ہے۔''

''آپاں تو ریڈیو بی بی سی ہے۔ ساری خبریں رکھتی ہے۔''

لڑکے ہنستے'' آپا ہمارا بھلیکھا بھی ڈال دے کسی پر..... کالی جیب ہے ہماری آپاں کی جو منہ

سے نکالتی ہے۔ پورا ہو کے رہتا ہے۔''

گڈی، کمر کے نیچے پُشت کے اُوپر بنی چربی کی ہیری تھرتھراتی اور چہرے کے چھید مُنہ کھول ہانپتے چھلنی میں سے آٹا سا چھن چھن گرتا۔

''تو پھر سُنو تم سارے بودے کٹوا کر مونچھیں منڈوا دو۔'' لڑکوں نے بڑھے ہوئے بالوں اور مونچھوں کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپایا۔

''کیوں آپاں وجہ بول......''

''اس لیے کہ پنڈ میں ایک چڑی مار اُترا ہے...... ساری مُیاروں کے دلوں کے پنچھی اُسی کے جال میں اُڈاریاں مارتے ہیں۔ اب تو بس ایک ہی بھلیکھا سارے پنڈ میں پڑتا ہے۔ ایک ہی گھبرو...... جویں جوگی پہاڑوں لتھا۔''

''کون ہے وہ رسیا......''

لڑکے اپنے انجانے حریف کے خلاف جتھے کی طرح اُمڈ کر سامنے آ گئے۔

''بس ہے نا ایک جس کی منگ کو آنکھ مارے جس کی رن کو سیٹی بجائے ڈور کٹی گڈی کی طرح اُس کی پھاہی میں آ کر پھنسے۔''

گڈی نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے پر گھما کر ڈور لپیٹی اور کٹی پتنگ اشارے سے پلٹا کر پھینکی۔

''اسی گاؤں کا ہے تو چاروں بال صفا چٹ مُنہ کالا کر گدھے پہ بٹھا پھیرے لگوا دیں گے اور اگر باہر کا ہے تو چوک والے جنڈ سے باندھ سانہی بکرے کی طرح خصی کر دیں گے۔ بول آپا بول دے اب اُس کا نام۔''

لڑکوں کی مردانگی ڈکرانے اور ہونکنے لگی۔

اب اگر وہ نہ بولتی تو شاید سارے غصیل بیل اُسے سینگوں پہ اُٹھا اُچھال دیتے۔

''لو پھر سُنو!'' گڈی نے پلو سے چہرے کے چھیدوں میں پھنسا پسینہ رگڑ کے پونچھا۔ گنگناہٹ کے ساتھ سارے چھید پھیل گئے۔

''نیا ڈرائیور لاری کا......''

''وہ گنجا چاچا فیقا۔''

غصیل بیل بے تحاشہ جگالی کرنے لگے۔

''پتہ ہے ادھر پسرور میں سات بچے اور دو بیویاں چھوڑ کے آیا ہے۔ تیسری ڈھونڈ رہا ہے۔ ہر رانڈ چھنڑ کے پیچھے آتا ہے۔ پر اس گاؤں میں مُنہ مارا تو لک سمیت گلو کمہار کی آوی میں دبا دیں گے۔ چپے کچے کی طرح پک جائے گا۔''

گانے کے پھند نے باندھتی اور ڈوروں میں موتی پروتی بھرائی نائن نے سجان جٹ کی وینی کا ناپ لیا۔

''پر آپاں تیرے جوڑ کا ہے......''

بھرائی نے گانے کی لمبی لٹکتی لڑیوں پہ ہاتھ پھیر گھنگھریاں بجائیں۔

''نہ بھرائی نائن! آپاں سے مذاق کرتی ہے۔ آپا چاچے فیقے کی بھی آپاں ہے...... جس نے آپاں سے مذاق کیا سمجھو جوتوں سمیت مسیت (مسجد) میں داخل ہوا۔ قرآن میں رکھا روپیہ چرایا......''

گڈی نے بھرائی کا ہاتھ پکڑا اور لڑکوں کی سمت پُشت کی۔

''کل کی سُن جمعرات تھی اور تجھے تو پتہ ہے مَیں ہمیش جمعرات کی جمعرات درگاہ پر روپیہ چڑھاتی ہوں...... مغرب کے بعد آتا ہے بس لے کر...... ادھر پسرور...... سواریاں اُتار کے...... موہل میں چھپی بیٹھی تھی۔ پر مجھے نہ پہچانی جائے پہچان لی ایک منٹ میں پتہ لگ گیا۔ نمی آرائین...... ساتھ والی سیٹ پر جُڑ کے بیٹھی ہوئی مچھیاں چوستی ہوئی۔ لمبی تیلی والی...... اور سُن اذانوں سے پہلے پہلا پھیرا اُٹھاتا ہے ادھر تکّی سے...... باہر نکلی وضو کرنے، تہجد کے لیے...... تجھے تو پتہ ہے مَیں کبھی تہجد نہیں چھوڑتی۔''

''اچھا مجھے تو نہیں پتہ۔'' بھرائی نائن نے گانے کو آخری گرہ لگا لال رومال میں باندھا......

''بیں نی چل کھچری نہ بن، کھیتاں ڈوبے کون اُٹھتا ہے۔ اس پنڈ میں کس کا نکلا چلتا ہے۔ کچھ کچھ، بانگوں سے پہلے، بن ساتھ والی سیٹ پر کولو آرائین جڑ کے بیٹھی ہوئی۔ اک مک......''

''اری خود کہہ بیٹی......'' بھرائی نائن کے ہاتھ سے گانے والا رومال گرتے گرتے بچا......

''از یئے خود، نہ جوانیں نکیں نہ بڈھیاں...... شہر جانے کا بہانہ۔ پر گڈی کو کون سمجھائے ساری رمزیں۔ کوکے کولے پلائے فیقا ڈرائیور کڑاہی گوشت کھلائے فیقا ڈرائیور...... لے سُن کل دیکھوں تو گلو میراثن

فیقے کے موڑھے پہ ہاتھ رکھ ڈرائیور والی باری سے اوپر چڑھی۔اک جٹ...... بہانہ گرنے کا۔''
''نہ پر اس میں ہے کیا۔'' گنجاتے بڈھا۔''
بھرائی نکونک اُکتاہٹ میں رجھ گئی۔
''گیدڑ سنگھی ہے۔اس کے پاس، سندور میں ڈال رکھتا ہے جیسے جیسے پھولتی ہے ویسے ویسے عورتوں کے دل بھی قابو سے بے قابو......کل کی سُن ...... سیپارہ پڑھنے مسیت (مسجد) کو گئی۔کیا دیکھوں بس کا ہارن پہ ہارن، رستہ چھوڑ گلی مڑ گئی۔
فیقا......تب سجھی...... بھلیکھا......نمی آرائین کا...... جا کر دیکھا ایسی ہی تو......ایسی کالی شلوار پہنی ہوئی جیسی یہ......''
گڈی نے شلوار کی کریز ہاتھ میں پکڑ اُوپر اُٹھائی اور ایڑھیاں اُٹھا کر بھرائی کے کان تک مُنہ لائی۔
''پھر یہ بھی سُن رکھ آج نہیں تو کل جیلو گجری کی طرح یہ بھی گئی بس پر بیٹھ کر...... کھرا بھی نہ ملا......''
''تو بھی گڈی خود کو سنبھال کے رکھنا گیدڑ سنگھی کا کیا پتہ......کسی کو......''
بھرائی نے پولا سامنہ بنا گانا رومال سے باہر نکالا۔
گڈی کے ہاتھ سے شلوار چھٹ گئی۔
''نہ کیسی بات تُو نے کی بھرائی! یہ گڈی گوشت اور ہڈیوں کی بنی گڈی ہے۔کوئی ماکھی (شہد) کا موم نہیں......کتنوں نے زور نہیں لگایا یہ شیدا میدا...... کا سو......رحموں، ریحان، کھرے پہ کھرا دھر چلتے بھلیکھے ایسے تھوڑی پڑتے۔سارا سمجھے ہوئے تھے۔بھئی پکی ہوئی تو بھلیکھا کچی ہوئی تو لیکھا......پر مَیں بھی دین، اسلام کی ساری باتیں جانوں پورا قرآن کس نے ختم کیا گڈی نے، روز سرگی نماز کون نیتے، گڈی۔سپارہ پڑھے، گڈی، کسی بھیڑے کی مُونچھوں پر تھوکوں بھی نہ......''
گڈی نے بھرائی کے ہاتھ سے لال رومال میں لپٹا گانا پکڑا، جیسے شاخ پر سے بجرا پھول توڑا ہو۔ست برگا......
''میری اور نسو کی وینی ایک جیسی ہی تو ہے۔لے دیکھ بالکل پورا جیسے میرے ہی ناپ کا ہو......''

گڈی نے ریشم کے دھاگے کی گرہ کلائی پر لگائی اور بازو ہوا میں اُلارا، گھنگھریاں کھنک کھنک دہائی دینے لگیں جیسے وصل کے موسم کی منادی ہو جس میں پنکھڑیوں اور پتیوں کی خوشبو اور سرسراہٹ...... گھل مل گئی ہو......"

"بالکل میرا ناپ۔" گڈی کی سسکار گھنگریوں کی منادی میں پروئی گئی۔

"ہائے نی کہیں گانے کو وینی کا بھلیکھا ہی نہ پڑ جائے۔"

بھرائی نے گانے کی گرہ کھول دی۔

"کتنے سالوں سے گانے کی آخری گنڈ ترے سے ہی تو لگوائی، پر گانا سُسرا بھلیکھا ہی نہیں کھاتا۔ تیرا ناپ تو مُنہ زبانی یاد ہے مجھے گڈی! ایسے منکوں میں باندھ دوں تیرا گانا۔ لڑیوں اور پھندنوں والا اللہ سائیں تیم تو لائے۔ اُدھر پسرور سے منگوا کر رکھے ہیں نلکیاں اور سچے موتی تیرے لیے خاص۔"

گڈی نے پوری ناک پلو میں لپیٹی۔ سارے گڑھے اور نشان چھپ گئے۔ بنا ناپ کر نہر کے کنارے گئی۔ آسمان کے انتہائی کناروں تک بچھی کچے گیہوں کی چادر ہوا میں لہرائی جیسے عروسی دوپٹے کی تہیں کھلیں اور سرسراہٹ کروٹیں بدلے دھیرے دھیرے......"

"تو جا بھرائی! مَیں ذرا ڈبکی لگاؤں، کتنے دن ہوئے نہانے کا ویل ہی نہیں لگا۔"

"لے گانا کیا باندھا کھارے چڑھنے کا نیم بھی آ گیا کیا؟"

بھرائی ہنسی چاروں کناروں آسمان میں گھستی ہری مخمل کے تھانوں کے بیچ سرسوں کے قطعے لہرائے جیسے دلہن کے ماتھے پر خالص سونے کے ٹیکے، جھومر جھلملاتے ہوں۔ گڈی نہر میں ڈبکی لگا گئی۔ پانی کی سنولاہٹ گہری ہو گئی۔ پلوں تلے کی کل کل پُرشور تھی۔

نسو کو گانا بندھ گیا۔ بیاہیوں نے سات گرہیں بھی لگا دیں۔ پر گڈی نہ پہنچی۔ برات چڑھنے کے ساتھ یہ خبر کانوں کان چڑھی۔ گڈی فیقے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔

لڑکوں نے آہ بھر کے کہا۔

"آپاں بس پہ چڑھ کے کیوں بھاگی ہمیں بتاتی ہم پسرور تک کندھوں پہ ڈولی اُٹھا کر چھوڑ آتے۔ آخر ہمارے پنڈ کی آپاں تھی۔"

چاچے گلو نے ڈپٹ کر کہا۔ بے غیر تو! بودے موچھیں مونڈھ کر اڑ وڑی میں دبا دو۔ دس سال ہو گئے آپاں آپاں کرتے۔ اتنا نہ ہُوا بانہہ پکڑ کے کوئی کہہ دیتا۔ بھلیکھا تھوڑی تھا۔ تُو تو ہے ہی گڈی۔ تمہارے گھر کا گوھا پوسی بھی کوئی دوسرا اُٹھا لے جائے تو تم قتل کر دو یہ تو پھر عورت تھی۔''

مریاں چدھڑن نے باز ولبرا کر کہا:

''سکھیوَ!'' لے جانا تو تھا اُس نے نمی آرائین کو پر بھلیکھے میں بانہہ (بازو) آپاں کی پکڑ لاری میں بٹھالیا۔ دونوں نے اوڑھنیاں جو ایک جیسی لی تھیں۔ میاں خیرے کے میلے سے، پسرور جا کر وہ اوڑھنی اُٹھا کے مُنہ دیکھے گا تو پھر......''

نہر کے کناروں سے چھلکتے دریائی پانی میں پوریاں، ٹوٹیاں، بُوجھے، ٹہنیاں، بہاؤ میں تیرتے تھے۔ پلوں تلے کی چھل میں مُنہ کے بَل گرتے اور کناروں کی جھاڑیوں میں اُلجھتے اور ٹوٹتے ہوئے......

گنجی بار

سکینہ کے باپ کو مرے وہ چوتھی رات تھی۔ جب گارا کھری کوٹھڑی کی تاریک گپھا میں دتو کی چیخیں گھسرتی چلی گئیں۔ چیخوں کے نکلنے اور پلٹنے کی رفتار اتنی متواتر تھی کہ سکینہ کے بالوں کی جڑوں میں سرسراتی جوئیں بار بار ڈنکنے لگیں اور حلق کے پیاسے کنوئیں میں ریتلی بھوبھل اُڑنے لگی۔

''اماں! اُٹھ دتو روتا ہے۔''

وہ گھڑے کے گلے سے اوک لگا چسر چسر ہتھیلی چوستی تھی۔ جھاگ سا کلر حلق کی ریتل میں گھل گیا۔ گھڑا اُسو کھا تھا اور کھاٹ اماں سے خالی تھی۔

دیئے کی بجھتی اور پھر یکدم بھڑکتی لَو میں دتو کے چرے ہوئے حلق میں ایسا ہی کلر دِکھتا تھا جیسا گھڑے کے پیندے میں جما تھا۔ قابلی کیکر کی سولوں جیسے کھنچے ہوئے تیندوے کے تار لرزتے تھے۔ کپاس کے کرنڈ چتوں سے چمڑے کی مٹھی بدن کبھی سمٹ کر اوجری ہو جاتا تو کبھی کھینچ کر تانت۔ چھت کے سرکنڈوں پہ سرسراتا ہوا سانپ کیکر کی چھال اُدھڑی شہتیر سے دم کا ایک بل لپیٹے پھنکارتا، ڈنک لہراتا تھا۔ سکینہ حلق کی بھوبھل میں چیخ لپیٹے چاروں ہاتھ پیر سے چارپائی کے نیچے رینگ گئی۔

''دتو چپ سپ کوڈیاں والا سپ (سانپ)۔''

دتو کا نچلا دھڑ بول پیشاب سے اَٹی چارپائی کے کھلے سوراخوں سے لٹکا تھا جیسے پھانسی پہ چڑھا

ہو۔ ٹمٹماتا ہوا دیا بجھ گیا اور کوٹھڑی کی گپھا میں منہ کھولے تاریکی خوف کی کوکھ میں بھر گئی۔

ڈھائے والے ٹبے سے اُتر سورج گنجی بار کے وسیع تھالوں میں بھری فصلوں پر بجھ گیا تھا سکینہ گو موت سے گو چھڑ شلوار قمیص میں دتو کو چھپائے پکارتی تھی۔

''ونڑا اماں مُڑ آ، اماں بھک لگی، اماں آٹے والی مٹکی خالی ہے، پانی والی گھڑی سوکھی ہے۔ کوٹھے میں کوڈیاں والا ہے اور کمادوں میں کتلیوں والے گنے چُو پتے ہیں۔''

ہر چیخ کے ساتھ بَین کے روڑوں کا چھینٹا حلق میں سے ٹپکتا پکے روڑ، رڑکتے آنکھوں سے گھل گھل گار بہتی۔ دِتو نے ہرا پیلا جلاب اُس کے کپڑوں پر تیسری بار چھڑک دیا اور بدن کی مٹھی چُر مڑا گئی۔

''دِتو! تجھے بھوک لگی رے دِتو اماں آ، دِتو کو دُودھ پلا۔'' دِتو اماں کو کہاں ڈھونڈوں رے دِتو، کوٹھڑی میں تجھے چھوڑوں تو سپ لڑ جائے۔ باہر موئے کُتے شکرے ڈیلے نکال لے جائیں۔ ونڑا اماں! مُڑ آ، ونڑ! اماں......''

نرمے کے چوڑے کھردرے پتوں میں بجی عنابی اور موتیا رنگ نر مادہ پھل گڈی کی پیالیوں میں دُھوپ تمازت لبالب بھر آئی۔ بول پیشاب سے لتھڑی سکینہ کی شلوار قمیص خشک سرکنڈوں سی کھڑ کھڑ بجنے لگی۔ کماد کے ہرے پاندے سنہری ہو گئے۔ پوریوں کے انگوری رنگ پہ جما سفید کلر سا تڑخنے لگا جب وہ نرمے کے جھاڑ میں دِتو کو چھپا اوکاں اور ون کی کھکھلوں کے ساتھ ساتھ واولو نے (بگولے) میں چکراتی ہوئی چلی۔ ہر ڈیرے بہنی، جھوک، ڈھوک سے پوچھتی چلی گئی۔

''یہاں اماں تو نہیں آئی۔''

فضل جٹ کے ٹیوب ویل کے خشک کھاڈے میں جھانکا، اَجو گجر کے باڑے کی کھرلیوں میں بھرے کترے میں ہاتھ مارا، کماد چری کا ٹانڈا ٹانڈا پھرولا، دبڑے کے تیلے توڑ توڑ جھاڑو بناتی عورتوں نے بکلوں سے کان باہر نکال ایک ایک آنکھ میچ ماتھے پر ہتھیلی کا چھجا بنا ہانک لگائی۔

''ہیں نی ماں اُدھل (فرار) گئی اُو۔''

اُس نے ڈھیلا کھینچ اُن کی سمت اُچھالا۔ ''اماں! ونڑا اماں!......'' سرکنڈوں کے جلے ہوئے جھاڑوں کی راکھ اور نہر کے کشادہ پاٹ میں صدا اُبھرتی ڈوبتی گئی۔

ان ساری جگہوں میں سے اماں کہیں نہ کہیں ضرور مل جایا کرتی تھی۔ پر آج تو کسی وٹ بنے پر

کھرا (نقشِ قدم) بھی نہ ملا۔

کریوں، آک، بور، کیر، پیلوں، بروا جیسی جنگلی جھاڑیوں کے ساتھ چلتے سانپوں کے لہریئے۔ سہ کے کانوں کی گھسٹ جیسے کری کا پھاپا دُور تک گھستا ہو۔ گوہ نیولوں اور خرگوشوں کے انگوٹھے کے نشان جیسے کھروں میں اُس نے اماں کا کھرا پکڑ لیا۔ کئی بار، جٹ مدھانہ، دب کھوئی، دھامر جیسی گھاس پھونس میں کھرا گواچ بھی گیا مگر پھر، لومڑ، بھیڑیئے، بیل، بھینس کے کھروں کے بیچ ڈھونڈ نکالتی کہیں پنجہ کہیں ایڑی۔ پھیلے ہوئے پنجے اور کوتاہ ایڑی کی بیائیوں کا سلسلہ جوڑتی ہوئی وہ پکی سڑک پر چڑھ گئی۔

مرغابیوں والی جھیل پہ جمی کائی ہاتھ مار مار توڑتی، نک بھر بھر پینے لگی اور نہر کی پٹڑی پر اماں کے کھروں پر کھرے گڈمڈ کرتی سرپٹ پلٹی۔

''وتو! اماں پکی (پختہ سڑک) چڑھ گئی۔ اماں مُنہ کرگئی۔ مُڑ سے کے نہ مُڑے پکی پہ چڑھا کون مُڑا''

''اماں آں اں اماں مُڑ آ، ونڑ مُڑ آ۔''

چیئے کے کنوپیوں کے سے گھونسلے کیکروں کی بے برگ ٹہنیوں پہ لرزتے تھے۔ میڑ ھے میڑ ھے تنوں کی کھاکھلوں میں سے گلہریاں دُمیں لہراتی تھیں۔ کینوؤں اور امرودوں کے راکھے ہوائی فائر داغتے تھے، چارو ساتگلوں سے شریہنہ اور تابلی کی میسیاں کھیتے تھے اور ڈھولے گاتے تھے۔

رکھیا باشہ کھاڑے پے گئی ہل ماہیا
لے وچھوڑے کے بہانے مل ماہیا

وہ گوہ، نیولے ناپتی کمادڑے چیرتی ڈھائے والے مہے سے اُتری، سُورج گنجی بار کو سیراب کرتی نہر میں مخبر گیا تھا جس کے عنابی رنگ پانیوں میں پہاڑوں کا گھلا ہوا بجر اور میدانوں کی کچی مٹی باہم کھرل ہوتے تھے۔ کثیف اور زرخیز، جس کی کثافت میں سرکنڈے اور اعضاء ترشے بدن تیرتے ہوئے آتے اور رتک اور دھامر کی جھاڑیوں میں اٹکے رہ جاتے جن کی شناخت گیدڑ اور بھیڑیئے کھوجھ لیتے اور ڈھوڈر اور گدھ اُڑا لے جاتے۔

بول پیشاب سے اکڑے چولے کے گھیرے کو گرہ دے کر اُس نے شلجم بھرے تھے۔ شلجم کے

دو رنگے عنابی، سفید چھلکے دانتوں سے کھرچ کھرچ ذرا ذرا ٹکڑے دِتو کے مُنہ میں ٹھونسنے لگی، جو اندر نہ جاتے تھے جیسے حلق کا ڈھکنا بند ہو۔

''کھالے دِتو ویر! کھالے اماں تو پکی چڑھ گئی تجھے دُودھ کون پلائے گونگلو کھالے، اماں پکی چڑھ گئی۔''

وہ بار بار ٹھونستی اور وہ جبڑوں کے باہر سے اُگلتا۔

سکینہ نے بھدی اُنگلیاں کھینچ کر ماریں، دِتو کا فٹ بھر وجود تشنج کی کیفیت میں مُڑ تڑ ا گیا، سینے کی معدوم سی جنبش میں ہلکی سی کھک کی آواز اُبھری۔ وہ دِتو کے کرنڈ گو کھڑے سے مُنہ کو بے تحاشا چُومنے لگی۔

''ہائے رے دِتو! ماں مُنہ کر گئی، پکی چڑھ گئی پکی چڑھا کون مُڑا۔''

کھال سے بک بھر بھر پانی دِتو کے مُنہ میں ڈالتی، باچھوں سے نکلتے پانی کو پھر واپس دھکیلتی، سُورج آموں والے باغ میں اُونگھ گیا تھا اور بھوسے کے ڈھیروں میں سو گیا تھا جن میں سے آدھ، پون، چوتھائی بھوسہ نکلا تھا اور چھت کی لپائی ابھی اوپر ہی ٹکی تھی جیسے چڑیلوں کے اُلجھے ہوئے بال......

اگلے روز جب گنجی بار کے اُجاڑوں میں گڑھے آسمان کے کناروں پر سورج کی بھٹیاں دہکنے لگیں۔ درختوں کے جھنڈ بھوسے کی کھکھلوں اور راجباہ کے پانیوں سے دُھواں اُٹھنے لگا تو سکینہ شاہم نکلتی اور کھال کا پانی پیتی تھی اور بَین کرتی تھی۔

''ہائے رے دِتو! تو روتا کیوں نہیں۔ کچھ کھاتا بھی نہیں، گو موت بھی نہیں کرتا ہائے رے دِتو اماں پکی چڑھ گئی۔''

نرمے کی قطاروں کے بیچوں بیچ، اٹ سٹ، سانواک، تلے، دھائیاں کھودتی عورتیں بَین سُن باہر نکلیں۔ پُشت پہ اُچھلتی گھاس پھونس سے بھری جھولیاں جن کی گرھیں پیشانی پہ بندھی تھیں۔ دادی زینو نے جھولی کی گرہ کھولے بنا، ماتھے سے نکال سَر سے کھسکاتے ہوئے بنے پہ پنڈ ٹکا دی۔

''نی بھیڑیئے کینی! کیوں بوجنی (بندریا) کی طرح اس مُردے کو لپٹائے پھرتی ہے یہ تو کل پرسوں کا ٹھنڈا ہو گیا، ری کملی!''

عورتیں جامنی پھولوں والے برسیم کے پاٹوں میں دائرہ بنا مُنہ پر پلو ڈال بَین کرنے لگیں۔

''ہائے ماں خنزیرنی ذرا ذرا بال چھوڑ، اُدھل گئی۔''

''خصم مرے چوتھی رات مُنہ کالا کر گئی ماں نہیں ڈائن، اُ کا ڈائن ہائے نی عشقے دی آ گ بُری جتھے بلے سراج بھا پاوے۔''

گوبھی سرسوں کے جوڑے پتے ہرے ہو ہو سیاہ پڑ گئے تھے جیسے اپنی ہی شادابی سے گھتہ گھتہ داغی ہو گئے ہوں۔

ماسی نیتو نے مُنہ ڈھکے کپڑے سے خشک آنکھیں رگڑیں۔

''کسی دیہاڑے راوی کی چھلوں پہ اُچھلتی نہر کے بوجھوں میں آ اُنکے گی۔ یا ئر گئی یا دھڑ گئی۔''

کوٹھڑی میں سانپ تھا اور درختوں پر چڑیلیں، جو رات سے چل کر یوں قریب آ جاتے جیسے بال کھولے باہم گلے مل سوتے ہوں۔ خوف دھکیلتا تو باہر آتی۔ خوف رگیدتا تو اندر جاتی۔ باہر اندر کے دونوں فاصلوں میں پیشاب نکل جاتا اور ساتھ ہی حلق چر جاتا۔

''آ جا ماں مُرا آ...... ونڑا ماں مُرا آ......''

گنجی بار کے سناٹوں میں بازگشت یوں مروڑے کھاتی جیسے کوڈیاں والا، چھت کی کڑی سے مروڑے کھاتا، کمادوں میں بابرلے (سوّر) پاندے کھر کھراتے کنلیوں سے گنے چیرتے، مکئی کے کھیتوں میں گیدڑ اور بھیڑیے لکن میٹی کھیلتے جن کی آنکھیں اندھیرے کا خوف بن بن چمکتیں۔

چیخیں قبرستان کے سناٹوں میں، پُرانے کنوئیں میں اور ڈھے ہوئے بھٹے میں محور بناتیں مرغابیوں والی جھیل کے مخبرے پانیوں کی ہری نسواری کائی میں اوندھے مُنہ گرتیں۔ بھکرا، تھور، پٹھ کنڈا، آک سے اَٹی چراگاہوں اور شکار گاہوں میں چیخیں اور قہقہے، سرگوشیاں اور شور سب بولتا اور رینگتا۔ کھیتوں کو پانی لگاتے کسان چیخوں کے تار سے بندھے اُس کی جھگی کی سمت چلے آتے۔ غیرارادی طور پر جیسے اکثر کسان بدرُوحوں کے پیچھے پیچھے چلنے لگتے ہیں اور لبالب نہر میں یا سائیں والے بھے سے اوندھے مُنہ گرتے ہیں۔

''اللہ سائیں! یتیمڑی کو پَردہ دے شالا اس جندڑی سے موت بھلی گو موت میں گندھی ننگی منگی لڑکی ذات۔ وہی مجلی کا ٹوٹا دِن میں کمر سے باندھے رات میں بدن کی گٹھڑی لپیٹے شالا اس کا پردہ کج۔''

سارے اپنے پرنوں کو کندھوں پہ جھٹک مُڑ جاتے۔ بول پیشاب میں اَٹی چار پائی میں سفید سفید گودا بھرے کیڑوں کے خاندان بڑھتے تھے جن کے لاروے بان کے بدبودار ریشوں میں پلتے تھے۔ میل میں گندھی جٹاؤں میں جوؤں اور لیکھوں کے گلے افزائش پاتے تھے۔ میل سے چپچپاتی اُنگلیاں نتھنوں میں پھیر پھیر مُنہ میں چُوستی، لجلجا سا میٹھا ذائقہ، شلجم، چری اور گنے سے یکسر مختلف ذائقہ، بدن پر جمی میل کی مروڑیاں بنا بنا مُنہ میں رکھ لیتی نمولیوں اور لسوڑیوں سے بالکل مختلف ذائقہ، اندھیرا اور خوف، اسرار اور ابہام بھکرے کی طرح اُگتا اور تھور کی طرح بڑھتا۔

گاؤں کے بچے ڈھائے والے مربع سے ولا (فاصلہ) ڈال کر گزرتے، چرواہوں میں یہ مشہور تھا کہ کرملی مصلی کی بیٹی کینی چڑیل بن گئی ہے۔

وہ ڈھائے والے مربع کی سمت خفیہ اشارے کرتے اور ایک دوسرے کو خبردار کرتے رہتے پر ساری خبرداری کے باوجود اُس روز نتھو کی بکری کینی کی جھگی کے پچھال بہتے کھال سے پانی پینے آ گئی اور دھریک سے لپٹی بیل کے چوڑے پتوں اور زرد پھولوں سے نکلتی نرم توری کو مُنہ مارنے لگی، جب کینی نے جھپٹا مار کر بکری کے تھن پکڑ لیے اور جب تک نتھو نے دیکھا اُوپر تلے کئی دھاریں مُنہ میں چوا ڈالیں نتھو نے مُنہ کے دونوں اطراف انگلیاں کھڑی کر کے خطرے کی کُوک ماری۔ دونوں ٹانگوں کے بیچ دھوتی کا لڑ کھینچا اور دو پائینچوں والا لنگوٹ رانوں پر کس گیا۔ جسم کو تول کر کھال کے اُس کنارے چڑیل پر جست بھری۔

''اری ہوگی چڑیل تو اپنے گھر ہوگی۔ مَیں نہیں ڈرتا کسی چڑیل سے۔''

تھن سکینہ کی مٹھی میں بھینچا تھا چسر چسر چوستی تھی اور نتھو کے گھونسوں اور لاتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ بکری کمر جھکا پیٹ گھسیڑتی ٹانگیں پھسلاتی بلبلا کر کھال ٹاپ گئی۔ وہ جھٹکا کھا کر نتھو پر اوندھا گئی نتھو نے بوکھلا کر اُسے کھال میں دھکیل دیا۔

''تُو نے میری بکری کی دھاریں لیں۔''

''ہاں لیں۔''

وہ کھال کے بہتے پانی میں پَیر جما کر کھڑی ہوگئی۔

''کیوں تیرے باپ کی بکری تھی۔''

میل سے جُوجُو جڑیں بی لٹوں سے نتھو نے پکڑا، اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ کھال کی چکنی مٹی سے پھسلتی لوسن، برسیم کے سفید جامنی پھولوں پر گھسرتی چلی گئی۔ نتھو نے ڈھیلا لنگوٹ دوبارہ کسا اور دونوں پیر اُٹھا کے جست بھری۔

''میں تیرے جیسی چڑیل سے نہیں ڈرتا چاہے اپنے جنوں کو بھی آواز مار لے۔''

''میں بھی تیرے جیسے چارو سے نہیں ڈرتی چاہے آواز مار لے اپنی بکریوں کو۔''

وہ ٹیڑھے میڑھے زرد دانتوں اور نوکیلے ناخنوں کا ہتھیار سنبھالے اُس پر حملہ آور ہوئی۔ لوسن کے ہرے کچے ننھے منے پتے کچر کچر مسلتے تھے اور نازک نازک تنے کچ کچ ٹوٹتے تھے۔ کینی کی بوسیدہ سی بھیگی قمیص کا گلا نتھو کے ہاتھ میں آ گیا اور یوں نیچے تک کھلتا چلا گیا جیسے بٹن لگے تھے جو ٹوٹ گئے ہوں۔

''حال دہائی یہ تو ننگی ہو گئی، ننگی چڑیل۔''

نتھو مُنہ پھیر کے سر پر ناپلینے لگا، وہ غضبناک ہو کر پیچھے سے حملہ آور ہوئی۔

''ھائے اوئے میرا چولا پھاڑ دیا۔''

نتھو نے ایک جھٹکے سے اپنا کرتا اُتار اُس کی سمت اُچھال دیا۔

''لے پہن لے ننگی کھڑی بُری لگتی ہے۔''

نتھو کی بکریاں پرلے کھیت میں تنکا تنکا سر نکالے گندم کے کھیت میں منہ مارتی تھیں۔

''ہوں او ہو ہوں۔''

وہ بنے کھالے ناپتا ہوا بھاگا۔

ڈھائے والے مُہے سے دادی زینو اُتری اور پانی کا گھونٹ پینے کو کھال کے کنارے روٹیوں کی چنگیر اور لسی کی جھجری اُتار کر رکھی۔ دونوں پیر ریتل میں کھبو ہاتھوں کی اوک میں بھرے پانی میں مُنہ ڈبو ہی رہی تھی کہ لوسن کے پھول چوستی کینی پر نظر سیدھی ہو گئی۔

''نی کینی ای گدھی، تو نے نتھو کا چولا پہنا ہے اور کل اُس کی ماں مار مار تھک ہاری پر یہی کہتا رہا راجباہ میں بہہ گیا۔''

''ہاں تو میرا چولا اُس نے پھاڑ جو دیا تھا۔''

وہ گنے کے لمبے لمبے سک اُتار اُتار کھال میں پھینکتی گئی۔ دونوں باچھیں نوکیلے سک سے زخم

کس کر حملہ آور ہوئے وہ ناخنوں اور دانتوں کے ہتھیار سنبھالے مقابلے پر آئی پر نھتو کا چولا بالوں اور متعفن جسم کی ساری غلاظت لپیٹے گردن سے باہر تھا۔ چارو یکبارگی پسپا ہو گئے۔

''ہائے ہائے ننگی چڑیل۔''

وہ چولا اُس پر پھینک کر واپس بھاگے۔

نھتو کی بکریاں جب کماد کے وڈ میں چرتی تھیں تو وہ کھالے بنے ناپتا ہوا کینی کی جھونپڑی کے ساتھ ساتھ بہتے کھال کے اس پار آ کرزکا۔

''کینی میرا چولا دے۔اماں مارتی ہے۔''

کینی نے کالر سے پکڑ کر قمیص سر سے نکال پھینکی......

''اری تُو تو پھر ننگی ہو گئی۔ جا جا کر اپنا چولا پہن۔''

وہ پچھلے قدموں مُڑا اور سر پر لپٹا پرنا اُتار جھٹکا۔ تلاڈھکی مینڈھ پر نھتو کی بکری ات سٹ چرتی تھی، جب اُس نے دھا کر کے تھن جکڑ لیا۔ بکری کی احتجاجی مَیں مَیں سے نھتو پلٹا۔

''او آج پھر تو نے دھاریں لیں آج پھر......''

اُس نے دونوں ٹانگیں پکڑ ،وڈ، ہلویروں میں ایک بنے سے دوسرے بنے تک گھسیٹا اور مُونجی (دھان) کی پنیری میں لا پٹخا سکینہ کی جاجاسے مسکی ہوئی دھوتی چھلنی ہو گئی۔

''ہائے میری مجلی۔''

وہ دھوتی سر پر ڈال چیخنے لگی۔ نھتو نے سر سے پرنا اُتار اُس کی سمت اُچھالا اور کھال ناپ سرپٹ بھاگا۔

''لے پہن لے ننگی کھڑی اچھی نہیں لگتی۔''

ساری چارو برادری کو معلوم تھا کہ نھتو کا چولا صافہ کینی کے پاس ہے۔ نھتو کی ماں پوچھ پوچھ تھک ہاری۔ پر اُسے کسی نے نہ بتایا۔ البتہ یہ سب نے وعدہ کیا کہ وہ نھتو کا چولا صافہ واپس لا کر رہیں گے اَب چرواہوں کی ٹولیاں نھتو کا چولا صافہ حاصل کرنے کے مشن پر تُلی تھیں۔ ریوڑ چراگاہوں میں چھوڑ وہ کینی کی جھگی پہ دھاوا بولتے۔ ہمراہ اُڑنے والے ڈھول کے غبار نرمے کے پودوں پر مٹی کی تہیں بٹھا دیتے کماد کے پاندے بھر دیتے اور بھیڑوں کی جت میل خوری ہو جاتی۔

''کینی سُن سید ھے سبھاؤ نھو کا چولا صافہ موڑ دے ورنہ......''

وہ گوہ سی گتھ جاتی ایک بنے سے دوسرے تک اور پھر بنا لڑھک کے کھال کی گار میں، وہ ہاتھوں میں جکڑے بال اور دانتوں میں دھنسائے ہاتھ کبھی نہ چھوڑتی اور اس کے بدن اور بالوں سے گھل گھل میل کثیف پانی کو اور کثیف کر دیتا۔ دِنوں چولے صافے کے حصول کی جنگ جاری رہی۔ چرواہوں کے دِل سے یہ خوف بھی نکل گیا کہ وہ چڑیل ہے اور جب یہ مشن اُنہوں نے ترک کیا تو کینی پھرا کیلی ہو گئی بھیڑ کا لس کتنا جاندار تھا۔ دُھوپ کی حدت جیسا جونو کیلے منہ والے ڈوڈے کھولتی اور پھٹی کے ریشے پھول کی طرح کھلاتی ہے اور اگر بروقت نہ نکلے تو لسلسے برف سے ریشے بنولے کے پیٹ سے لپٹے کالے پیلے ہوسنڈی ہو جاتے ہیں۔

وہ ڈھائے والے ٹبے پر چڑھ آسمان کے آخری کناروں تک پھیلے گنجی بار کے میدانوں میں تاکتی اور جہاں چرواہے اور بکریاں نظر پڑتے تو ئے ٹبے، کھال بنے، کماد نرے پھلانگتی ہوئی پہنچتی اور اُن کے ہمراہ اخروٹ اور بنٹے کھیلتی، کشتی لڑتی بندر قلعہ، وانجھو اور کوڈی کھیلتی، چارو اپنی سانگلوں کے سروں سے لٹکتی پوٹلیاں کھولتے۔ اپنی اپنی روٹی میں سے ایک ایک ٹکڑا توڑ اُس کی سمت اُچھال دیتے۔

گندم کے پودوں کی ہم شکل جوتری کھودتی ہوئی عورتیں مٹھیاں بھر بھر پُشت پر بندھی جھولیوں میں گھاس ڈالتیں۔

''اللہ روزی لگانے والا ہے۔ دیکھ یتیمڑی کی روزی ان چاروؤں کے ہاتھوں لگ گئی۔ کسی روز کوئی بڑا انکر گیا تو مَر جائے گی، چل نکے موٹے کی تو خیر ہے۔ یونہی تھوڑا دیتے ہیں ہاتھ شاتھ تو پھیرتے ہی ہیں نا۔''

''اری چھوڑ ایسی مرنے والی ہوتی تو پلتی ہی نہ، جس طرح یہ جی ہے جنور کا بچہ بھی تیسرے روز مر جاتا۔ پر ہم کیوں کچھ کہیں اپنے سگے تائے چاچے چُپ ہیں تو ہم پرائے کیوں بولیں۔'' گھاس کی پنڈیں باندھ ساری سرسوں کے کھیت میں بجھ جاتیں۔

''ھائے نی! سکھیو! ساگ کے بنا تو روٹی ہی اندر نہ جائے۔ فضل جٹ کی مکئی میں کوئی سونی گندلیں اور ساتھ باتھو کا ساگ بھی......''

رات وہ اپنی جھگی میں اکیلی ہوتی، جہاں نہ کبھی دِیا جلا نہ چولہا۔ خوف پل پل کے جھپے مارتا

پیٹ میں دھنسے ہوئے گھٹنے اور گھٹنوں میں ٹھنسے ہوئے ہاتھ، وجود کی گٹھڑی پناہ کی تلاش میں چاروں دیواروں سر ٹکراتی۔

''نھورے نھو! میری جھگی میں آ جا رے نھو۔''

حلق میں پلٹتی چیخیں یوں باہر نکلتیں، جیسے چمنی سے دُھواں گھُٹ کے نکلتا ہو۔

''نھورے نھوا پنے چولے صافے میں آ جا رے نھو! کرماں والا سکارے، رے نھو۔''

کیڑوں کا کھایا جھلنگا چارپائی میں موت موت سیاہ پڑا بان رنگ بدل گیا۔ پیٹ کا درد پنڈلیاں توڑنے لگا۔ چپچپاہٹ رانوں پہ لتھڑی گئی۔ مجلی (دھوتی) چپکنے لگی۔ کمر کی ہڈی چارپائی کے جھولے میں مُڑ تڑ گئی۔ جب دادی زینو نے پانی کا بھرا ایک دھار بنا واپس کھال میں بہا دیا۔

''ری کینی! خُود کو سنبھال نی ٹیار ہو گئی ہے۔ ری بُری...... اَب چھوکروں کے لاگے نہ لگا کر ری کملی، تیری عزت کا اللہ ہی بھلی وال، ہائے یتیمڑی کا اللہ راکھی وال...... ہیں نی پیٹ دَرد لگا، ٹانگیں کھستی ہیں نی۔ کوئی چائے کا گھونٹ بنا دیتی پر دُودھ کہاں...... جندڑی کے بھورے بکیں تو تھما بنا بوہے (دروازے) پہ کھڑا کر دوں، کوئی تو ڈر خطر رہے۔ ہائے نی جوان جہان، ہر کتا بلا آندا جاندا، مُنہ مارے اور نہیں تو پانی کے بہانے ہی آن کھلوئیں۔''

گھاس کھودنے والیاں حیران ہو ہو جائیں۔

''پاتھی کے کیڑے پر بھی جوبن آیا تو لشکارے مارنے لگا۔ اری جوانی تو گدھی پہ بھی آئے تو وہ بھی مجاج کرے۔ سوکھا ڈھینگر بھی ساون ہرا کر دے۔ مینہ لگے تو تھل بھی ٹوبے ہو جائیں۔ سنبھال کے رکھ نی اپنا جوبن کملیئے، جوبن بڑی خرابی آپ ہی مارے آپ ہی اپنے ہاتھوں مَر جاوے۔ آندی جوانی ہر کوئی دیکھے جاندی کسے نہ ڈٹھی۔''

ساون کی جھڑی لگے وہ پانچواں روز تھا۔ کپاس کے کھیت پانی کی فراوانی سے سڑنے لگے تھے۔ یہ کپاس کا پودا بھی عجب ہے پانی کی کمی سے بھی کرنڈ ہو جائے اور پانی کی زیادتی سے بھی گل سڑ جائے۔ غوطائے ہوئے پودوں سے پانی نکال ایک دوسرے کے کھیتوں میں لوگ ڈالنے لگے تھے اور خون ریز تصادم ہوئے تھے۔ کتنے پر یا پنچائیت چڑھ گئے کتنے تھانے کچہری جب اُس کی جھگی کا شکستہ دَر توڑ کے اَندر آنے والے وہ چار یا پانچ تھے۔ وہ شب بھر چیختی رہی پر غوطائے ہوئے پودوں میں سے پانی نکالنے

والا آج شاید کوئی نہ تھا یا شاید سارے اکٹھے ہو کر اُس کی جھگی پر ٹوٹ پڑے تھے اور لسں کا پیاسا وجود لسں کے افراط میں غوطا گیا۔ پیاس بجھانے اور ڈوب مرنے میں شاید ایسا ہی فرق ہے۔

پیشاب اور گندگی کے کیڑوں سے پٹ بان کی چارپائی سے مچھلی مرے پانی سی بو چھاڑ اُٹھتی تھی جس کے تعفن سے سارے کیڑے اور لاروے مَر گئے، باہر کماد کے پاندوں پر مینہ کی تراڑیں پڑتی تھیں، اور کپاس کی پھٹل گڈی کی کٹوریاں بھر بھر اوندھاتی تھیں۔ آج تو کوئی چارو بھی شاید ریوڑ لے کے باہر نہ نکل سکا تھا، اور اُسے روٹی کا کوئی ٹکڑا بھی نہ مل سکا تھا۔ آٹے والی مٹکی خالی اور پانی والی گھڑی سُوکھی تھی، جس کے پیندے میں نمک اُگ اُگ تھور ہو گیا تھا۔ سارے شلجم پھیکے تھے اور گنے سارے کچے اور بے رَس تھے۔ جنہیں کھودنے اور توڑنے کی اُس کی ساری سکت وہ باری باری اُچک لے گئے تھے اور بدن کے سارے توپے یکبارگی اُدھڑ گئے تھے۔ اندر اور باہر کن من برستی تھی۔

کیوں لائی اُو بدلانگی کنڑیں

نکی کنڑیں نکی اور کنڑیں شہباز کنڑیں

کیوں لائی او بدلانگی کنڑیں

وہ ڈھائے والے ٹبے سے اُتر نرے کے بنے بنے چلنے لگی۔ ٹیوب ویل کے کھاڈے سے بُک بھر کر آدھا پیا اور آدھا منہ پر مارا۔ جھال والے کھال کے چوڑے پاٹ کی ریتل میں چاروں کھرے پانی کی چھل سے دھلتے تھے۔ پہلا کھرا اکو نائی کی ہٹی میں گواچ گیا۔ اکو نائی نے ٹین کے ڈبوں، گُڑ بنولے کی بوریوں کے پیچھے ترازو کی اوٹ لے لی۔ وہ ہٹی میں گواچا (گم) ہوا کھرا ڈھونڈتی رہی اور جب باہر نکلی تو اُس کے سَر پر آٹے گھی شکر کی پوٹلی تھی۔ چُپ چپیتے جیسے یہی اُدھار وصول کرنے ہی تو آئی ہو۔ سَر پر پنڈ دھرے کھال کے ساتھ دھریک، کیکر کی قطار کے نیچے گوبے پھوسی سے بچتی بچاتی چلنے لگی چارپائیوں کی چوگاٹھوں سے بندھی جھولیوں میں بچے سوتے تھے اور کنواریاں کروشیئے کے رُومال اور جھالریں بنتی اور ٹپے گاتی تھیں۔ سامنے چوک میں ون تلے کپڑے کا ڈپو لگا تھا۔ کل رات کی بارش نے وَن کی لٹکتی جڑیں دھو دھو کر سیاہ کر دیں تھیں۔ کپڑے والے نے لیلن کے پھولدار تھانوں کی اوٹ لے لی۔ گم کھرے کے پیچھے اور ایڑیاں سارے جنڈ تلے بکھرے تھے۔ اور وہ پیلوں توڑ توڑ خالی پیٹ بھرتی تھی اور جب وہ بائیں گلی میں پلٹی تو ایک ہاتھ سَر پر پوٹلی سنبھالے تھا اور دوسرا کپڑے سے بھرا سیاہ شاپر

لہراتا تھا، سامنے چھپری میں باکو موچی چمڑے پر ہتھوڑے مار مار اُسے سیدھا کرتا تھا۔ ہتھوڑے والا ہاتھ یوں رُک گیا جیسے چمڑے اور ہتھوڑے کے بیچ کینی کا ننگا پاؤں آ گیا ہو۔ ہتھوڑے والا ہاتھ گھ چپا ناپ لیتا ہوا ململ کے کپڑے میں لپٹے جوتے پھر ولنے لگا ہری نوکوں والا جوتا اُس کے پَیر میں ایسے فٹ آیا جیسے سائی (آرڈر) کا بنا پڑا ہو۔

چوک کی چوتھی گلی میں اڑوڑی کے ڈھیر کے پیچھے گلو درزی کے سامنے کپڑے والا شاپر نوکوں والے جوتے نے پنچا۔

''ناپ تو تُو لے ہی چکا ہے اَب اسے سی بھی دے۔''

کچے پاؤں میں نوکوں والا جوتا کتنے بوجھ سہارے گھسٹتا واپس مُڑا۔

سکینہ کی جھگی بس گئی تھی برسوں کے بجھے چولہے میں کچی لکڑیاں تڑختی تھیں اور چنگاریاں اُڑاتی تھیں اور بند سینے والے اُپلے دھکتے تھے اور دُھواں چھوڑتے تھے۔ دیئے میں روئی کی بتی سنہری زبان لہراتی تھی۔ آٹے کی بھری مٹکی پر پڑی کنالی میں تون بندھی تھی اور سوکھی گھڑی پانی سے لبالب تھی۔ زُبان اناج کے ذائقے لیتی تھی اور بدن ذائقوں کی کسمساہٹ میں ٹوٹتا تھا۔ بستے گھر میں تو آتا جاتا لگا ہی رہتا ہے۔ سکینہ دَر پر آنے والی ہر آہٹ کی منتظر رہتی۔

''کتنے ہو۔''

''تین''

''ڈیڑھ سو ہوگا۔''

''مَر کے پچاس بنے ہیں۔''

تو جاؤ پھر ماؤں کے گوڈے سے لگ کے میٹھیاں کھاؤ۔''

''دروازہ تو کھول سُن تو سہی باقی ادھار سہی۔''

''نہ یہ گُڑ کی بوری ہے کہ ساونڑی (خریف) کے کارے (ادھار) پر اٹھوا دوں۔ نقد لاؤ نہیں تو پھِتاں کھاؤ۔''

تکرار اور چلتی تو سودا سکینہ کے حق میں طے بھی پا جاتا پر سکینہ کے بدن میں طلب کا احتجاج ہر آواز کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا جیسے یہ مردانہ آوازیں سوڈا کاسٹک کی چٹکیاں ہوں جو ماس کے اندر

چھوئی جارہی ہوں۔

''اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔''

کھسر پھسر شور ہو جاتا اُس وقت تک وجود کا آٹا جاجاسے اپھر چکا ہوتا۔ سرکنڈوں سے نکل کوڈیاں والا شہتیری سے بل کھا جاتا اور گیدڑ بھیڑیئے خربوزوں کے واڑے اُجاڑنے لگتے۔ وہ اپنے ہی بدن کی بغاوت کے ہاتھوں پسپا ہو جاتی، لمس کا بھوکا، لوں لوں مُنہ کھولے زبان چاٹتا۔ ٹھہرے ہوئے پانی والے جوہڑ کی بُو جس کی ساری مچھلیاں مدت سے مرگئی ہوں اور سارا پتھر لکڑ ہضم، کینی کی بھوک کا ہوکارا گنجی بار میں مچ گیا تھا۔ بار کے مردوں میں شرطیں بدھ گئی تھیں۔ کتنے جھکے سَر اُٹھ گئے اور کتنے اُٹھے سَر جھک کر چلنے لگے۔ کئی گیہوں کی بوریاں اور بکرے جیت گئے اور کتنے مونچھیں اور پٹے منڈوانے پر مجبور ہو گئے۔ کاتک چڑھتے قاسو ملویر کے بیاہ کے گیت دھرے گئے تو کینی بھی ڈھائے والے ٹبے سے اُتر ہری نوکوں والے جوتے پر نیلی کنی والی لنگی جھلاتی بسر شام چوک سے گزرنے اور گنگنانے لگی۔

مچھلی ڈھائے پٹی والے دی
میں نوکر کرماں آلے دی

کیوں لائی او بدلا نکی کنڑیں
نکی کنڑیں نکی اور نکڑیں
شہباز کنٹریں کیوں لائی اُو بدلا نکی کنڑیں

چاروں نکروں کی ہٹیوں پر بیٹھے مرد انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی زبان تلے دبا سیٹیاں بجاتے، نوٹوں کو ناخن مار کھڑ کھڑ بجاتے اور شلواروں اور دھوتیوں کے آسنوں میں خراشتے، قہقہے ریڈیو کے گانوں کو گوندھ دیتے۔

دادی زینو کے کوٹھے میں گھپ گھپ گھڑا اور پرات بجتے۔

گھڑا وجدا گھڑولی وجدی

گانے والیاں ایک دوسری کے چٹکیاں بھرتیں، آواز ڈھے کنویں میں مُنہ کے بل گرتی۔

راوی دا رانجہ وے لے کھل چوڑیاں

چوڑیاں

''نی کینی ''

زبانیں ایک دوسری کے کان پر لہراتیں۔

خان شہزادہ وے لے کھل چوڑیاں

''سارا چالا کنجریاں بار ''

جہاں توں کھلیاں، ویکی نوں پوریاں

خان شہزادہ وے لے کھل چوڑیاں

دادی زینو گرو کی بھیلیاں کن کن رنگلے چھکو میں سجاتی جو شیرینی کے طور پر گیت گانے والیوں میں بانٹی جاتی تھیں۔

''بیں نی گانون پورا کرو، بھلا اس چھوری کے تو پے کیوں لگتی ہو اس کا جی نہیں چاہتا گانے کو، اسے بھی باری لینے دو۔''

''ھائے کملی دادی زینو باریاں ہی تو یہ لگتی ہے ایک چھوڑ چار چار ''

پچھلے والی انگلی چھلنی سے پرات پر بجتی۔

''جس کی ماں خصم مرے چوتھی رات دوسرا کر گئی اسے بج پال کا کیا پتہ۔''

ھائے والا یہ سارے کا سارا حلق میں اٹک آیا۔

''نیلی نی والی لنگی باندھ لینے سے کئی عزت ہاتھ نہ آوے۔ بھینڑیئے! تجھے کیا خبر جوانی کی ابلتی کنڑاہی پر ماں پیو کی لج کی چادر کیسے ڈلتی ہے۔ تو تو بیچ بازار کڑاہا کالے بیٹھی ہے۔''

کھڑے کے منہ پر جوتے کا منہ کھپ کھپ بجتا لڑکیاں بکلیں سمیت ایک دوسری سے پنڈ کی طرح بندھ جاتیں جیسے اس کے سر سے نکل جانے والی ساری جوئیں لوں لوں میں پڑ گئی ہوں۔

راوی دا رانجہ وے لے کھل چوڑیاں

خان شہزادہ وے لے کھل چوڑیاں

جیسے گیت نی لمبی لے سارے گنجی بار کو پانتی راوی کے اس پار خان شہزادے کی ڈھوک میں

اُترتی ہو۔ چوڑیوں کی حریصانہ طلب لڑکیوں کی پتلیوں میں چراغ جلاتی، جن میں انتظار اور صبر کی بھڑک تھی، جیسے بچیوں کی نگاہوں میں گڑ کی طلب لَو بھر دیتی تھی، جو گنجی بار کے زرخیز میدانوں کو دہکاتی، راوی کے پانیوں میں کوندتی تھی۔

پر وہ کس کا انتظار کرے، کس کے لیے جوانی کی دہکتی انگیٹھی کو صبر کا دَم لگائے۔ راوی کے کس کنڈے (کنارے) پہ اُس کا خان شہزادہ بستا ہے، جس سے وہ چوڑیوں کی طلب کرے جب کہ اُس کی دونوں کلائیاں تو بھری ہیں۔ ہری پیلی لال سبھی رنگوں سے۔

راوی دا راجہ وے لے گھل چوڑیاں

پباں توں کھلیاں وینی نوں پوریاں

سکینہ نے جھال والے کھال کی بھیگی ریتل میں جوتا جما کر پھلانگا، جوتے کے تلوے سے اُڑتے ریتل کے چھینٹے کھال کا بنا کاٹتے کسان کے چہرے پر بکھر گئے۔ جھکے کندھوں والے نوجوان کسان نے چارخانہ صافے سے مُنہ رگڑ کر صافہ جھاڑا۔

''تجھے نوکوں والا کھسہ ملا ہے کہ بے حیائی کا کاگت کہ دوسروں پر گاب اُچھالتی پھرتی ہے۔''

کینی چھلانگ لگا واپس پہلے کنارے پر آ گئی۔

راوی دا راجہ وے لے گھل چوڑیاں خاں شہزادا وے......

''اس گاب کو اُتار دے نھتو، نھتو تُو ہی اُتار سکتا ہے رے نھتو......''

''میرا جی تیرا چولا پہننے کو چاہتا ہے رے نھتو......''

''میرا جی تجھ سے بھڑنے کو چاہتا ہے رے نھتو، میرا جی تیرا پَرنا اوڑھنے کو چاہتا ہے رے نھتو، میرا جی تیری ڈبی کی دھاریں لینے کو چاہتا ہے رے نھتو......''

''میرا جی تیرے نام کی چوڑی پہننے کو چاہتا ہے رے نھتو۔''

واورولے کی زد میں آیا اکلوتا ککھ زمین کے سینے پر چکراتا اُوپر اُڑنا چاہتا۔ پر ہوا نیچے ہی نیچے دباتی۔ ہاتھ پیر جوڑتی۔ پنڈلیاں جھنجھوڑتی، گھٹنے چھوتی خود گھٹنوں گھٹنوں ریتل میں دھنسی۔

''پر میرا پرنا تیرے جیسی کے لیے نہیں ہے۔ تجھے پرنوں کی تھوڑ ہے کیا؟ تیری وینی تو ہر رَنگ کی چوڑی سے بھری ہے۔''

نتھو نے کسی میں بھر کر ریتل بنے پر ڈالی اور کسی کی پُشت سے اُسے تھپتھپایا۔ سرونوں کے پیٹ میں ہلکی سرسراہٹ اُبھری۔ پانی نوٹ کر کسی دوسرے کھیت میں نکل گیا جیسے چوری چوری اپنی ہی دیوار میں سیندھ لگا دی ہو۔

''او نتھو! پانی ترٹ گیا، بن باندھ۔''

پرلی ببک سے ہرنولیوں سے ہو کر کوک پڑی۔ نتھو کندھے پر کسی رکھے کھال ناپ گیا۔

سانوں عشق نمانا کیتا

اساں گھبرو ہاسے باردے

''نتھو رے نتھو! اپنا پرنا اُڑا دے رے نتھو، اپنے نام کی چوڑی پہنا دے رے نتھو۔''

ریتل اُڑاتے جوتے گاب میں لتھڑ گئے اور سرونوں کے پیٹ میں وہ اوندھا گئی۔ ساری ہری پیلی لال چوڑیاں گار میں دھنس گئیں۔

کھال میں لبالب بھرے پانی میں پیڑوں کی ساول سیاہی چھوڑتی تھی۔ انگڑیاں توڑتی کچی مہک ادھ کچرے سٹوں میں پکتی تھی۔ چاندی کا دودھیا پرت گنجی بار کی زرخیزی پر بچھا تھا اور وہ کوٹھڑی کے کچے فرش پر ہونکتی تھی۔

مچھلی ڈھائے پئی والے دی

میں نوکر کرماں آلے دی

کیوں لائی او بدلا نکی کنڑیں

نکی کنڑیں نکی اور کنڑیں شہباز کنڑیں

کیوں لائی او بدلا نکی کنڑیں

آج در پر آنے والی پہلی ہی صدا پر دروازہ کھل گیا، آج تو اُسنے یہ بھی نہ پوچھا تھا۔ '' کتنے ہو، کتنے لائے ہو۔''

فصل تو ابھی کھیتوں میں پکتی تھی۔ بھرولے چیندوں سے لگے تھے، اور بوسیدہ کرتوں کے کھیسے اُدھیڑے تھے پر چھت کی کڑی سے کوڈیاں والا لبراتا تھا اور باہر لے مکئی کے بھٹے چباتے تھے اور اپنی

بھالوں کی سی کتلیاں کوٹھڑی کی کچی دیواروں میں چبھوتے تھے۔ وجود کی گٹھڑی میں خوف انگڑائیاں توڑتا تھا جسے لُس کا پھاھا آسودہ کرتا تھا۔

دادی زینو نے سَر سے روٹیوں کی بھری چنگیر اُتار بنے پہ رکھی۔ جھجری کے مُنہ پر دھرے جوتے مَل مَل دھونے لگی۔

''نی کینی صابون کا کوئی چیچکا ہے کہ نہیں۔''

سکینہ صابن کا ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کھال ٹاپ آئی۔

''نی کینی نی گدھی! تو بھری ہے انی تیرا تو ساہ نہیں رَلتا (سانس ملتا نہیں گدھی!)، کھوتی! تُو بھری ہے۔''

دادی زینو کے ہاتھ سے جوتے کا پَیر بہہ گیا۔

''پکڑو نی پکڑو۔ پولا گیا۔''

ہاتھ سے صابن کا چیچکا بھی پھسل گیا۔

بنوں پر جٹ مدھانہ اور دھمی سٹی کھودتی عورتیں درانتیوں کے منہ گھاس کی پنڈوں میں اُڑس کینی کے گرد ٹھک بیٹھیں۔

''ھائے نی تیری تو وکھیاں چڑھی ہیں۔ چوتڑ کھلے ہیں تو یک نال بھری ہے۔''

''جو آگ پھانکے وہ انگار ہگے بھی، کینی کھوتی مرجا، وٹر۔ نہ ماں نہ بہن، کون کجے تیرے گند۔''

دادی زینو نے اوڑھنی کے پلو میں لپٹے ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھوں کے کنارے رگڑے اور ناک سڑنکی۔

''ھائے نی کرماں سڑی، ماں مٹر یتیمڑی! کوئی اپنا ہوتا تو جوانی چڑھی کو بیاہ دیتا، جوانی دی تپ ڈاہڈی بری، ھائے بار برنگ میں اکلی (اکیلی)، جس کا جی آیا بھری پری فصل اُجاڑی، ھائے لاوارثی تو چڑی بھی نہ ہوئے ہر کاں کتا منہ مارے۔''

پھتو نے کھوکھریوں سے خراشی ہوئی کلر چڑھی کلائیاں کینی کے گلے میں ڈال دیں۔

''پتہ تو سارے چک کو ہے۔ منہ سے نام بتادے۔''

''ابھی دیکھواللہ کے رنگ، داروأندر، سارا گند مند باہر۔''

''دادی زینو۔''

سکینہ ایسے چیخی جیسے کوڈیاں والا چھت سے اُتر اُس کی چارپائی پر آ ٹپکا ہو۔تڑپ کر چارپائی سے لڑھکی اور لوٹیں کھاتی چاروں دیواروں سے ٹکرانے لگی جیسے باہر لے (سوَر) کتلیاں مارتے ہوں اور بوسیدہ بنیادوں کا ارتعاش کڑیوں کو لرزاتا ہو۔

''دادی زینومَر جاؤں گی مَر......''

بھاگو دائی نے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''نہ تو مرتی نہیں تیرے جیسی کالکیں۔''

''زور لگا نیچے کو، سارا زور تو چیخنے میں ضائع کر رہی ہے...... پتے میں ہے جتنی تو نازک اشناک ہے......''

وہ بھاگو دائی کے ہاتھوں سے مچھلی سی چھٹی، اور اُچھل کر طاق پر جی دروازہ کھل کے دھڑ سے دوبارہ بھڑا۔

''دیکھ اس کے کھسکھن۔نہ اُس ویلے بو ہے بھنتی (توڑتی) تا جس ویلے...... پر کیوں بھنے...... چسکے...... ڈاہڈے چسکے......''

کئی ہاتھوں نے جکڑ چاروں ہاتھ پَیر میں جیسے کیل ٹھونک دیئے۔

''چکھ مزا، ڈلواتا، سوکھا، نکلواتا، اوکھا۔''

لکھو ماچھن نے جھک کر اندر جھانکا۔

''ایسے کھسکھن کرتی ہے ابھی تو کچھ بھور ابھی نہیں۔''

بھاگو دائی نے دوائی کا سلفہ ایک اور رکھا اور ساتھ ہی کڑوے تیل کا پاؤ بھر پھینکا۔

''رت ٹر پئی اے (خون چل پڑا ہے)۔''

عورتوں کی آشوب زدہ آنکھیں مسکرائیں اور پلو کس کر ناکوں پہ لپیٹ لیے۔

''ابھی کَل مولوی رحمت علی کی نکی اچھی کی۔اللہ پہ یقین کر، دادی زینو! ادھر دار واندر اُدھر سارا گند باہر۔90، 98، 86، 88 کس کس چک میں میرا نام نہیں وجتا۔سارا بار میرا کمال مانے

دوائی کا ایک بڑھا (پھاھا) ہی بڑا۔''

''مولوی رحمت علی کی نکی گندل جیسی ملوک، یہ تو نرا کھنگر پکا روڑا اسکے تو ایک اور رکھ۔ بڑا چیڑا ہے اس کا۔''

کسی بکل میں منہ ہلا۔

''چیڑا (سخت) کیوں نہ ہو۔ کسی ایک کا تھوڑا ہے کتنوں کا زور لگا ہے۔''

سیدو اوڑھنی میں منہ ڈال کھر کھر ہنسی۔

''نہ تو بھی نہ بہتی کھر، تیرا بھی میں نے ہی...... بھول گئی......

تجھے تو یاد ہوگا دادی زینو! منتوں میں ستھری ہوئی تھی دس سال تو ہو گئے ہوں گے۔''

''پرا سے بھی تو دیکھ ڈھیم سی پڑی ہے اندر باہر کوئی ہل جل نہیں۔''

دادی زینو نے سکینہ کے بے سدھ وجود کو ٹانگ سے پکڑ کر ہلایا۔

''ھائے نی کھوتیو! یہ تو اکڑی پڑی ہے۔ ٹھنڈی ٹھار۔''

''ھائے نی مرگئی اُکا مک گئی۔''

دادی زینو کی چیخ کے ہمراہ، عورتیں دانتوں تلے پلو دبائے کوٹھڑی سے یکبارگی باہر نکلیں جیسے ڈھائے والے ٹبے سے ریوڑ اُٹھے وا اُترتا ہو جس کے پیچھے بگھیاڑ (بھیڑیا) لگا ہو۔

اندر جھگی میں کوڈیوں والا چھت کی شہتیری سے ٹل کھول نیچے اُتر آیا تھا اور سکینہ کے کھلے وجود پر آزادانہ رینگتا تھا۔

جناح باغ

اس شہر کے جناح باغ میں گرمیوں کی شام خوب پُر شباب ہوتی ہے۔ لوگ باگ سرِ شام ہی گرمی سے گھبرا کر اپنے گھٹے ہوئے گھروں سے رستے تڑوا یہاں پناہ گزین ہو جاتے ہیں۔ وسیع و عریض گراؤنڈوں میں اندر کا حبس، تھکن اور تندی یہاں اُنڈیلتے ہیں اور خالی غباروں سے وجود کو بھرتے ہیں۔ تب جبڑے کچر کچر چلتے ہیں اور پیٹ گھاس دخاں پھولتے ہیں۔ باغ کے سارے لانوں میں چھوٹی بڑی انسانی کیاریاں کھد جاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات کھیت کے کھیت بچھ جاتے ہیں۔ خصوصاً کینٹین والے گراؤنڈ میں گھاس مر جاتی ہے اور انسانی لاروے بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ باغ کے گیٹ سے انسانی سیلاب موجیں مارتا، لہریں اُڑاتا چھینٹے بکھیرتا، پٹخنیاں کھاتا باغ میں مار کرتا ہے کہ آتش فشانی دہانے سے انسانی لاوا پھوٹتا ہے۔ گڈمڈ گاڑھا سیال پتہ نہیں کس کا ہاتھ کس کے بازو سے جُڑا ہے اور کس کا چہرہ کس کے بدن پہ ٹکا ہے۔ انسانی گٹھڑیاں باغ کے اندر دھکا کھا کر اپنے اپنے وجود کی خبر گیری کرتی ہیں۔ اسی گیٹ کی سیدھ میں شالیمار ریستوران کا بند دروازہ ہے، جو کھلنے کے انتظار میں ٹھنٹھ ہو گیا ہے، اور باغ کے گیٹ اور ریستوران کے دروازے کے درمیان کھڑا بوڑھا برگد گنگ رہ گیا ہے۔

ریستوران کے دروازے کے اندر کھڑا گارڈ دروازہ کھولنے کے فرض کی ادائیگی کے انتظار میں اونگھ اونگھ جاتا ہے۔ اندر بڑی میزیں اور کرسیاں جیسے زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں۔ ہمیں یہاں آخر کس

لیے رکھا گیا ہے۔ ویٹر خالی میزوں کے پاس کھڑے خشک سیاہی والے بال پوائنٹ اور بوسیدہ آرڈر بک پکڑے، بوڑھے برگد کی طرح حیران ہیں اور جب چونکتے ہیں تو سامنے رکھے ٹی وی پر خبر نامہ دیکھنے لگتے ہیں، جہاں بیانات بڑھتے ہیں اور نتائج کو انتظار کا دم لگا ہوا ہے۔

ہر ہر شئے میں انتظار گھونسلا بنا بیٹھا ہے انتظار...... جس نے جذباتی بے تابی کے لحات اُتار کر ایک سنجیدہ ٹھہراؤ پیدا کرلیا ہے۔ جیسے جھاگ کے بیٹھ جانے کے بعد سیال ٹھوس ٹھوس محسوس ہونے لگتا ہے اپنے منصبی فرائض ادا نہ کر پانے سے جو خلش کا کانٹا سا چبھا رہتا ہے۔ اس خلش کی چبھن اور ایک پُروقار بے بسی یہاں کی گنگ فضاؤں میں ٹھہری ہے۔ چھری کانٹوں کی کھنک چپ ہے۔ نیپکنوں کے پھول بند ہیں۔ مینو بک کے اوراق زرد ہیں۔ درودیوار پر اِک پُراسراریت گھلا انتظار ٹنگا ہے، جس کے سکوت کے مہین غلاف میں نادر پینٹنگز، سینریاں اور سجاوٹی چیزیں سونتھ ہیں۔ جناح باغ کے ماتھے پہ ٹنگا یہ ریستوران جیسے کسی مرحوم بزرگ کی کوئی نایاب تصویر...... عظیم الشان، پُراسرار، مقدس اور پُرہیبت مصری ممی ہو جیسے...... اسی ریستوران کی بغل میں ایک کینٹین ہے، جہاں میرے خیال میں غیر معیاری اشیائے خوردونوش بکتی ہیں۔ باسی کبابوں والے برگر، فنگس لگی ڈبل روٹی کے سینڈوچ، میلاوٹ شدہ بیسن والے پکوڑے اور زہریلے سموسے، جعلی بوتلیں، جوس اور ٹن، مہینوں پُرانے گول گپے اور دہی بڑے، جن پر اس طرح ٹوٹتے ہیں یہ جناح باغ والے، جیسے بھنڈارے کا لنگر کھلا ہو، کینٹین والا پورا گراؤنڈ بھرا ہے۔ چپس بسکٹوں کے خالی ریپرز، سموسوں پکوڑوں والے چکنے اخباری کاغذ اور لفافے، مونگ پھلیوں اور گنڈیریوں کے چھلکے، چبائے ہوئے بھٹے اور اگلی ہوئی چیونگم، ٹافیاں، چچوری ہوئی ہڈیاں اور نان روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے، جیسے سب کچھ گوندھ کر مرتی ہوئی گھاس کے اُوپر ایک لیپ سا چڑھا دیا گیا ہو، جس میں انسانی لاروے کلبلا رہے ہوں، جیسے کچرے کے ڈھیروں میں کیچوے، مضرِ صحت گھی تیل کی ہمک، کالی بھجنگ کڑاہیوں، توؤں اور دیگچیوں سے اُٹھتا ہوا کثیف دُھواں، اسی چُلّو بھر پانی سے بار بار دھلتی سینکڑوں پلیٹیں، ایک ہی غلیظ دھجی سے اُنہیں رگڑتا ہوا چھوٹا، جس کے ناخنوں اور ہاتھوں کی دراڑوں میں پاؤ بھر میل دھنسا ہوتا ہے، کس کس منہ سے لگے ہوئے چیچ گلاس جو پھر اُسی غلیظ دھجی سے پونچھ کر اگلے گاہک کو پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ مجھے عجیب سا خیال گزرتا ہے یہ کینٹین بھی کسی سستی طوائف جیسی ہی ہے۔ اَن گنت گاہک ہیں کہ باری کے انتظار میں باہم دست و گریباں ہیں اور دھکم پیل مچا رہے

ہیں۔ نام بھی عجب ''ڈم ڈم ہوٹل'' اور یہ شالیمار ریستوران جس کے اندر کا منظر باغ کی سمت لگے اس کے بغلی شیشوں سے جھلکتا رہتا ہے۔ جیسے بہت سی روایات اور بھرموں کا بوجھ سہارے رستہ بچھڑ کر حیرانی کی کوئی متین علامت بن گیا ہو۔ پر اعتراف نہ کرتا ہو کہ اعتراف بے بسی کا تماشہ ہوتا ہے۔ بے بسی، ناکامی اور غم ناکی بھی اپنا ایک بانکپن، وقار اور بھرم رکھا کرتے ہیں۔ یہ ریستوران بھی بھکاری کے کشکول سی بے وقعتی نہیں آنکھ کے آنسو سی عظمت رکھتا ہے گویا، خوبصورت نیچرل مناظر کو پینٹ کرتی ہوئی، سینریاں، دیواروں سے ٹنگی قومی بزرگوں کی تصویریں، سفید بُراق میز پوشوں پر رکھے نسواری نیپکنوں کے پھول، صاف ستھری، وردیوں والے بہرے، کلف لگی لمبی سفید ٹوپی والے باورچی جو گواہی دیتے ہیں کہ یہ ریستوران معیاری صفائی اور خوراک فراہم کرتا ہے لیکن پتہ نہیں اس ریستوران کو کوئی نظر لگی ہے کہ آسیب ہے اس پر کہ اچھے بھلے پڑھے لکھے بھی بس ڈم ڈم کینٹین پہ ٹک جاتے ہیں۔ سیدھے منہ والے اس معیاری ریستوران کی طرف دو قدم آگے نہیں بڑھ پاتے، میں نے سوچا شاید اس کے نرخ زیادہ ہیں، اسی وجہ سے کوئی شخص اس میں داخل ہونے سے کتراتا ہے، شاید ہوٹل کے منتظمین نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ اگلے روز کھانوں کا نرخ نامہ ریستوران کے ماتھے پر لٹک رہا تھا اور یہ نرخ تقریباً اسی کھوکھا ہوٹل کے برابر ہی تھے۔ شاید اس سے بھی کم مجھے دکھ ہوا، جیسے کوئی تاریخی ورثہ اونے پونے نیلام ہو جائے۔ اس نرخ نامے نے بڑا حوصلہ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرے پاس جب بھی اتنی بچت ہوگئی کہ میں بچوں کو تفریح کروانے باہر لا سکوں تو اسی ہوٹل میں انہیں تفریح کرواؤں گا کیونکہ ہمارے ہاں تفریح کا مطلب کھانا پینا ہی تو ہے۔ یہ کینٹین میری چڑ بنتی جا رہی تھی۔ روزانہ شام کو چہل قدمی کرتے ہوئے جب بھی اس کینٹین کے قریب سے گزرتا، چیختے دھاڑتے ہوئے فلمی گانے، کان پھاڑتے ہوئے آوازے، سیٹیاں، پان تھوکتے اور سگریٹ کے دھویں اُڑاتے آوارہ عناصر کی فقرہ بازیاں، جملے اُچھالتے ہوئے لڑکیوں کے گرد اگرد منڈلاتے ہوئے لفنگا باز اور سامنے ٹی وی سکرین پر تھرکتے گوشت کے بڑے بڑے پارچے، جناح باغ کے لوگ کس قدر گوشت خور ہو چکے ہیں۔ سونگھتے ہیں تو گوشت کی بُو، بولتے ہیں تو آدم بُو آدم بُو۔ ہڈیوں کا گودا تک چُوس چچوڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ یہ گوشت خور چھوٹے بڑے گوشت پہ جناح باغ میں ہر سو رالیں ٹپکاتے پھرتے ہیں۔ کینٹین والا گراؤنڈ سارا رالوں سے اٹا رہتا ہے۔ چھوٹے بڑے گوشت کی چنائیں، چونیاں، ڈھلائیں، کلھائیاں، ہر سو بکھری ہوئیں اس گوشت

خور ماحول میں والدین اپنی جوان بیٹیوں کے ہمراہ بیٹھے گول گپے کھا رہے ہوتے ہیں اور سامنی سکرین پر گوشت کی ڈھلانوں، چوٹیوں کا نظارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے انہیں اُٹھا کر ریسٹورنٹ کے باپردہ اور صاف ستھرے ماحول میں بیٹھا آؤں۔ جہاں مہذب بہرے انتہائی چمکدار برتنوں میں انہیں کھانا پیش کریں اور خود ہاتھ باندھے مؤدب اگلے حکم کے منتظر ہیں کیونکہ یہ فیملیاں با آسانی یہاں کھا پی سکتی ہیں۔ پر یہاں کھاتی نہیں ہیں وہیں کھاتی ہیں۔ جہاں اُنہیں نہیں کھانا چاہیے۔ پتہ نہیں کیوں۔ اکثر ہم وہی کر جاتے ہیں جو ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور پھر کرنی کی سُولی پر لٹکے رہتے ہیں۔

جناح باغ کے واکنگ ٹریک پر ساری شام رات گئے تک بے پناہ ہجوم رہتا ہے۔ یہ واکنگ ٹریک ریستوران کی بغل سے بل کھا کر جب مڑتا ہے تو قدرے تنگ ہو جاتا ہے۔ تب واک یا جوگنگ کرنے والے یہاں اپنی رفتار دھیمی کرتے ہیں اور احتیاط سے گزرتے ہیں کہ کہیں ایک دوسرے سے ٹکرا نہ جائیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے جناح باغ کی جناح کیپ اسی کونے کے سَر پر لڑکھڑا رہی ہے، جسے شالیمار ریستوران کے روایتی ہاتھوں نے تھام رکھا ہے جس کے معیار کے اصولوں سے بندھی ہوئی سنجیدگی اور تنہائی کی متانت اُسے احترام دینے پر مجبور کرتی ہیں، جیسے کوئی پاکباز حسینہ چلمن سے لگی بیٹھی ہو لیکن رعب تقدس کسی نگاہ کو اُٹھنے کی مجال نہ دیتا ہو۔ ریستوران کے بغلی شیشوں سے اندر کا سب منظر آشکار تھا لیکن کسی مرحوم بزرگ کی تصویر کے سامنے سے گزرنے والی سنجیدگی، افسردگی اور بے زاری لیے سب گزر جاتے۔ ریستوران کے اندرونی منظر کا جائزہ لیتے ہوئے جیسے خائف ہوں، جبکہ ڈم ڈم ہوٹل میں سارے دیدے پھاڑ پھاڑ گھسے چلے جاتے ہیں اور اُس کی اشتہائیں رال بن کر ٹپکتی ہونٹوں سے بہتی ہیں اور چھوٹے بڑے گوشت پر دندان ستیز آزما اور تیز ہو جاتے ہیں۔ سلاخوں میں پروئے ہوئے مرغ مسلم، روسٹ بروسٹ، بجیاں، تکے بوٹی، سیخ کباب، کڑاہی، بالٹی...... ہانڈی گوشت اور سامنے سکرین پر تھار تھار لہراتا ہوا زندہ گوشت، رانیں، پٹھ، سینہ، گُردے، کلیجیاں، چھریاں چلتی اور ٹکڑے اُڑاتی رہتیں، جو جس کے ہاتھ جتنا لگتا۔ جناح باغ میں گوشت پسندیدہ ڈش ہے۔ سبزی دال غریبانہ ڈش، غریبوں کو بھی خوش نہ آتی۔ وہ بھی اس میں چھوٹی بڑی بوٹیاں ملانے کی جستجو میں سرکس کے منچ میں کرتب دکھاتے رہتے ہیں۔

اُس روز میرے قدم رک رک گئے، جب میرا پسندیدہ غزل گائیک یہاں اپنے فن کا مظاہرہ کر

رہا تھا۔ اگر چہ ریستوران کے بند شیشوں میں سے آواز باہر نہ آ رہی تھی لیکن غزل کی صدا اپنا رس میرے کانوں میں مسلسل گھول رہی تھی شاید اس گائیکی کا لوچ میری سماعتوں میں عرصے سے گھلا تھا کہ بنا سنے ہی میں جھوم رہا تھا۔ مَیں نے اپنی خالی جیب ٹٹولی اور میرے قدم بے اختیار اندر چلے گئے ٹھنڈے پُر سکون ہال میں ویٹر نے فی الفور میرے لیے کُرسی کھینچی اور میرے سامنے شفاف گلاس میں پانی ڈال کے رکھا، لیکن میں اُسے پی نہ سکا اور کچھ سُن بھی نہ سکا، ریستوران میں جانے کے بھی کچھ اصول قاعدے ہوا کرتے ہیں۔ ان اصولوں کا بوجھ اُٹھائے میں باہر نکل بھاگا، ویٹر نے مجھے آدھا بھرا گلاس چھوڑ کر باہر جاتے ہوئے دیکھا تو اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں مزید وقار بھر آیا، دروازہ میرے پیچھے پھر بند ہو چکا تھا اور گارڈ دروازے کے پیچھے کھڑا مزید دراز قد لگنے لگا تھا، غزل گائیک کی آواز کلاسیکی فن کو چھو رہی تھی جسے سننے والوں میں خالی کُرسیاں، میزوں پہ دھرے چمکتے ہوئے خالی برتن، دیواروں سے ٹنگے نایاب لینڈ اسکیپ اور کارنس پہ سجے قیمتی نوادرات تھے، لیکن میں ان میں شامل نہ تھا کہ میں ان کو احترام دیتا ہوں ان کا حصہ نہیں بن سکتا تھا، اور بس میں پسینے سے نچڑتا ہوا ریستوران کی پُشت پر ٹنگے ڈم ڈم ہوٹل تک بھاگتا چلا گیا، جو جبڑے پھاڑ پھاڑ گا رہا تھا۔

کبھی میرا چھونو تے ہو ئے اج لالے

لوگ جبڑے کھولے اندھا دھند بلا تمیز ہر شئے نگل رہے تھے۔ برگر، سینڈوچ، پکوڑے، سیخ کباب، بھجیاں، لیمب روسٹ، لگ پیس، چسٹ پیس، کبھی میرا چھونو کا صوتی کچا خام گوشت کانوں میں اُنڈیلتے ہوئے۔ نرخروں کے تانت بج رہے تھے۔ پیٹ کا اپھارہ ڈکار بن بن معدے کے گیس اور بوئیں باہر بکھیر رہا تھا۔ معدے کا غار ہڑپ چھو ہڑپ سب غرق...... بھرے پیٹ کا اُلکس آنکھیں موند رہا تھا اور دماغ اُونگھ گئے تھے۔ صرف منہ اور پیٹ کھلے تھے۔ بھوک حرام کو حلال...... کر دیتی ہے اور بھرا ہوا پیٹ غلاظت کے ڈھیر پر بھی دماغ اور جسم کو سُلا دیتا ہے۔ جی متلانے لگا، اتنی ڈھیروں خوراک، اشتہا کی رال متلی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ڈھیریوں کی شکل میں پڑا اور پارچوں کی صورت میں لہراتا ہوا گوشت، تھرکتا ہوا گوشت، آنکھوں میں کھبا ہوا گوشت، دانتوں تلے چبتا ہوا گوشت، بدن کے ہر ہر اعضا کی طلب گوشت، گوشت کو گوشت کی کشش دیوانہ بنا رہی تھی۔ گوشت خوری خوش ذوقی کا پورا منظر نامہ ہی بدل کے رکھ دیتی ہے۔ مَیں نے منہ بھر کر چچوری ہوئی ہڈیوں پر تھوکا اور ڈبتے ہوئے حوصلوں میں

فیصلہ کیا۔ اگلے مہینے شروع کی تاریخوں میں یہاں آؤں گا۔ چاہے ڈھائی تین سو کی ایک ہی ڈش منگواؤں لیکن ویٹر کو سو دو سو کی ٹپ ضرور دوں گا۔ اگلے مہینے کی شروع کی تاریخوں میں ریستوران اتنا ہی خالی تھا، جتنی کہ میری جیب، بیرے اتنے ہی اُداس اور باوقار تھے، جتنا کہ خود ریستوران۔ اب اتنے بڑے ہال میں صرف ایک فرد یا ایک فیملی جا کر بیٹھے۔ مدتوں سے فارغ بیٹھے ویٹرز اُس کی سروس کے لیے موجود ہوں، اور صرف تین سو کی ایک ڈش۔ کتنے چمکتے ہوئے برتن گندے ہوں، کتنے خوبصورت پھول بنے نیپکن کھلیں، چمچماتے ہوئے میز کرسیاں اور فرش استعمال ہوں ''گارڈ'' انٹیک سجاوٹی کام والا دروازہ بصد احترام کھولے اور صرف تین سو کی ایک ڈش، ایسے باوقار ریستوران کی بھی کچھ عزت ہے کہ نہیں، ایسی ثقہ چیزیں جو ایک یادگاری کردار بننے جا رہی ہوتی ہیں ان کے بھی کچھ حرمتی اصول ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بے جان ہی ہوں۔ پھر ان حالات میں جبکہ سب جاندار چیزیں گوشت خور ہو چکی ہوں تو پھر...... مَیں نے بچوں کے غلے میں یہ تین سو روپے ڈال دیئے۔ اگلے مہینے کی بچت پھر ڈال دی اور اُس سے اگلے مہینے کی بچت ملا کر بیوی بچوں کو تفریح کروانے نکلا جو کئی دِنوں مہینوں سے شالیمار ریستوران کی اساطیری داستان مجھ سے سُن سُن خاصے مرعوب اور بے تاب ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنا چاہا پر ہاتھ بڑھا رہ گیا اور دروازہ اُن کے لیے چشمِ زدن میں نگاہ فرشِ راہ کیے ہوئے تھا۔ ویٹر نے بڑی بڑی کین کی کُرسیاں کھینچیں لیکن وہ سارے، خالی کُرسیوں کے پاس کھڑے رہ گئے اور چھوٹا بیٹا میرا بازو پکڑ کر جھول گیا۔

''ابو یہ Graveyard ہے کیا۔''

جب تک کہ میں اُنہیں سمجھاتا کہ یہ پُرسکون، صاف ستھرا ماحول، حفظانِ صحت کے اصولوں پر تیار کیا ہوا کھانا اور یہ دھیمے سُروں میں بجتی موسیقی بہت بڑھیا ہے اور ہماری روایات کا حصہ ہے اور ان کی حفاظت ہم پر فرض ہے۔ اس وقت تک اُن کی ماں لیڈ کرتی ہوئی اُنہیں باہر لے جا چکی تھی اور میری چودہ سالہ بیٹی کی آواز آئی تھی۔

''یہ ماتمی موسیقی کیوں بج رہی ہے؟''

اور میری بیوی نے جواب دیا تھا۔ ''شاید کسی کا کریا کرم ہونا ہے یہاں۔''

مینو بک پکڑے کھڑے ویٹر کی بغل سے نکلتا ہوا میں باہر بھاگا، جیسے چلتے چلتے سامنی دیوار سے

ٹکرا کر چت گرا ہوں۔

بچے اور بیوی ہاؤ ہُو میں چھلکتی ''اور کہیچ میرا پھوٹو تے بنوے اچ لا لے'' کے بے ہودہ شور کی اُبکائیاں کرتی کینٹین میں گھس چکے تھے۔ برگر، تکے کھاتے ہوئے جھوم رہے تھے۔ فلمی گانے کی آواز سے آواز ملا کر گا رہے تھے۔ بیوی قہقہے اُچھال اُچھال بچوں کی حرکات پر تال دے رہی تھی اور پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''یہ آزادی انہیں وہاں میسر تھی کیا۔ سلیقے سے چھری کانٹا پکڑ کے کھاؤ۔ چمچہ پلیٹ میں لگنے کی آواز نہ آئے۔ نیپکن بچھاؤ کچھ گر نہ جائے، بولو بھی تو سرگوشی میں ساتھ کی ٹیبل والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ ارے ہم تفریح کرنے نکلے ہیں کہ تہذیب و تاریخ کا پیپر حل کرنے کمرۂ امتحان میں بیٹھنے؟''

بچے ایک دوسرے کے منہ میں گول گپے ٹھونس رہے تھے۔ کپڑوں پر چٹنی اور املی ملا پانی اور چاٹ کا شیرہ گر رہا تھا۔ منہ لتھڑے تھے۔ پیپسی کی جھاگ بوتلوں کے منہ سے اور بچوں کی ناکوں سے بہہ رہی تھی۔ میری چودہ سالہ بیٹی کو پان کی پیک اُچھالتے اور سگریٹوں کے دھویں اُڑاتے اور جیبوں میں سکّے کھنکھناتے اور آدم بو آدم بو پکارتے گوشت خور نظروں سے کھدیڑ رہے تھے اور لمبی لمبی جیبیں نکال رالیں چاٹ رہے تھے لیکن اس کی ماں کو اُس کا دوپٹہ درست کروانے کا کوئی خیال نہ تھا۔ کیونکہ اُس کا اپنا منہ تو برگر کے لفافے میں دھنسا تھا۔ اُسے تو منے کا بھی کچھ خیال نہ تھا، جس نے برگر کے اُوپر سموسہ ٹھونس لیا تھا اور اُسے اچھو آ گیا تھا اور اب وہ پیپسی کی بوتل میں کھانس رہا تھا اور خوراک کے ذرے بوتل میں گھوم رہے تھے، جیسے سامنے سکرین پر گوشت کے بڑھیا پیسز چکرا رہے تھے۔ میری بیٹی کے سَر پر کھڑی آوارہ منڈلی گالم گلوچ اور لپھڑا کر رہی تھی وجہ تنازع شاید میری بیٹی ہی تھی لیکن وہ پُرسکون انداز میں برگر کھا رہی تھی۔ میں نے ادب لحاظ رکھ رکھاؤ کو سوڈے کے بڑے سے گھونٹ میں نگل کر چوری چوری ریستوران کی سمت نگاہ کی جہاں انٹیک دروازے سے لگا گارڈ اُونگھ گیا تھا۔ ویٹرز عشاء کی لمبی نماز کی نیت کر چکے تھے۔ روشنیاں گُل ہو گئی تھیں اور زیرو پاور کے ہرے گلابی بلب ٹمٹما رہے تھے یا شاید بجھنے کے قریب تھے۔

اُس دن مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہ ریستوران بند ہو جائے گا۔ جب عزت اور بے عزتی کے کھانے کی تمیز کڑاہی گوشت میں بھن کر چٹم ہو جاتی ہے۔ تب ریستوران بند ہو جاتے ہیں اور خوراک

راستوں کی گرد میں گندھی فٹ پاتھوں پر بکھر جاتی ہے، تب معدے زہریلے کھانے کے عادی ہو جاتے ہیں اور خالص غذا اسہال لگا دیتی ہے۔

اگلے مہینے دو تین سو پھر جیب میں پڑا رہ گیا۔ پتہ نہیں بیوی کی نظر نہ پڑی تھی کہ کسی غیر شعوری بچت اسکیم کا یہ حصہ تھا۔ ریستوران کا بند چہرہ دیکھنے کے لیے بھی خالی جیب سامنے سے گزرنا خلافِ تہذیب معلوم ہوتا تھا۔ بھری جیب نے حوصلہ دیا۔ میری توقع کے برخلاف ریستوران کا دروازہ کھلا تھا۔ بلکہ چوپٹ کھلا تھا۔ گارڈ کے بغیر...... گارڈ تو کہیں سے پانی کے جگ بھر بھر کر لا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے بچھی پختہ سڑک پر ہال کی ساری کرسیاں نکال کر بچھا دی گئی تھیں، جن پر انسانی گٹھڑیاں ادھ کھلی یا بکھری پڑی تھیں۔ میزوں پر معمولی دھات کے جگ گلاس چکنائی سے لتھڑے پڑے تھے۔ شاید شیشے کے صاف ستھرے جگ پلیٹیں اس دھکم پیل میں کہیں ٹوٹ گئے تھے۔ میزوں پر گول گیوں کا پانی تیر رہا تھا۔ کڑاہی گوشت کی چچوری ہوئی ہڈیوں کا لیپ سڑک پر لتھڑا تھا، جس پر سے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے۔ یہ وہی سڑک تھی جس کے اطراف میں ایرو کیریا، اور پام کے پودے سجے رہتے تھے، جن کے گیروے گملوں کے گرد آسمانی سلک کے کنول سے پھول لپٹے ہوتے تھے۔ بیچوں بیچ سرخ قالین بچھے رہتے تھے، جہاں اب سالن اور شیرے سے لتھڑی ہوئی کرسیاں اوندھی، موندھی پڑی تھیں اور خالی بوتلیں، جھوٹی پلیٹیں اور گلاس بکھرے تھے جن میں سے ادھ کھائی خوراک سڑک پر بہہ رہی تھی، اور باسی اور غیر معیاری خوراک کی سڑاند ہر سو پھیلی تھی۔ ویٹرز میلے کچیلے لباسوں میں گندھے تام چینی کے ٹرے پکڑے زبانی آرڈر لے رہے تھے اور کندھے پہ پڑے اُسی غلیظ جھاڑن سے میزوں کا گند جذب کر رہے تھے، جن سے ناک منہ سے بار بی کیو کی کالک صاف کرتے تھے۔ کوئلوں والی انگیٹھیاں سیخ کبابوں، تکوں اور بجیوں سے بھری تھیں، جن کی جلتی بھنتی مہک ریستوران کے خالی بھنڈار ہال میں بھر رہی تھی۔ جہاں چھت سے لٹکتے دھوئیں اور راکھ کے جالے فرش کو چھو رہے تھے۔ گاہک لوٹ کے مال کی طرح جھپٹ رہے تھے۔ تو ندوں پر ہاتھ پھیرتے آرڈر پر آرڈر دے رہے تھے کہ کچا بھنا، اُدھ کچرا ادھ جلا ہوا گوشت بھی جناح باغ والوں کا من بھاتا کھاجا ہے، ریستوران کا مالک کنوکن بھری زنگ آلود صندوقچی میں اَن گنت نوٹ ٹھونسے جا رہا تھا اور سامنے شالیمار ریستوران کا بورڈ ہٹا کر ''چٹخارہ فوڈ سٹریٹ'' کا بورڈ آویزاں کر دیا گیا تھا۔

گھم گھم مدھانی

ننھے ننھے چوکے سے اُٹھتی گف بھاپ میں لپٹی مدھانی کی گھم گھم کھمک کھمک جیسے تنور سے نکلتی روٹی پر پگھلتے مکھن کی تر تراہٹ جیسے ملاپ کے کسی گیت کا لوچ اور بلاوا۔

رَتی لال مدھانی اے
دودھ کر بھجیں
ساڈا وختاں دا پانی اے

مویشیوں کے کوٹھے میں سوئی یخ تاریکی کے بطن میں چھپے گوبر، جیسے دُھند میں لپٹے ایگلو، اُنگلیوں اور ہتھیلیوں کی اوک میں تھپک تھپک اوپلے بنتے تھے، جن کے کناروں پر لگر جما تھا جو بیائیوں میں رَچتا پوروں کے خون میں جم گیا تھا۔ ناخنوں کی میلوٹی لکیروں کی جڑوں میں نیلاہٹ بھری تھی۔ جیا کا جی چاہا ننھے ننھے (گرم) چوکے میں جا کر ہاتھ پیر سینک آئے۔ پر ماں......! تازہ تازہ گوبر سے اُٹھتی بھاپ پر اُس نے دونوں ہاتھوں کی چھتری پھیلا دی، جیسے سلیٹی کہرے سے اُنہیں ڈھانپ دیا ہو۔

کھونٹے سے رَسّے کی گرہیں کھولتا مضبوط ہاتھ بے دھیانی میں گوبر لتھڑے ہاتھ کی کلائی پہ جا

پڑا۔ پَو پھٹنے کی تھکی سمٹی سُرمئی تاریکی میں چوڑیوں کی کھنک بج کر ٹھٹھر گئی۔ بیلوں نے گردنیں جھٹک کر ٹلیاں بجائیں۔ کوہانوں پر کسی چتکبری جلد گچھا ہو کر تھرتھرا گئی۔ وہ چھڑیوں کے سیاہ پہاڑ سے ڈھیر کی ڈھلان پر آدھی کھڑی آدھی گری ڈھ گئی۔ ہاتھوں کو لپٹتی برف آنکھوں میں جا کر پگھل گئی۔

''یہ تیرے موگھے کبھی سُوکھتے کیوں نہیں، نہروں میں بھی بندی آجاتی ہے پر یہ راجباہ......!''

دونوں کلائیوں کو مضبوط چڑھتی ہوئی گرفت گگر کی بھربھری تہہ کو توڑتی چلی گئی۔ چھڑیوں کے ڈھیر پر آدھے گرے آدھے کھڑے بدن کے رونگٹے پورے قد سے کھڑے تھے۔ جن پر ہرے پیلس کے کپڑے کی کھڑکھڑاہٹ بجتی تھی، جس میں کپڑے کی تڑتڑ کبھی کبھی شیشے کی سی چمک دے جاتی، ٹھہرے اور تاریکی بھرے کوٹھے میں لمس کی حرارت شبیہات کو شناخت دیتی تھی۔ مدھانی کی گھمک مکھن کی سخت تہہ میں چلتی گھماک گھماک ہو کر رُک گئی تھی۔

''بلو! دِن چڑھے بل جوتے گا کیا، جادوگرنی نے حاشیہ مارا ہے پَیر باہر کیسے نکلے۔''

مامی نے جوترے کی رَسیاں کس کر نہلنے سے لپیٹیں، اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے مدھانی کے چھکے سے لتھڑے مکھن کو اکٹھا کر چاٹی کے منہ سے انگوٹھے کا پیٹ بار بار رگڑنے لگی۔

کوٹھے کی چاروں خم کھائی دیواریں، نکلے ہوئے پیٹ جیسے آپس میں بھیڑ دیں گی۔ بیلوں کی نکیل میں بندھا سن کا موٹا رسا تن گیا، سیاہ نتھنوں کے پھیلاؤ نے کوٹھے میں بھری مہک کو گہرا گہرا سونگھا، مٹی گوبر، چارے کے ٹکڑے نتھنوں کی سفید کُرکری ہڈیوں میں دھنس گئے۔ فضا میں پھیلی ہوئی ''ہَواں، ہَوہَواں'' بیلوں کو ہانکنے کی ہمہ گیر صوت میں بلّو کا ہنکارا سب سے بلند تھا، تَن کی آسودگی نرخرے کو گھمبیر بنا گئی۔ ہرے پیلس کے سُوٹ میں لپٹا ٹھنڈا نچڑا بدن چھڑیوں کے ڈھیر کی اُس ڈھلان پر پڑا رہ گیا جسے بچوں نے چڑھنے اور اُچھل اُچھل جھولنے کے لیے پگڈنڈی سی بنا ڈالا تھا۔ یخ ریشمی کپڑا کانٹوں کی طرح کھڑے رونگٹوں پر منڈھ گیا تھا۔ کتنے سال ہو گئے وہی شادی والے ریشمی کپڑے جو یوہ کا گگر چھڑے کے اَندر اُنڈیل دیتے ہیں اور جیٹھ ھاڑ کی بھوبھل گرمی دانوں کی اُدھڑی جلد پر مل دیتے ہیں۔ کتنے فضول ہوتے ہیں یہ ریشمی کپڑے نہ پالا نگلیں نہ ہُسٹر سہاریں، مامی کھدی کا ہی ایک جوڑا لے دیتی تو تن سُکھ میں آجاتا۔''

مامی چاٹی کے اَندر گول مول مکھن پیڑا تھپتھپاتی تھی اور لسّی کے آخری قطرے نچوڑتی تھی۔

''جیا ٹوکری زیادہ بھاری ہے، بلو ہاتھ ڈلوائے تو اُٹھے نہ ڈلوائے تو کیونکر اُٹھے۔''

ہری پیلس کی شلوار میں سکڑے گھٹنے خم کھا کر مڑے، پنڈلیوں کی پُشت پھیلی، دونوں ہتھیلیوں پہ دھری ٹوکری ایک ہی زور میں سر پر تھی۔ مویشیوں کے زندہ چمڑے کی ہمک اور پیشاب و گوبر کی بُو، اَناج کی اُمس چھت کے پرانے سرکنڈوں کی کائی سی واشنا میں ہم مقدار ہو گھل مل گئی تھیں اور یہ ہمک کسانوں کے جسموں میں تھی۔ اچار کے مٹکے میں تھی۔ پرچھتی پہ بجی سرساہیوں اور منگروں میں تھی۔ لسی کی چاٹی میں تھی۔ پیٹی میں بھرے لحافوں اور کھیسوں میں تھی اور اس وقت جیا کی بُکل میں لپٹی سیلابی نالوں کے تیزابی پانی میں رچی ہوئی تھی۔

بلٹوئی میں بھرے کوسے (نیم گرم) پانی کو مامی نے فاصلے سے منی (بھینس) کے حوالے (تھن) پر زور سے پھینکا، کنوے کی رسّی کھول کر پشت پر اکٹھی کی، وہ تنے ہوئے اگلے سڈول تھنوں پر کسی تخریب کار کی طرح ٹوٹ پڑا، دودھ کی پہلی دھاریں بلٹوئی کے پیندے میں یوں بجیں، جیسے بارش کے پہلے قطرے ٹخ ٹخ پتھروں پر گرتے ہوں۔

''بلو کیا کہتا تھا تجھے۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

منی کترے پر چھتر کے دلیے کو منہ مارتی تھی اور دودھ کی بلٹوئی بھرتی تھی۔

''چھتریوں کے اَدبلے (عقب) تجھے نماز پڑھوانے لے گیا تھا کیا۔''

اَنگوٹھے کا دباؤ تھنوں پر بڑھ گیا، بلٹوئی میں پڑتی دھاریں موسلا دھار ہو گئیں۔

''کہتا تھا آج تم پیلی میں روٹی لے کر آنا۔''

سیلابی ریلے میں سینہ بھر آگیا تھا، دونوں مو گھے جھتر جھتر بہہ نکلے۔

''کیوں کماد کا قد لمبا اور نرمے کا جھاڑ گھنا ہے اس لیے؟ اَری کتوری! وہ اپنا پسینہ فصلوں میں کیوں نہ چھتر کے تیرے اَنگارے کیوں بجھائے۔''

سفید چاند والے کٹوے نے خالی تھن پر احتجاجاً دانت گاڑا۔ منی نے پچھلی ٹانگ پھیلا اور اگلا کھر اُٹھا کر جنبش کی بلٹوئی چھلک گئی۔

''اَرے کھاتی بھی ہے اور ٹانگ بھی مارتی ہے حرامزادی! تجھ سے دودھ لینے کو ہی رکھا ہے

تجھے ورنہ قصائی کے چھرے تلے نہ دے دوں تجھے۔''

لمبے سڈول اُکڑے ہوئے تھن لجلجے سکڑے جھریوں زدہ ہو گئے جیسے کبھی بھرے ہی نہ ہوں۔

''جوانی ہم پر بھی آئی تھی۔ ساس نے کھود کر اروڑی میں دبا دی۔ شوہر سے بھی گھونگھٹ رکھا ساری جوانی۔''

فیضو کماد کے ٹانڈے مشین کے مُنہ میں گالے بنا بنا کر لگاتا تھا اور رمضو آگے پیچھے بھاگنے کے انداز میں قدم رکھے مشین کی دستی تیز تیز گھماتا تھا۔ گراریوں سے گزرتی ہوئی پوریاں ٹوکے کے مُنہ پر کٹ کٹ ڈھیر میں گرتی تھیں۔ جنہیں دن بھر گاؤں کے بچے کھرلیوں میں گھسے بھوسے سے الگ کر کر کے چوستے تھے۔

ہر حویلی ڈیرے جھگی جھونپڑی سے مرغوں کی بانگیں ڈربوں اور ٹوکروں میں گھسی پھنسی نکلتی تھیں اور مدھانیوں کی ہلکی بھاری آوازوں میں ہم آمیز ہو گئی تھیں، گدھے رات کے آخری پہر کا اعلان اپنے آخری اور چوتھے ہینگنے میں کر چکے تھے اور ساری ساسیں لسی سے بھری چاٹی کے کھلے مُنہ پر مکھن سے لتھڑے ہاتھ رگڑ رگڑ کر مکھن جمع کرتی تھیں اور ساری بہویں اوپلے تھاپتی تھیں اور آنسوؤں کے پانی سے اُنہیں بھگوتی تھیں۔

''جیا میری دھی، لسی کا کھنہ''

بھڑولوں اور بیج سے بھری بوریوں اور کھل بنولے کی امس میں گھٹی معذوری منمناتی تھی اور مجبوری کھولتی تھی۔ نیم کے جھنڈ میں اُلجھے صبح کے تارے کا جسم معدوم ہو گیا۔ جیا نے بسم اللہ پڑھ کر لسی سے بھری چاٹی کا منہ بہورایا، جس کے گلے میں جذب مکھن کی چکناہٹ پکی ملتانی مٹی کا لال رنگ بھڑکا گئی تھی۔ جس کے مُنہ پر ململ کا سفید براق پوتا بندھا تھا جیسے اُس نے بھرے خزانوں کا منہ کھولا ہو۔ لبوں پر مسلسل بسم بسم کی تھرتھراہٹ تھی اور ہاتھوں کے احترام میں بسم اللہ کا تقدس اور بوجھ تھا۔

چولہے میں جلتی چھپٹری بسم اللہ کے تقدس کے بوجھ تلے دبے ہاتھوں پر چنگاریاں برسا گئی۔

''چھوڑ دے...... چھوڑ دے چاٹی کو...... پلید ہاتھ لگاتی ہے، اللہ کے نُور کو۔''

موگھوں کے منہ کھل گئے، بھری چاٹی چھلک گئی۔ چنگاری جہاں گرتی تھی پیلس کے کپڑے کی موم سی جلد سے چپک کر دھنس جاتی تھی۔

''مای مجھے پلید نہ کہا کر۔ میں کتیا تو نہیں..... انسان پلید ہوتا ہے؟''

''بکتی بھی ہے آگے سے بکتی بھی ہے۔ روز سرگی (فجر) چھڑیوں کے او ہلے (اوٹ) پاک ہونے ہی تو جاتی ہے ناتو..... کتیا تجھ سے پاک ہے۔ اُس کا بھی اِک موسم ہے۔ پر تیرا کوئی موسم نہیں۔''

''میں کبھی چل کے نہیں جاتی اُسے منع کر لے۔ میری ہڈیوں میں تو پہلے آسنگ (طاقت) نہیں۔''

''جیا پترلسی کا چھنا..... لوڑے ویلے بھی کھنی ہی کھائی تھی۔ اب تو مُلا بھی بول پڑا۔''

اناج کی امس اور حبس میں گندھی آواز معذوری کے قالب سے نکلتی تھی۔

''مُلا تو بھی روز بولتا ہے پر تیری کون سنے۔ اُندر بیٹھے بڈھے ہیں معذور ہیں۔ باہر گئے جوان مٹی میں ہڈیاں گالتے ہیں۔ تیری سننے کی ویل (فرصت) کس کے پاس ہے۔ پر تو بولتا ہے۔ روز بولتا ہے۔''

''او کافر چپ کر جا، مُلا سے کیوں لڑتا ہے۔ اپنی نانگ سے لڑ۔''

مای رحمتے تنور سے روٹیاں نکال نکال رنگلے چھابے کے کناروں پر سجاتی تھی۔

''چاٹیاں گھماتی ساسوں کے مُنہ میں گالیوں کی تسبیح ہے۔ او پلے تھاپتی بہوؤں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دانے ہیں۔ مُلا تیری کون سنے، جیا پترلسی کا چھنا۔''

''چپ کر جا جہنمی چپ کر، ابھی چھانتی ہے، پتلی ہے، پانی ملاتا ہے۔''

سوئی ہوئی پوری فضا میں الصلوٰۃ خیرٌ مِنَ النوم کی انگڑائی جیسی کیفیت ہر ہر شئے میں رچتی تھی۔

''تیرے جگانے سے پہلے سب جاگتے ہیں۔ پر جاگتے ہیں مٹی پھرولنے کے لیے گوبر تھاپنے کے لیے چاٹیاں بلانے کے لیے تیرے لیے کوئی نہیں جاگتا۔''

''گندی، اے اُٹھ آ۔ روٹیوں پر چوبھے لگا کر مکھن چپڑ اور ویروں کو روٹی دے کے آ۔ جو اک پہر سے دھرتی میں پسینہ نچوڑتے ہیں، اس کافر کے آگے بھی کچھ ڈال جو مُلا کی بانگ سے لڑتا ہے۔ ہائے دوزخی، جہنمی، مردود، ہائے ہائے مُلا کی بانگ سے لڑتا ہے۔ توبہ میری توبہ۔''

''اب میں کتا ہو گیا۔ معذور جو ہو گیا۔ تو بھول گئی میری ماریں..... تیرے جوگا تو اب بھی میں

ہوں، اُٹھوں میں پھر......اُٹھوں......''

دھوتی کے لڑ اُڑ وستا اور بیساکھی بغل تلے دبا تا وہ تیسری بار پھر لڑھک گیا تھا۔ ایک بار چار پائی پر اور دو بار ڈھول میں۔

''بکتارہ اور تُو کر ہی کیا سکتا ہے بک۔''

مامی کاڑھنی کے پینڈے میں او پلے ترتیب سے جوڑتی رہی درمیان میں ایک ایک اطراف میں دو دو تین تین قطار دَر قطار چولہے سے جلتی ہوئی چنگاریوں کا تسلا بھرا و پلوں پر پھیلا دیا، اس انگیٹھی نما کاڑھنی کے دائیں بائیں بنے سوراخوں سے دُھواں جمع ہو کر سیاہ سفید غبار کی صورت، بھر کر باہر نکلا۔

کوٹھے کے دروازے سے بلّو نے چوتھی بار جھانکا تھا۔

''اے جیا......سو مَر رہی ہے تیرے ہاتھوں میں زور نہیں ہے کیا دو ٹائم کھاتی ٹُنتی نہیں ہے کیا۔''

''مامی دبا تو رہی ہوں۔''

''بولتی بھی ہے آگے سے بولتی بھی ہے۔ بالکل ماں کی طرح بولتی ہے۔''

ایک ہی جھانپا دائیں بائیں دونوں گالوں پر پھر گیا۔

''یہ دبا رہی ہے تو...... تانگ تو تیری خصم میں لگی ہے، جسے لارا لگا آئی ہے۔ بیٹھک میں آنے کا......''

''مامی میں نے نہیں کہا کسی سے کچھ۔''

دونوں چشمے دائیں بائیں گالوں کو تر کرتے میلوٹی بکل میں بے آواز جذب ہونے لگے۔

''اس لیے تو پال پوس کر جوان نہیں کیا کہ بس تیری آگ بجھائے اور پیلیاں بنجر ہو جائیں اور گھر میں فاقے آئیں اور بہنیں داج کی اُڈیک میں بوڑھی ہو جائیں اور خود ہڈیاں کھور کھور مریض ہو جائے۔''

مامی دَوہتڑ منہ سَر پر مارتی بال نوچتی صحن میں نکل گئی۔

''سارا خیش قبیلہ سُن لے یہ پچھل پیری میرے لال کو چاٹ گئی۔''

شب کی آسودگی میں ہسٹریائی چیخیں چوکیدار کی جاگتے رہنا کو لپیٹ گئی تھیں۔ سینے پر پڑتے

دھموکوں کی دھمک پڑوسنوں کو بنیروں پہ کھینچ لائی تھی۔

''سنو قبیلے والیو، پہلے اک ساہ میں بل پھال اُٹھاتا تھا۔کل دو ساہ میں اُٹھائی۔ پورے دو ساہ میں اُٹھائی۔میرے لال کو چاٹ گئی۔ ماندہ کر گئی۔''

بلو بیٹھک میں جا کر سو گیا تھا۔

آج وہ مویشیوں کا احاطہ بھی صاف کر چکی، سارے گھروں میں گھومتی ہوئی مدھانیوں کی آوازیں بھی ہلکی سے بھاری ہوگئیں، باہر درختوں کے جھنڈ سے اُٹھتی صدا صبح کے تارے میں ڈھندلاتی تھی۔

''جیا پتر لسی کا چھنا،لوڑے ویلے بھی کھنی ہی کھائی تھی۔''

''ماما ابھی تو ماں اُٹھی ہی نہیں۔''

اُس نے مٹی اور بھوری کے تکلے کی طرح اکڑے بوجھل تھنوں کو دیکھا جو منہ اُٹھا اُٹھا کر دُہائی دیتی تھیں کہ اُن کی دھاریں نکالو انہیں مکتی دو۔ کئی کنارَستی تڑوا تڑوا کر حوانے کو منہ مارتے تھے پر تھنوں تک نہ پہنچ پاتے تھے۔

''جیا پتر !تُو ہی ریڑ کا ڈال لے ابھی نہیں اُٹھی تو پھر کب اُٹھے گی۔''

جس کے ہاتھ میں مدھانی کی نیل (رَسّی) ہو وہی گھر کی رانی، جس کے ہاتھوں مکھن کے پیڑے اُچھلتے ہوں، لسی کی گڑویاں بھر بھر تقسیم ہوتی ہوں وہی گاؤں کی چودھرانی...... گھم گھم مدھانی...... ساڈے گھر رانی۔

اُس نے بسم اللہ پڑھی۔ چاٹی پر پڑا موٹا کھیس تہ کر کے چھپری کی درمیانی کڑی میں پھنسایا جس سے لپٹے دُھوئیں کے سیاہ جالوں کی راکھ اُس کے کھلے منہ میں جھڑ گئی۔اُس نے کھنگار کر دانتوں پر زبان پھیری۔ ٹیڑھی میڑھی لکڑی سے رَسّی کا پھندا سا لٹکتا تھا۔ جس پر مکھیوں کی گندگی لپی تھی اور جس میں کپڑے میں لپٹی زنگی مدھانی جھولتی تھی۔

اس نے بسم اللہ پڑھ کر مدھانی کا چکا، رَسّی میں سے نکالا، جوترے کے بل کھولے لبوں سے بسم بسم کی سرگوشی مسلسل اُبھرتی تھی۔ نیلنے پر رسی کے کئی بل دیئے ایک پَیر چاٹی کے پیندے کو سہارتا تھا، اور ہاتھ جوترے کی رسیوں کو باری باری کھینچتے تھے۔ سارا جگ گھومتا تھا اُس کے ہاتھوں کی گردش میں

پاؤں کی ایڑی تلے، دو یا شاید چار بار کہ وہ خود گھومتی ہوئی اُونچے پایوں والی پیڑھی سے نیچے تھی۔

''میرے سامنے میرے ریڑ کے کو تُو نے پلید ہاتھ لگائے۔ ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ تو سمجھی میں مَر گئی۔ رِیڑ کے کی مالک بن بیٹھی۔''

مامی کے ہاتھ میں آیا تھاپا...... کسی تمیز سے قطع نظر اُس پر برستا تھا۔ جیسے کوٹ کوٹ کچے پکے روڑے ہموار کر رہی ہو۔ اُس کے پاؤں کی ایڑی ابھی چاٹی کے پیندے کو سہارے ہوئے تھی اور ہاتھوں میں جوترے کی دستیاں جکڑی تھیں اور اناج والی کوٹھڑی کی امس اور حبس میں سے بوجھل ہو آواز نکلتی تھی۔

''جیا یہ تجھے کیوں مارتی ہے۔ کدھر ہے تیرا خصم، پر وہ کیوں بولے گا۔ حق کے لیے کبھی کوئی بولا جو وہ بولے پر یہ مُلا تو بول پڑا۔ مُلا تو ضرور بولے گا۔ پر تیری کون سنے۔ یہاں سب لمبی تے زہریلی زُبانیں ہیں۔ کان کلر اٹھے ہو گئے ہیں۔ مُلا تیرا کہا، کون سنے تو آپ سنے یا تیرا رَبّ سنے بندے سارے بہرے بولے ہیں۔''

اناج والی کوٹھڑی میں بھرے دونوں بھڑولے چھت تک اُونچے تھے۔ جنہیں اُسارنے میں مہینے لگے تھے، اوپر لے وار پر سانگ پر چڑھ کر دیئے تھے جن کے منہ پر لپے چکنی مٹی سے بنے وزنی ڈھکن دِنوں میں پک کر تیار ہوئے تھے۔ جیا نے چھری سے بغلی سوراخ کی مٹی اُکھیڑ دی، دانے یوں نیچے گرے جیسے اُس کی آنکھوں کے چشمے بے قابو ہو اُبل پڑے ہوں۔ چھاننے میں چھان چھان اور چھاج میں پھٹک پھٹک وہ بین بنانے لگی۔

پسینے کی امس کُرتے کو بھگو کر بدن سے چپکا گئی تھی اور گرمی دانوں کے چھلکے اُتر اُتر جلد کو ڈب کھڑب کر گئے تھے اور موٹی چادر کی بکل کھٹی لسی جیسی بساند مارتی تھی۔

جب وہ چاروں بہویں، اپنا اپنا دال دانہ پینے کو لیے کوٹھڑی میں داخل ہوئیں تو جیا سُوکھی کُرنڈ مرچوں کی پیلی ڈنڈیاں توڑتی تھی۔ جن کے اَندر زَرد بیج کھنکتے تھے جیسے جھنجھنا بجتا ہو، جن کی جلن ہاتھوں کو چڑھتی ناک کی پھنک کو ہم رنگ بناتی آنکھیں جل تھل کرتی تھی۔ شاز و کرنڈ مرچوں کی مٹھی بھر ڈنڈیاں توڑنے لگی۔

''اڑیے اپنے خصم کو دکھا نہ اپنے نیل۔''

''کب دکھاؤں'' مرچاہٹ حلق میں چڑا گئی وہ چھینکتی کھانستی دوہری ہو گئی۔ ''جب اپنے مطلب کو آتا ہے تیرے پاس۔''

''جب کبھی آتا ہے تو اتنا نیم کہاں ہوتا ہے کہ کچھ کہوں بھی۔ ہر وقت تو پہرے پہ رہتی ہے۔ وہ.....''

''ہائے بات بھی تو نہیں کرنے دیتی ماں مٹر کو۔ روٹی ہی لے جانے دے پیلی میں تو دو گھڑی دکھ سکھ کی کر آئے۔''

''بیاہی آئی تھی تو ہاتھ لگائے میلی ہوتی تھی۔''

اناج کی بوریوں سے نکلی امس گریبانوں اور گردنوں پہ شرابور ہو بہتی تھی۔ جلد پر چھینٹے مارتے گرمی دانوں کی سرخی پیپ میں پکتی تھی۔

''ہائے نی سکھیو وَمرد پتر کس کام کا۔ اپنا مطلب پورا کر...... نہایا دھویا گھوڑا سوار۔''

''آدھی رات تک تو ٹانگیں دبواتی ہے۔ جب تسلی ہو جائے کہ بلو سو گیا ہے، تو پھر ہی غریب کو اُٹھنے دیتی ہے۔''

چکی کے پاٹوں تلے آ کے چنے دو حصوں میں تقسیم ہو سلیٹی کھردرے پتھروں کے منہ سے اُگلتے تھے۔ انی اتنی اُونچی تھی کہ کوئی دانہ دو سے چار نہ ہوتا تھا۔

''اری سکھیو وَیہ ساسیں مر کیوں نہیں جاتیں۔ بہویں مرتی ہیں۔ بچہ جنتے مرتی ہیں، دِق سے مرتی ہیں، کبھی کہیں سنا کہ کوئی ساس دق سے مری ہو۔ کبھی کسی کو سرسام ہوا، کلنج پڑا۔ ہائے ہائے اُنہیں کچھ نہیں ہوتا۔''

جیرو اور میرو مونگ کی مٹھیاں بھر بھر چکی کے سوراخ میں ڈالتی تھیں اور دستی پہ چڑھی اوپر نیچے دونوں کی مٹھیاں ایک ہی سمت زور لگاتی تھیں۔

''میری والی کو دیکھو۔ بیٹھک کو جندا لگا کنجی کھیسے میں رکھ سوتی ہے۔ سکھیو وَان کے خصم تو ٹھنڈے ہو بھکوں میں جاراتیں جاگتے ہیں۔ یہ ہمارے خصموں سے جلتی ہیں۔ ساڑا بھانبھڑ مچاتا ہے ان کے سینوں میں تو پھر پہرے دیتی ہیں۔ کھانے کو نہیں دیتیں، دو گھڑی ویل (فراغت) نہیں لگنے دیتیں۔ نلانا کی، ہسر، منہ دھونے کو صابن نہیں دیتیں کہ ہم زور وکر دق سے مر جائیں۔''

گھوں گھوں چکی کا پاٹ گھومتا تھا۔ دولخت ہوتے دانوں کا چھناچاروں اور سے نکلتا تھا۔

''میری والی کہاں بات کرنے دیتی ہے۔ پر میرا بندہ دلیر ہے، اُس نے تو کہہ دیا۔'' بی بی! پیلی میں روٹی لے کر رَجوہی آ ئے کسی اور کے ہاتھ کی آئی روٹی کبھی نہ کھاؤں گا۔ بھوکا مر جاؤں گا۔''

چکی کے پاٹ کے چاروں اطراف گھومتی مٹی کی بنی نالی میں اَب مرچوں کا سفوف گرتا تھا۔ بیج اور چیڑے (سخت) چھلکے اکٹھے ہو کر پاٹوں کے بیچوں بیچ لپٹ گئے تھے۔ جیا نے اوپر والا پاٹ اُٹھا کر پچھلی دیوار سے ٹکایا اور سارے بیج اور چھلکے اکٹھے کر دوبارہ چکی میں ڈالے شازو کی مٹھی نیتو کی مٹھی سے بدل گئی تھی۔

''رات کی سنو، اچھو چھت پہ سوتا تھا۔ سو بار بانو (چٹیا) کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ بے بے سو جائے تو چھت پر آنا ڈائن خراٹے لے رہی تھی۔ مَیں سمجھی سوگئی۔ مکر کیئے پڑی تھی۔ گت (جٹیا) سے پکڑ کر اُوپری سیڑھی سے کھینچا۔ سارے صحن میں جھاڑو کی طرح پھیرا۔ ہائے سکھیو! یہ بیٹے بیاہتی کیوں ہیں اپنے جوگے رکھ لیا کریں پھر کہتی ہیں۔ ہائے میرے لال کو کمزور کر دیا اِک ساہ میں ڈھائی من بوری اُٹھاتا تھا۔ اب بورہ بھی ریڑھی پر رکھ لے جاتا ہے۔ ہائے سکھیو...... یہ سائیں صوبے چوکیدار کے ساتھ راتوں کو پہرے پر کیوں نہیں لگ جاتیں۔ چلو پنڈ والوں کا ہی کچھ بھلا ہو۔''

مرچوں کی کڑواہٹ میں لتھڑے قہقہے کوٹھڑی کی امس کو لپیٹے اوٹے کی سلگتی چھٹریوں میں تڑتڑ تیل سے ٹپک گئے۔ جن میں گھلی مرچاہٹ اُونچی نیچی پیڑھیوں پر بیٹھی ساسوں کے کلیجوں میں لاسیں چھوڑ گئی جو چولہے میں دھکتی چنگاریاں چلموں میں بھر بھر سُوٹے لگاتی تھیں اور بغلی کھیسوں سے نسوار کی پڑیاں نکال نتھنوں اور مسوڑھوں میں انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلیاں دباتی تھیں۔ لال کالے مسوڑھوں میں اَٹکے اِکادُکا دانت بساند کے بھبھوکے مارنے لگے۔

''ہائے نی سکھیو! سنا شہر میں چولہے پھٹتے ہیں بجلی کرنٹ مارتی ہے، بہویں جل مرتی ہیں۔ یہاں نہ تیل والے چولہے جلیں نہ بجلی آئے یہ کلموہیاں مریں تو کیسے مریں۔ کیا ہم نے اسی روز کے لیے بیٹے جنے تھے کہ جب کماؤ ہوں تو ان گرم کتیوں کے چولہے ٹھنڈے کریں جیسے لیریاں (دودھ دیتی بھینس) نہانے کو تالاب میں جائیں اور حوانوں (تھنوں) سے جونکیں چمٹ جائیں......لہو دُودھ سب چاٹ جائیں۔ ہائے جونکیں، ہائے ہائے جونکیں!'' رحمتے نے دونوں ہتھیلیاں گھٹنوں پر زور زور سے ماریں۔

''رحمت بی بی! تو سولہ آنے پکی ہے سولہ آنے پکی۔''

''پھرے بھی کہاں تک دیں یہ ہر سال جنیں اور ہم انہیں چوریاں کھلائیں۔ پھاپو ماچھن نے اچھا کیا۔ دائی کی منت کر کے زہر کا بوہڑار کھوا دیا۔ ڈھائی دیہاڑیاں تڑپ تڑپ مرگئی۔ ہائے نی مجھے بھی کہیں سے زہر کا بوہڑالا دو میری تو دیہاڑی دو میں بیٹھنے والی ہے۔ ڈھائی دیہاڑیاں نہیں ڈھائی گھڑی کی آئے اسے پھاتھی مرے۔''

برکتے نے ماتمی ہتھیلیاں رانوں پر تڑ تڑ ماریں۔

''بخشو لوہار کی بھینس پھاتھی مرگئی۔ کٹا آدھا اندر آدھا باہر۔''

ساری ساسوں نے ہاتھوں کی اوک بنا آسمان کو دیکھا جسے گدھوں، چیلوں اور جنگلی کوؤں نے ڈھانپ رکھا تھا اور سورج ڈھندلا گیا تھا۔

ساریوں نے بیک وقت نگاہیں نیچے کیں۔

''ہائے نی پھاتھی مرے۔ کبھی نہ ویلی ہو کے اُٹھے پھاتھی مرے۔''

نسوار زدہ مسوڑھوں کی بساندا و نے سے نکل کوٹھڑی کی اُمس میں گھل گئی۔

کتنے برسوں بعد آج پھر مامی رحمتے نہیں اُٹھی تھی سارے مرغے سینہ پھلا اور پر پھڑ پھڑا کئی کئی بار اذانیں دے چکے تھے۔ حالیوں کے ہنکارے اور ٹلیوں کی کھنک دُور چلی گئی تھی۔ مسجد کے مینار سے اُتر صبح کا تارہ نیم کے جھنڈ میں ڈھندلا رہا تھا۔

''پتر جیالسی کا چھنا۔''

بھڑولوں بھرے اناج کی اُمس میں زندگی سانس کی بھیک مانگتی تھی۔

''ماما! ابھی مامی تو اُٹھی بھی نہیں۔''

''چل پھر تو ہی ریڑ کا ڈال لے۔''

''ماما تجھے سب پتہ ہے پھر میرا کلیجہ کیوں بھونتا ہے۔''

دونوں مو گھے بھر آئے۔ چولہے ریڑکے کے کسی کام کو وہ ہاتھ لگائے تو وہ نجس نہ ہو جائے۔ پتہ نہیں کیسے، پچھلے کئی برسوں سے بلّو بھی گھر میں نہ سوتا تھا، رات بہک میں جاگ کر گزارتا تھا اور جوگوں (بیلوں کی جوڑیوں) کی حفاظت کرتا تھا۔

جب اُس کے چاروں لڑکے سکول کی وردی پہنے اور کتابوں والے تھیلے کندھوں سے لٹکائے ادھ ریڑکا پینے اور پراٹھے کھانے باہر آئے تو اُسے احساس ہوا کہ اَب تو مُلا بھی بولنے والا ہے اور لڑکوں کے پراٹھوں پر اچار کی پھانکیں رکھ پونے بھی ابھی نہیں بند ھے اور ابھی اُنہیں دس کوس تاروں کی لو میں پیدل چل کر سکول پہنچنا ہے۔ کویلے (دیر سے) پہنچیں گے تو ماسٹر پوری بارہ بارہ چھمکیں ہتھیلیوں پر توڑیں گے۔

سوت سے بنی چارپائی پر پڑے رحمتے کے ڈھیر کو چھوٹے نے جا کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''دادی! آج کیا ہم بھوکے ہی سکولے جائیں گے۔''

اور پھر لڑکا چوکے کے اوٹے تک پچھلے پاؤں واپس لڑھکا۔

''دادی......دادی نہیں، امی! دادی نہیں۔''

وہ گوبر سے لتھڑے ہاتھ آپس میں رگڑ رگڑ جھاڑتی ہوئی چارپائی کی سمت بھاگی۔ نسوار تھپے سیاہ مسوڑھوں میں پروئے اِکاڈُکا دانت جیسے ٹھوڑی پر دھرے ہوں۔ ناک کے چھید اور نتھنوں سے قطرہ قطرہ بہتا لجلجا زرد پانی جبڑوں کی زرد نوکیلی ہڈیوں پر ٹپکتا تھا۔ آدھی کھلی آنکھوں میں دھنسے ڈیلے سارے ہی باہر کو اُبلے تھے اور انگل انگل زرد دانت جیسے اُسے نکوسنے کو بڑھتے ہوں۔

''ہائے مامی مرگئی۔''

سینے کو چیرتی چیخ اڑوس پڑوس کے لیے منادی تھی۔ جیسے وہ بروقت نہ چیختی تو مامی اُٹھ کر اُس کی گردن میں نوکیلے دانت گاڑ کر اُس کا سارا لہو چوس جاتی۔

اب وہ ریڑکے کی سائین تھی اور چوکے کی مالک تھی مکھن کے پیڑے تھپتھپاتی تھی۔ لسی ورتاتی تھی اور بلوں والے پراٹھے تل تل پکاتی تھی۔ یہ کیسا گھمنڈ تھا کہ ڈنڈی جھمکی والے کانوں کی لویں بھی گداز ہو گئیں۔ لٹکے چھید بھر گئے ناک کے اطراف اور آنکھوں کے نیچے بچھے لکیروں کے جال کو جیسے چکنی مٹی کا گھنا پوچا پھیر کر ہموار کر دیا گیا اور پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے اطراف میں کولہوں کی ہنیری سی بننے لگی۔ پہلی بار تو اسے اولپے تھاپتے دیکھ شازو نے ہی مشورہ دیا جو اس کے سنگ کتنے ساون مل کر برسی تھی۔

''جیا سکھیے! اَب تو پاتھیاں تھاپتی اچھی نہیں لگتی بڑے کاکے کو بیاہ لے جھاڑو بہارو والی لے آ

گھر پر۔'' اور پھر تو پورے گاؤں کو بس یہی رٹ لگ گئی۔ وہ کہتی رہ گئی۔

''ابھی تو نیانا (بچہ) ہے۔ سکول جاتا ہے۔ دسویں کے پرچے ڈالنے ہیں اُس نے اسی پھاگن چیت میں.....''

آخر اس معتبر وجود نے کسی رائے کو بھی تو جنم دینا تھا اُس کا بھی تو کوئی مشورہ ہونا چاہیے۔ آخر چولہا ریڑ کا اُس کے پاس تھا۔

پر ہوا وہی جو باپ نے چاہا چاچوں، تائیوں اور پھوپھیوں نے سوچا اور اُس کے دائیں ہاتھ بچھے پلنگ پر مہندی کی باس اور اُبٹن کی مہک لال ریشمی کپڑوں سے چھٹ چھٹ پورا کوٹھا بھر گئی تھی۔ گاؤں بھر کی لڑکیاں اُس پلنگ پر چڑھ بیٹھی تھیں جو دلہن جہیز میں لائی تھی اور جس پر فومی گدا بچھا تھا اور بچے اُچھل اُچھل کر جھولے لیتے تھے۔ گاؤں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ واحد پلنگ تھا جس پر گاؤں بھر کی لڑکیاں اور بچے چڑھ بیٹھے اور وہ سالم رہا۔ ورنہ کسی دلہن کا شاید ہی کوئی پلنگ رہا ہو لڑکیوں کے بوجھ نے جس کی چوکھاٹ توڑ نہ دی ہو۔ گاؤں والیاں حیرت سے پلنگ کو دیکھتی تھیں اور خود وہ کاموں کی تقسیم کی تفصیل طے کر رہی تھی۔

ریڑ کا چولہا اُس کا، پیلیوں (کھیتوں) میں روٹی نکی لے جائے گی۔ باڑے کی صفائی اور ڈھور ڈنگر کی ٹہل سیوا دلہن کے ذمے۔ تبھی کا کا طاق مار کر داخل ہوا اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی دلہن کا ہاتھ پکڑا۔ مہندی اور اُبٹن کی باس یوں نکل کر ہوا ہو گئی جیسے بھوری کا سنگل کھول سب کے سامنے پانی پلانے لے گیا ہو۔ وہ اس سان سے چلی جیسے کئی پہر کی پیاسی تالاب کی اور چلی ہو۔

لڑکیاں ایک دوسری کی بغلوں میں گھسی دلہن کی خالی کی ہوئی جگہ کو یوں چوری چوری دیکھتی تھیں اور منہ چھپا لیتی تھیں جیسے وہ جگہ شرمناک حد تک ننگی ہو گئی ہو اور جیا کی تو اس ننگے ستر کو دیکھنے کی سکت بھی وہ ساتھ ہی لپیٹ کر لے گئی تھی۔

اُرے ایک وہ تھی کہ شادی کے اٹھائیسویں روز تک بلّو کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ بلّو کتنی بار کوٹھے کے دروازے تک آیا بھی لیکن ماں کی ایک ''ہوں'' نے وہیں سے پلٹا دیا چوری چھپے کئی بار بانہہ (بازو) پکڑی بھی پر وہ چھڑا کر بھڑ ولوں والی کوٹھڑی میں جا چھپی اور یہ کا کا ابھی اُس روز تو ماسٹر نے پوری بارہ چھمکیں اُس کی انہیں ہتھیلیوں پر توڑی تھیں اور وہ اُنہیں چوم چوم ان پر مکھن ملتی رہی تھی۔ یہ جو

ابھی ابھی کوٹھے میں داخل ہوا اور ہر شئے کو لرزا سہا کر چلا گیا۔ یہ وہی کا کا تھا یا اُس کے اندر کوئی دوسرا بڑھتا رہا، جسے وہ ماں ہو کر بھی نہ دیکھ سکی۔

''جاؤ لڑکیو جاؤ گھروں کو...... ہائے شرمیں مر گئیں بے شرمیاں جوان ہو گئیں۔ جاؤنی اپنی شرمیں ڈھونڈو۔''

یہ کیسا بین تھا جو آپ ہی آپ شادی والی رات ماتمی آہنگ میں گونجتا رہا تھا۔

صبح مرغوں کی بانگوں کے بعد مُلا بھی بول چکا۔ تنگ آ کر نِکی نے ٹوکری اُٹھالی پر دُلہن ہلی تک نہیں، جیسے یہ کام اُس کے ذمے تو تھا ہی نہ۔ دِن چڑھے کا کا بیٹھک سے آنکھیں ملتا ہوا نکلا، اور کوٹھے کی دہلیز الانگتے ہوئے پیچھے مڑ کر بولا۔

''امی میری اور کبریٰ کی روٹی نکی کے ہاتھ اندر ہی بھجوا دو ساتھ اَنڈے کا سالن بنا دینا۔''

جیا کے ہاتھ سے رِیڑکے کی ہیل چھوٹ کر نیلنے کے ڈنڈے سے ساری کی ساری بل کھا گئی اور دستی عمودا کھڑی ہو کر تعویذوں کے دھاگے میں اُلجھ گئی۔

اڑوس پڑوس کے منتظر کانوں کی پیاسی زمینوں میں اُس نے آخر پہلا قطرہ ٹپکایا۔

''ہائے نی سکھیوؤ! ایک ہم تھے اگلے ہی روز مامی نے ٹوکری ہاتھ میں پکڑا باڑے میں دھکیل دیا۔ ایک یہ ہے کہ مہینہ لگنے کو آیا نہ ہاتھ کی مہندی اُتری نہ پاؤں کی۔''

''بات تو اُس نے بس پڑوسنوں کے کانوں میں ہی ڈالی تھی پر وہ شاید پتلے کانوں والی تھی۔ اَندر سے ہی کنگھا شیشہ ہاتھ میں پکڑے چلا کر بولی۔''

''پھوپھی! آخر کیسے اُٹھا کروں، تیرا بیٹا اُٹھنے جوگا چھوڑے تو نا۔ کیا کھلاتی ہے ان سانڈوں کو......''

عورتیں بنیروں سے پیچھے دھکا کھا کر گریں اور آدھ آدھ پور چھیدوں والی کانوں کی لویں لال ہو کر سکڑ گئیں شازو نے کانوں کی لویں چھوتے ہوئے آنکھیں بکری کے چھیلوں پر جما دیں جیسے ایک دوسری کی طرف دیکھا تو دونوں سہیلیاں پانی ہو کر بہہ جائیں گی۔

جیا سکھیے! تیری ساس تیری مامی تھی اور تو اس کی پھوپھی ہے۔ فرق تو ہوا نا۔ یوں بھی دنیا بڑی بے حیا ہو گئی ہے۔ شہروں کی طرح گھر گھر فلمیں چل رہی ہیں۔ بیاہے کنوارے سب دیکھتے ہیں مَیں نے

تو سنار جو گجری کا بیٹا بہو مصلیوں مراثیوں کی طرح ایک چار پائی پر سوتے ہیں۔"

دونوں سہیلیوں نے بنیرے کی مٹی توڑ کر شہادت کی اُنگلی اور انگوٹھے کی پور سے رگڑا اور کانوں کی لویں چھوتے ہوئے ہنیوں بیچ تھوکا۔

''نہیں نی شازو! بڑا جھوٹ، جٹ زمینداروں میں تو ایسا اندھیر نہ دیکھا نہ سنا۔ کمی کمین کی اور بات ہے۔"

''چل یہ بھی جھوٹ کہہ دے جو تیرے گھر ہو رہا ہے یہ بھی جھوٹ...... جیا اڑیئے دُنیا بڑی تیز ہو گئی ہے۔ ٹو مَیں ہی مورکھ تھے...... بس بھوگ لی، جی تھوڑی۔"

''چل نی شازو! بے حیائی تو نہ کی نہ...... توبہ...... توبہ"

جیا نے مُنہ موڑ کر بہو کو دیکھا جو شیشہ ہاتھ میں پکڑے لبوں پہ سرخی جما رہی تھی۔

''سرخی"

جیا کے لبوں سے لفظ ''سرخی" یوں سرگوشی میں پھسلا جیسے کسی شرمناک عضو کا نام سرِ عام لینا پڑ رہا ہو۔

''سنتے تھے کنجریاں سرخی لگاتی ہیں۔ ہائے نی شازو! میری کنواریوں کی حیا...... گھر میں بڑی بے حیائی آئی۔"

جیا نے سینے پر دھموکا مارا۔

''پھوپھی کیوں گناہ اٹھاتی ہے دینیات کی کتاب میں لکھا ہے چغلی بڑا گناہ ہے۔ بس کر کل سے کوشش کروں گی جلدی اُٹھنے کی، پر اپنے بیٹے کو بھی......" اُس نے سرخی کی تہ کلیجی رنگ کر دی۔

شازو دوپٹے کی اَوٹ لے کر نیچے جیسے کنوئیں کے بوکے میں جھول گئی ہو اور جیا نے کانوں کے پیچھے اُڑسے چادر کے دونوں کنارے کھینچ کر کانوں پر پھیلا لیے۔

مرغوں کی بانگوں سے پہلے گھاں گھاں، گھیں گھیں کی آوازوں سے وہ کلیجہ پکڑ کر اُٹھی۔

''اے نکی! اے وڈی! نکی کی چار پائی سے ٹھڈا کھا کر وڈی کے پائے سے ٹکرا گئی اور پھر دونوں کولہوں پر ہاتھ جما کر خود کو سہارا دیا۔

''یہ آواز کیسی ہے؟"

نکی اور وڈی بیک وقت اُٹھ کر بیٹھیں اور بکلوں سے کان باہر نکالے۔

''امی! رِیڑ کے کی لگتی ہے۔''

''پر نِکی یہ رِیڑ کا گھمک گھمک سے گھیں گھیں کیسے ہو گیا۔ ہیں وڈی!......''

''امی ٹھہر......ٹھہر ذرا۔ سُن۔''

''امی! یہ آواز تو ہمارے ہی احاطے سے آتی ہے۔''

نکی کی پہلی چھلانگ دروازے تک تھی اور وڈی کی دوسری چھلانگ اوٹے تک تھی۔ دلہن سارے چھلے مندریاں پانی والے کٹورے میں ڈال کنالی میں آٹے کی گھانی سی بنا پانی کی دھار چھوڑ رہی تھی اور چاٹی کے منہ پر لگی ہرے رنگ کی آہنی مدھانی آپ ہی آپ گھیں گھیں چل رہی تھی۔

''بند کرا سے۔''

جیا دونوں کولہوں پہ ہاتھ رکھے بدن کی لوتھ کو سنبھالے اب پہنچی تھی۔ اور مہینے بھر کا اُندر جمع ہوا سارا کچھ منہ میں اُنڈ کر اس ایک جملے کی صورت باہر اُبل پڑا تھا۔

دُلہن آٹے کو مکیاں دیتے ہوئے کھی کھی کرتی اس گھاں گھاں کے رِدھم میں جھومتے ہوئے خُود بھی شامل ہو گئی۔

''آپ ہی بند کرلے پھوپھی! اگر تجھ سے ہوتی ہے تو تُو خود ہی کر لے اسے بند، پر ذرا دیکھ کر بجلی کی ہے کرنٹ بھی پرائے ہاتھ کو مار دیتی ہے تُو نے کون سا کبھی برتی ہے۔''

اور جیا کولہوں پہ ہاتھ رکھے بدن کی لوتھ کو سنبھالے اُس عجوبے پر یوں جھکی رہ گئی۔ جیسے وہ کرنٹ مارتی نہ ہو بلکہ اُس پرائے ہاتھ کو مار چکی ہو۔

روزن

اسماء کی بیوگی کو دیکھتے ہوئے سہاگنوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اللہ ایسی بیوگی ہر کسی کو بخش۔'' اسماء کے گھر کام کرنے والی بیوہ عورت رضیہ نے بیوگی بھر حسرت اپنی آہ میں سمیٹی۔

''اللہ ایسی بیوگی پر سو سہاگنیں قربان۔''

رضیہ جسے بیوگی کے چوتھے روز ساس سسر نے مار کوٹ نکال باہر کیا، روٹی روزی کی مشقت کرایہ ادا نہ کر سکنے پر روز روز کی بے دری، بیمار بچوں کا دوائی کے لیے بلکنا یعنی وہی سارے لوازم جو بیوگی کا زیور ہیں۔ پر اسماء کو بیوگی کی اس آرائش پر رشک آنے لگتا۔ رضیہ کی بے دری پر نہیں، اُس کی رانڈ بھر بھوک پر بھی نہیں، اُس کے بھوکے ننگے بچوں کی افراط پر بھی نہیں۔ بلکہ ان سب کی پیدا کردہ مصروفیت پر۔ بیوہ ستی بھلے نہ ہو لیکن ستی سمان مصروفیت بیوگی کے توازن کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے تو دُور اندیش معاشرہ اُسے مصروف رکھنے کو روایتی طرزِ عمل جاری رکھتا ہے، جب کہ اسماء کے حصے کی ساری مصروفیت سسرالی رشتہ داروں نے اپنے سَر لے لی تھی۔

انعم سکول چلی جاتی، کام رضیہ کر جاتی، جو رہ جاتا وہ پڑا رہتا، آخر کس کے لیے کیا جائے۔ کام کسی ردِعمل کسی اشتراک کے واسطے ہی ہوتا ہے جب اشتراک اور ردِعمل ہی نہ رہے تو پھر عمل غارت،

اُس کا ہر کام ہر ضرورت دیور جیٹھ پوری کر جاتے اور وہ رہ جاتی فارغ کی فارغ اور فراغت کے عمل میں نہ کہیں اشتراک ہے، نہ ٹکراؤ، بس بوریت کا منفی ردِعمل اور بوریت بے عملی ہے۔

رضیہ حیران ہو ہو کر کہتی۔

''باجی اتنے اچھے سسرال، اللہ! آپ تو شکر کرتے کرتے نہ تھکو۔''

لیکن جب محنت و کوشش کے بنا ہی نعمتیں ملنے لگیں تو بندہ ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اسماء فی الواقع ناشکری تھی ورنہ شکر ادا کرنے کو اُسے کتنے مواقع میسر تھے۔ ساس سسر بہو کی بجائے بیٹا کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ دیور، جیٹھ، بھابھی کی بجائے بہن جی اور بھابھی ماں بلانے لگے تھے اور اسماء کو یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ اپنی حیثیت، مقام اور عمر میں ایک دم بہت بڑھ گئی ہے اور اس عظمت کو برقرار رکھنا ہی دراصل اُس کی بیوگی کا جائز ردِعمل ہونا چاہیے۔ جبکہ انعم چاچوں، پھوپھیوں کے لاڈ کے ہنڈولے میں اپنی عمر سے گھٹنے لگی کہ دس سال کی عمر میں روٹی کو توتی بولنے لگی۔ اپنی عمر اور فطری احتیاجات سے آگے بڑھ جانا یا پھر پیچھے رہ جانا بندے کو ناشکرا بنا دیتا ہے، ناانصافی کا ردِعمل عدم توازن ہوا کرتا ہے۔ چاہے جسمانی، چاہے ذہنی، چاہے نفسیاتی، چاہے عملی...... اسماء کو بیوگی کا سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا تھا کہ دن کا پیشتر وہ حصہ جو وہ بننے سنورنے میں صرف کرتی تھی۔ وہ بالکل بے کار ہو گیا، چلو معاشرے کے منفی ری ایکشن کی مصروفیت وہ حاصل بھی کر لے تو فائدہ وہ تو پورے معاشرے کی ماں تھی۔ کیونکہ بیوہ کی دو ہی حیثیتیں بنتی ہیں۔ یا ماں یا رنڈی اور یہ نازک فیصلہ بیوہ کے طرزِ عمل سے ہی ہوا کرتا ہے جس پر سماج مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور اس پر یہ اتھارٹی لگ گئی تھی کہ وہ ماں ہے اور ماں کے چہرہ اور جسم تو لگا نہیں ہوتا، وہ محض کردار ہوتی ہے اور ماں کا کردار نفسی اور نفسیاتی لغزشوں سے مبرا ہوا کرتا ہے۔ وہ وقت جو بازار گزرتا تھا، وہ بھی فالتو ہو گیا۔ آدھ کلو سبزی ترکاری خریدنے کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مصروفیت بھاؤ تاؤ اور چننے چھاننے میں صرف ہو ہی جایا کرتی تھی، بجائے اس کے کہ اُسے بے گھر ہونے، کمانے، باہر کے دھکے کھانے، شریکوں عزیزوں کے طعنے معنے سُننے کی مصروفیت میسر آتی۔ اُسے تقدیس کی روئی میں لپیٹ کر فراغت کی پرچھتی پر سجا دیا گیا۔ فراغت کی پراگندگی ڈسنے لگی۔ زہر باد پھیلنے لگا، تو وہ کراہنے لگی۔

''اگر آپ مائینڈ نہ کریں تو مَیں کہیں نوکری کر لوں۔''

سسر کے آنسو سفید داڑھی پر ٹپکے اور اندر کہیں سفید گرتے میں جذب ہو گئے۔

''کیوں بیٹی! ہم سے کوئی کوتاہی ہو گئی کیا، کوئی ایسی ضرورت رہ گئی جو ہمیں معلوم نہ ہو سکی......''

ساس کی ہچکی بندھ گئی، جیسے ابھی ابھی سجاد کے ایکسیڈنٹ میں ہلاکت کی خبر ملی ہو۔''بیٹی ایسی کوئی ضرورت ہے تو مجھ سے کہہ میں جو تیری ماں ہوں......''

اب وہ اُنہیں کیا بتاتی کہ ضرورت ہی تو رہ گئی ہے، جسے سمجھا تو جا سکتا ہے لیکن بیان کے لیے کم از کم اُس کی زبان میں ابھی کوئی ایسا لفظ ایجاد نہیں ہوا اور سوچ کی غفلت میں حقائق کی سنگینی قید ہو جایا کرتی ہے۔ چھوٹے دیور نے قہقہہ لگایا۔

''بھابھی ماں! پانچ وقت کی نمازیں اور اضافی وظیفے اور تسبیحیں مسلمان عورتوں کے پاس فراغت رہنے ہی کہاں دیتے ہیں کہ وہ کچھ اور بھی کریں۔ مَیں تو کہتا ہوں، یہ جو مسلمان قوم ترقی کی دوڑ میں اس قدر پیچھے رہ گئی ہے۔ تو اس میں ان کی اس مصروفیت کا بھی ہاتھ ہے۔ اِن کے پاس تو فرضی عبادتوں کے بعد ہی اتنا وقت نہیں بچتا کہ فراغت کی سہولت میسر آئے۔ نفلی عبادتیں مستزاد۔''

اسماء کا جی چاہا کہہ دے اس میں عبادتوں کی نسبت، چار چار بیویوں اور معشوقاؤں کی مصروفیت بھی تو شامل ہے اور پھر زیتون، کھجور اور بروسٹ کی ہنگامی مصروفیات، وہ خود بھی تو یہی کچھ کھاتی ہے، جن کا مطالبہ ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ ہر نوع کی غذا اپنی نوعیت کا ری ایکشن چاہتی ہے، لیکن اُس کے پاس تو بے عملی ہے۔ فارغ دماغ، فارغ جسم، جس کی غذا مصروفیت ہے اور غذا کا قحط بدامنی اور لاقانونیت پیدا کرتا ہے۔ رضیہ روتی کُرلاتی آئی تھی۔ یوں بیوہ کے لیے رونے کُرلانے کی مصروفیت بھی کتنی رومانوی ہے۔ جیٹھ نے اُس کے چار بچے چھین لیے تھے اور جو تین اُس کے پاس رہ گئے تھے۔ وہ صبح سے بھوکے تھے اور سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ اُسے رضیہ پر بیوگی بھر رشک آیا۔ کیسی زبردست مصروفیت تھی، اُس کے پاس، بھوکے بچوں کا پیٹ بھرنے کی مصروفیت، رشتہ داروں سے لڑنے جھگڑنے کی مصروفیت۔ اُس نے بھوکے بچوں کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔''آخر چاہتا کیا ہے تم سے، دینے دلانے میں کچھ ہے نہیں، خود کما کر کھلاتی ہو اُنہیں پھر کیوں تمہیں مارتا اور چھینتا ہے انہیں تم سے......''

رضیہ تین نوالوں کا ایک نوالہ گال میں پھلا کر شرمائی۔

''باجی! کیا بتاؤں مطلب تو اُس کا کچھ اور ہے۔ پر مجھ سے نہیں ہوتی یہ حرام کاری، کہتا ہے اس

بھر جوانی میں تم پاک مریم بننے سے تو رہی۔ باہر کھیہ کھانے کی بجائے گھر میں ہی سنبھلی رہو تو بہتر، جس دن انکار کر دوں یہی حشر کرتا ہے۔ ہلکا ہو گیا ہے مردود۔''

اس بدبو ماری، کالی، موٹی، ٹھگنی عورت میں بھی ایسا کچھ ہے کہ کوئی مرد اُس کے لیے پاگل کُتا بن جائے۔ شاید خود عورت زاد جو بڑا نقص امن ہے۔ رضیہ پلو پر گرم سانس پھونک پھونک چہرے کے نیلوں کو ٹکور کرنے لگی۔

''باجی! آپ بڑی مُقدر والی ہو۔ ایسی اچھی سسرال ملی، بہن جی، ماں جی کہتے کہتے منہ سُوکھتا ہے ساروں کا، ورنہ رانڈ بیچاری تو محلے والی جیسی ہی سمجھی جاتی ہے۔ ہر کوئی رالیں ٹپکاتا پھرتا ہے۔ بھا ہی اور دانے لاسے سے آخر کب تک بچے، بندہ بھولن ہار، پر قسم لے لو باجی! آج تک کسی سے ایک ٹکا لینا لوانا حرام۔ ان دو ہاتھوں کی محنت کا کما کر ہی بچوں کو کھلایا۔''

رضیہ نے فخر اور داد طلب انداز میں گنجلیں بنا سَر اُوپر اُٹھایا۔

اسماء نے اس بے جگری پر رضیہ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

''لو اور سُنو باجی! چھوٹا دیور جو بیاہی آئی کی گود میں ساس نے بٹھایا تھا، کل وہ بازو پکڑنے اور ڈھارے میں رگیدنے لگا، لو میں نے بھی خوب ہی دھپے لگائے، حرامی بولا تیرے دھپوں میں بھی مزا ہے جانم......''

''انڈین فلموں سے سیکھتے ہیں نا یہ ساری بکواس...... بُرے کہیں کے۔'' رضیہ منہ پر پلو لپیٹ کر ہنسی، جیسے دیور کی برائی کا ردِعمل شریری گدگدی ہو، جو کہیں ڈیلوں اور ہونٹوں کے بے جلد کے گوشت میں ہوئی ہو۔

یہ مرد بھی کتنی بڑی مصروفیت ہے، عورت کے لیے، جب سجاد زندہ تھے، تو اُسے فرصت کہاں ملتی تھی۔ انتظار کی مصروفیت، لڑنے جھگڑنے کی مصروفیت، رُوٹھنے منّنے کی مصروفیت۔ بننے سنورنے کی مصروفیت پورا دن پانی بھری چھلنی کی طرح بہ جاتا، جس دن سجاد گھر پر نہ ہوتے، تو فراغت بھرا دن چھلنی میں پڑے موٹے روڑوں کی طرح چھن چھن بمشکل تمام ہوتا۔ جب یہ مصروفیت رُوٹھ گئی تو منطقی لحاظ سے اس خلاء کو پُر ہونا چاہیے تھا۔ کلفتوں سے، مصائب سے، مشقت سے بھری مصروفیت کے ساتھ۔

اُس کی ساس نے کہا تھا سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تو بس وضو کرتے اور نمازیں پڑھتے

ہی گزر جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دن تو گزر جاتے ہیں۔ پر یہ لمبی لمبی راتیں کیوں نہیں گزرتیں۔ یہ ساس نے نہ بتایا تھا، جس نے بیوگی کے بعد اُس کے لیے پہلی شاپنگ سعودی حجاب کی، کی تھی۔ کیونکہ اب یہ طے تھا۔ بیوہ کا چہرہ کسی مرد کی نگاہ سے آلودہ نہ ہو۔ ایک بال تک دکھائی نہ دے۔ ورنہ بیوہ جہنمی ہوئی کہ بیوگی کا ردِعمل محض آخرت سنوارنا ہی تو رہ جاتا ہے۔ انعم بھی جلدی سونے لگی۔ حالانکہ باپ کی زندگی میں تو وہ سو کر نہ دیتی تھی اور وہ اُس کے سونے کا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو کر خود ہی سو جاتی۔ اب وہ اُسے جگانا چاہتی، لیکن دن بھر کزنز کے ساتھ کھیل کود، چاچوں دادا کی لاڈ برداریاں اور دادی کے مرغن کھانوں کا آلس، سرِ شام ہی چڑھ جاتا، اور پتھر دھڑ والی شہزادی کی کہانی ابھی بیچ میں ہی ہوتی اور وہ سو بھی چکی ہوتی، ادھوری کہانی کی گنجھلوں میں اسماء کی نیند پتھرا جاتی۔ نیند بھی تو ذہنی اور جسمانی تکان کی غذا مانگتی ہے اور فاقہ زدہ کو نیند نہیں آیا کرتی، فاقہ چاہے جسمانی ہو، چاہے ذہنی، چاہے نفسیاتی، بندے کو نحیف اور کمینہ بنا دیتا ہے۔ یہ بھوک بھی عجب ہے یا بےہوش کر دیتی، یا اُونگھ بھی چھین لیتی ہے۔

فارغ رہ رہ کر اسماء کے بدن میں کھلیاں پڑ گئی تھیں، جن کا اکڑاؤ رات بھر ذکمن چھوڑتا، گرہیں پروئے وجود کا ہر ہر مسل گنجھل بن گیا تھا۔ کوئی دو مضبوط ہاتھ زور زور سے دبا دیں۔ پنجوں پر مکیاں ماریں۔ ہتھیلی میں تیل ڈال کر بالوں کی جڑیں سہلائیں کسی دردچُن لینے والے تیل سے پورے جسم کی تیز تیز مالش کر دیں۔ اُسے تو دبوانے کی کبھی عادت نہ رہی تھی لیکن اب تو یہ پورا بدن سُوت کی اَٹی کی طرح گنجھل گنجھل ہو گیا تھا جنہیں کھولنے کے لیے ایک ایک تار کا سرا اُدھڑ تک سلجھانا پڑتا ہے۔ ورنہ سارا پنارہ بےکار۔

انعم بھی سوئی ہوئی ہوتی، ورنہ اُسے ہی کہتی "ذرا دبا دو۔" وہ تکیہ بھینچتی، کمبل میں بدن کی گٹھڑی کس کس کے باندھتی، لمبے پینڈے کی تھکن عضو عضو میں سفر کرتی۔ رننگ مشین سا پینڈا بھاگتے رہو۔ بھاگتے جاؤ پر کھڑے وہیں کے وہیں رہو، تھکن منہ سَر سے نکلنے لگتی۔ بےسمت سفر بھی کتنا تھکا دیتا ہے۔ منزل کی سمت لمبا سفر بھی تھکن کو آسودہ کرتا رہتا ہے۔ اجنبی ماحول اور بے شناخت تکان نیند اُڑا دیتی ہے۔ اُٹھ کر ٹی وی چلاتی۔ خوبصورت اور جوان چہروں اور جسموں کا ازدحام اتنی بھیڑ، ملبوسات کی رنگا رنگی، گہرے اور شوخ رنگ، جیسے آگ کی دہک، تعیشات کا نظارہ بدن میں بھڑک کیوں مچا دیتا ہے، جیسے تنور کی سطح کی گلابی دہک جل جل سرمئی ہو جاتی ہے۔ ہر چینل پر رنگوں اور جسموں کی آتش بازی،

چنگاریاں اُڑتیں، انار چھٹتے، پُھرلیاں پرواز بھرتیں، کسی امیر کی شادی کی آتش بازی کا سا منظر، مضطرب کرنے، دہلا دینے اور مرعوب کر دینے والا۔ اس آتش بازی کے گتاوے سے کیسے کیسے منظر گزر جاتے جو بیوہ کے دیکھنے کے نہیں ہوتے۔ نابالغ دیکھے تو شاید سمجھ کی معذوری حیرت ہو جائے۔ کنواری دیکھے تو کچھ سہانے خوابوں کی طنابیں مزید کھنچ جائیں، لیکن بیوہ دیکھے تو وجود کی باسی ہمک، بدبو ہو کر شناخت کے زہر کو محرومی کے کرب میں بلو ڈالے، تو پھر بغاوت یا موت۔

یہ نفسی بندشیں کتنی ضروری ہیں بیوہ کے لیے۔ دال بھات کھانا، موٹا جھوٹا پہننا، ناآسائش زندگی بھوگنا، ٹکراؤ کی کیفیت میں رہنا، جس کا منطقی نتیجہ اندر کہیں دُور تک خوف اور دہشت کی فضا کا لاگو ہونا ہے لیکن یہاں بندش لگی تو محض نمو پر، قد نہیں بڑھتا، جسم نہیں بڑھتا، دماغ نہیں بڑھتا لیکن اندرونی نمو تو جسم میں، دماغ میں، خون کی گردش کے ساتھ ساتھ جاری رہتی ہے۔ یہ جذبات، احساسات، خیالات، بیوہ کیوں نہیں ہو جاتے، ان کا شوہر کیوں نہیں مرتا کبھی...... اگر کھاد، پانی ملتا رہے تو زمین کی زرخیزی بنا بیج کے بھی کئی خودرو جھاڑیاں اُگا ڈالتی ہے۔ اندر کی اس زمین کا بانجھ ہونا بیوہ کے لیے ازحد ضروری ہے۔ بھٹی بنے باورچی خانے میں ساری دوپہر گزارنا، سسرال بھر کے بھانڈے کپڑے دھونا مانجھنا، گالیاں جھڑکیاں کھانا اور روتے دھوتے ایک ایک دن میں ایک ایک سال کی سیڑھیاں پھلانگتے چلے جانا۔ کتنا ضروری ہے اس اندرونی نمو کو سونٹھ کرنے کے لیے، وجود میں اُگ آئے بھکھڑے اور آکاس بیل کی شادابی اور بڑھوتری کے لیے، لیکن یہاں تو کوئی بندش لگی ہی نہ تھی۔ باہر کا امن اندر کی بدامنی ہو جاتا ہے۔ لہو کے ہر ہر قطرے میں باغی سَر اُبھارنے لگتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے احتجاجی مظاہرے اور پھر آنسو گیس کی شیلنگ، لہو اور بوٹیوں کی گھانی، جس میں کٹا پھٹا وجود تڑپنے لگتا، وہ مرثیہ نما شعر کہنے لگی، جس خاندان میں عورتیں چھوڑ مرد بھی میٹرک، ایف اے سے آگے نہ بڑھے ہوں۔ سوتر منڈی کے اُترتے چڑھتے نرخوں میں بڑھتی پھولتی توندیں، بھلا ادبی ذوق کسی لطیفے جیسا ہی ہوا نا، جسے پتہ چلتا وہ ہنستا اور اُس کی ذہنی حالت پر افسوس کا اظہار کرتا، ساس سب سے قیمتی کپڑے اُسی کے لیے لانے لگی، سسر نے کوٹھی نام کر دی، جیٹھ نے نئی گاڑی تبدیل کر دی۔ دیور پھل فروٹ دوگنی مقدار میں لانے لگا۔ اندر کی بدامنی دوچند ہوگئی۔ باہر کی آسودگی اندر کی بدامنی کو انگشت دینے لگی۔ بغاوت رستے تلاشنے لگی۔

رضیہ دو دن سے نہ آئی تھی، گھر کا کام پڑا رہتا۔ پڑا رہے وجود کو تو فراغت کا دیمک لگا تھا۔ مصروفیت کی تختی کہاں سہارتا تھا، ساس کو پتہ چلا فی الفور دو دو کام والیاں بھجوا دیں، چوتھے روز بانگڑی والا لال دوپٹہ اوڑھے رضیہ آئی۔

''لو باجی کچھ نہ پوچھو، آپ بھی کہتی ہوگی کہاں مرگئی، سچ مر ہی تو گئی میں۔ ساروں نے پکڑ دھکڑ چھوٹے دیور سے نکاح دیا۔ بہتیرا روئی کُرلائی۔ پر میری کون سنے باجی، رانڈ بیچاری تو بھاجی ترکاری جیسی ہی ہوتی ہے نا۔ مرضی کا گاہک تھوڑی ملتا ہے۔''

رضیہ روئی چاہے ہوگی لیکن میلے کیلے آنسوؤں نے آنکھوں کو مل مل دھو دیا تھا۔ یوں جیسے ریت اور لیموں ملا کر مانجھے ہوئے برتن کی لشک ڈھلک ڈھلک پڑتی ہے۔

اندرونی نمو بیرونی بندشوں سے سر ٹکرانے لگی۔

''لیکن وہ تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

''میں بھی یہی سمجھی تھی۔ باجی پر ...... ''

رضیہ نے لال دوپٹے میں لشکتا ہوا کوکا لپیٹا، نتھنے میں ناخن ڈال کر کولی کو کھنکھنایا، بائیں آنکھ کا کونا ذرا سا دبایا۔

''پر توبہ باجی! یہ تو اپنے بڑے بھائی سے بھی بڑھ کر جوان نکلا۔''

دیور کی جوانی کا نشہ رضیہ کی آنکھوں میں مدہوش ہونے لگا، زرد گالوں پر رو پہلا ستارہ اور گلابی شفق مل کر جھلملائے، ایسی لو جھلکی، جو کسی بجھے دیپ کے جلاؤ، یا کرنڈ کلی کے چٹکاؤ میں ہوتی ہے اور جب یہ لو بجھ چکتی ہے۔ تو پھر برسوں کا روٹھا حُسن اور جوانی پل بھر کے لیے اپنی تمازت جھلکا جاتے ہیں۔ اسماء کا دیور پھل فروٹ گوشت سبزی سے لدا پھندا داخل ہوا۔

''بھابھی ماں! یہ سودا سلف دیکھ لیجئے کچھ اور چاہیے تو حکم کر دیجئے۔''

نظریں احترام کے باٹ تلے دہری ہوتی ہوئیں۔ ترازو کا پلڑا زمین کو چھو گیا۔

رضیہ کلی سے سبک وجود کو بانگڑی والے لال مہین دوپٹے میں لپیٹے چٹکی۔

''اللہ کتنی شرم ہے نظروں میں ایک ہمارا کا دیور ہوتا تو...... نرے بے شرم...... رہے مرد کے مرد، کوئی رشتہ، کوئی حد تو بنی ہی نہیں نا ان کے لیے ...... دیکھا جائے تو بچی اچھا بھلا جوڑ ہے، آپ کا باجی!

پر ماں بن کے اس کی دلہن خود ڈھونڈ رہی ہو۔"

وہ اُس کی دلہن نہ ڈھونڈے تو کیا خود اُس کی دلہن......

"توبہ اندر کی بدامنی اپنی جگہ پر لیکن بیرونی حد بندیوں کا لٹھ ذرا پیر کریز سے نکلنے نہیں دیتا، اخلاق، تعلیم، مذہب، ریت رواج کسی ایمپائر کی طرح نو بال، رن آؤٹ کا اشارہ دیتے ہر بدنظمی کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ایمپائر کا فیصلہ تو حتمی ہوتا ہے، جس کے خلاف احتجاج کرنے والے کو پینلٹی لگا دی جاتی ہے۔

اسماء کے دیور کے لائے ہوئے پھل فروٹ دھوتے ہوئے رضیہ نے لال دوپٹے کی سنہری کنی ماتھے پر جما کر ٹکل ماری، دیور کی بے شرمی کے حرفوں کی لال نیلی سیاہی کو چھپاتے چھپاتے دکھایا۔

"ویسے باجی! مرد کی سنگت کے بنا عورت کے جینے کا سواد کوئی نہیں......"

عورت کے جینے کا سواد نہیں ہے نا۔ پر وہ تو بیوہ ہے، جس کے حبس زدہ وجود کو سانس لینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی کیونکہ اُسے تنفس خارج سے پمپ کیا جاتا ہے۔ اندرون کا نظام تنفس تو فیل ہو جاتا ہے لیکن اُس کا باغی اندرون سانس کی گنجائش کیوں مانگتا ہے۔ دیور کی دلہن کی تلاش لمبی ہوگئی۔ اسماء کو اس کا کوئی مناسب میچ ہی نہ نظر آتا، سگے بیٹے کی دلہن کی تلاش میں بھی اس قدر کوئی نہ رولتا ہوگا جتنا اسماء رُل گئی تھی، لوگ حیران رہ گئے جیسے اُس کا جوڑ دنیا میں کوئی تھا ہی نا، ملتا کہاں سے، پر دیور بڑا بے صبرا نکلا خود ہی ایک بے جوڑ سا ڈھونڈ لیا۔ اس پاجی نفس کا کوئی معیار، کوئی اخلاق تھوڑی ہوتا ہے، بس بھوک کا ذائقہ ہوتا ہے اور بھوک کی بے صبری میں سب ایک جیسا لگتا ہے، صاف اور مزے دار، گند بھی اور مطاہر بھی، لیکن یہ خارج کا پمپ وجود کے اندرون کو بھکاری کے کشکول سا خالی خولی کیوں چھوڑ جاتا ہے۔

وہ روزے رکھنے لگی کہ شاید بوجھل معدے میں خلا بن جائے اور ٹھہرا تنفس رواں ہو جائے۔ وہ رضیہ کے دیور کے دیئے ہوئے داغوں کو دیکھ کے توبہ استغفار کی تسبیح کرتی۔ رضیہ تسبیح کے وِرد کو بار بار بھنگ کر دیتی۔

"لو باجی! میں تو ہوں ہی نصیبوں پٹی، پہلا کیا کم ظالم تھا۔ دوسرے نے تو حد ہی مکا دی، جو چار چھلڑ کما کر لے جاتی ہوں پتوں میں لگا، ہار دیتا ہے اور پھر بنیان پھرولنے لگتا ہے۔ روکوں تو یہ

حالت کرتا ہے۔''

اسماء نے زخموں، سوجنوں اور نیلوں کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا۔

''تو نکال باہر کرو حرامی کو، تمہیں کما کر تھوڑی کھلاتا ہے جو یہ ظلم سہتی ہو۔ تو بہ استغفار یہاں تک نیلو نیل کیا ہے تجھے، بُرے نے......''

''خیر یہ نیل تو دوسرا ہے باجی۔'' رضیہ دوسرے نیل کو پلو میں چھپا کر شرمائی اور پہلے نیلوں کی دُکھن میں کراہی۔

''حرامی مار مار ادھ موا کر دیتا ہے تو پھر پیار بھی تو ڈھیر سا کرتا ہے، پتہ باجی! اب اُس کی مار پر مروں کہ پیار پر جیوں۔ باجی یہ عورت ذات بھی بڑی کتی، مرد کی ذرا سی شُشکار کے لیے کتنی خجل خواری سہہ جاتی ہے۔ اس نیل کی خاطر کتنے نیل اور زخم پی جاتی ہے۔ ویسے رب کو زنانی کے ساتھ یہ مرد کے پیار والی کُت نہیں لگانی چاہیے تھی۔ نری کُتا مکھی، ناک سے اُڑاؤ، ہونٹ پر، ہونٹ سے اُڑاؤ آنکھ پر، آپ تو بڑی نیک پاک ہو جتی ستی ہو۔ اپنی نماز میں دُعا کیا کرو، باجی! عورت کے پنڈے سے مرد والی کت نکل جائے، پھر سکھ میں آ جائے گی یہ عورت ذات۔ یہ کُتا مکھی بڑا جان کا عذاب اس کی کت بڑی بُری۔

اس کی نماز میں دُعا کا دورانیہ طویل ہو گیا۔ اس کو دُعا کرنا تھی۔ عورت کے بدن سے مرد کی کت نکل جائے، کُتا مکھی سی لیچڑ جسے ناک سے اُڑاؤ تو آنکھ پر، آنکھ سے اُڑاؤ تو ہونٹ پر جا بیٹھتی ہے......

درود شریف کے ورد لمبے ہو گئے، غزلوں کی گنگناہٹ نعتوں میں تبدیل ہو گئی، آواز کا سوز میلاد کی مجالس میں کرب بھرنے لگا۔ بھرے ہوئے بادل دل کھول کر برستے، یہ رونے رولانے والی آسودگی بھی حبس موسموں کو آندھی، جھکڑ، بارش کے بعد جیسی خوش گواریت دے جاتی ہے۔

سلام اے آمنہ کے لال اے ظلِ سبحانی

لفظ ''آمنہ'' پر ہی بند نوٹ پڑتے، ساری چھم چھم پلو بھگوتیں۔ کیسے کیسے انقباض کھلتے اور رکاوٗ جاری ہوتے، اُچک اُچک کر اسماء کے ہاتھ سے ہاتھ ملاتیں، جیسے اس کرب کے اشتراک کی بیعت اُس کے ہاتھ پر کر رہی ہو۔ ہر بندش کی ہر سیلانی پر کیسا کیسا حبس چھٹتا، سیلابی پانی اپنے ہمراہ کتنی بھل کھینچ کر لاتے، اسماء کا گلا مزید پُرسوز ہو جاتا وہ حیران رہ جاتی بظاہر خوشگوار موسموں کے اندر کتنی گھٹن بھری ہوتی

ہے۔ بند بوتلوں کے کاک اُٹھتے گیس کی شدت بھاپ بن باہر نکلتی، جو پانی کے قطروں میں تحلیل ہو جاتی۔ مدینے کی گلیوں میں بھٹکنے اور کبھی واپس نہ پلٹنے کی سمندر سی خواہش میں کتنے موگھوں، ٹوبوں، ٹویوں کی حسرتیں اُتر جاتیں۔ لوچ اور گھمبیرتا اور بڑھتی، تپلی تپلی گلِ قدس کی پتیوں سے لبوں کی نزاکت پہ پوروں پر بوسے چٹاخ چٹاخ پڑتے مقدس پوریں آنکھوں سے چھوتیں، سراج المنیر کی لو میں بینائی دہکنے لگتی، کھلا کھلا مطلع، گہرا لاجوردی ہو جاتا، بھیگی بھیگی مٹی کی مہک سوندھی واشنا چھوڑتی، معتدل موسم خوشگوار ہو جاتا، رقت کھل کر باآواز ہو جاتی۔ مصروفیت تھی کہ دم لینے کی فرصت بھی نہ دیتی تھی۔

چنی نے نفیس ولائتی جوتے اپنے پلو سے رگڑ رگڑ صاف کیئے اور اُن سے بھی زیادہ نفیس پاؤں میں پہناتے ہوئے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''بی بی! کوٹھا نہ سہی، کوئی جھگی ہی چھت دے بادشاہ زادی! تیرے پاس کوٹھوں کی تھوڑ ہے بھلا۔''

معصومہ بی بی نے گردن گھمائے بغیر ڈیلوں کو حرکت دیئے بنا دیکھا۔ کوٹھوں، کوٹھریوں، محل ماڑیوں، کنگروں والی طویل فصیلوں، برجوں، محرابوں والی کشادہ چھتوں کا گھنا جنگل اُگا تھا جن کی چھدائی (کٹائی) کبھی نہ ہوئی تھی۔ دیواروں اور چھتوں کے اندھے گونگے جھنڈ کے جھنڈ جن کی ڈونگھی چھتناری چھاؤں، گھور اندھیارا کبھی کبھی تھوڑا سا سورج۔ ذرا سا آسمان کا قطعہ، تھوڑی سی ہوا اور اکا دُکا پرندے جھلملاتے پھڑ پھڑاتے۔

اس پختہ جنگل کے اُس پار پورا سورج، مکمل چاند، سارا آسمان، کل ہوائیں اور تمام پرندے، چنی کی ہتھیلی پر اُتر آتے اور نگاہ میں اس قدر بھر جاتے۔ جتنی کہ نگاہ کی استعداد۔ معصومہ بی بی جھیت جھیت درز درز جھانکتی بلبلا اُٹھی۔

''چنی چھت اوڑھ کے کیا کرے گی۔ پورا آسمان، ساری ہوائیں، مکمل سورج، پورا چاند سب

پر چھت کا پردہ ڈال دے گی کیا۔''

''نہ بی بی میں اسے لیپوں گی پوتوں گی۔ پر چھتی بناؤں گی برتن سجاؤں گی نیچے پیالہ اُوپر پرچ پیالی، بیچ میں گلاس پھر نہ سُورج جلائے نہ کہرا مارے، نہ آندھی جھکڑ میں گرے نہ مینہ کنی میں ٹپکے۔''

چنی جیسے کڑوی نیم کی میٹھی نمکولی، رَس بھرا ٹپکاؤ، سارا حلق مٹھاس سے تر ہو جائے۔ ون کی پکی ہوئی پیلوں، کچر کچر چرجاؤ۔ لیس ٹپکاتی لسوڑی گودے سے بھری، کنڈیاری پر سہج پکا ڈیلا (پھل) رَس بھرا میٹھا کھٹا۔

''یہ...... یہ دیکھیں، پچھلی آندھی میں پکھی کی ترنگل پسلی میں کھب گئی۔ خورے پسلی بچی کہ نہ بچی۔ نکل تھوڑی سکی تھی۔ نیچے شبیرا، اُوپر میں، جب تک جھکڑ تھا نہیں دَم اندر ہی اَندر گھٹتا رہا، رلیا شودا اُٹھائے، ہَوا پھر گرائے۔ ہَوا سے زور تھوڑی ہے۔''

لہو ٹپکاتے چہرے کی سنولاہٹ میں دَم بدم چھٹتی خوف کی لہریں۔

''اے چنی کیا بکتی ہے۔ تیرا گھر تو تیرے ساتھ ساتھ سفر میں ہے۔ جہاں جی چاہے چار کھونٹے ٹھونک اور تان لے گھر کو۔''

اُس کی ساس نے ہانک لگائی۔ دو چار بچ رہے بڑے بڑے دانت جن پر جمی زرد کریری کو دُھوپ نے چمک سے بھر دیا تھا۔ جیسے سونے کا خول چڑھا ہو۔ جگ مگ کرتا۔

چنی نے پھر کہا۔ ''بادشاہ زادی کو ٹھے کا سوال ہے۔''

''کیا بکتی ہے کھچری! تیرے لیے کیا یہ سب نیا ہے۔ یہیں جمی پلی نہیں تو......''

لمبے زرد دانت ہونٹوں سے باہر نکل جیسے ابھی نکوس ڈالیں گے۔

''تبھی تو کہتی ہوں یہ سب ڈاہڈا او کھا ہے۔''

''کوٹھے سے بڑھ کر تو پکھی سجائی ہے تو نے ایسے چمکے جیسے یہ پکا فرش، چھاج بیچنے بھی رلیے کو بھیجتی ہے۔ خود پردے دار پکھی میں بیٹھ اُسے لیپتی پوتی ہے۔ مشک نام کو نہیں بی بی! تو بھی جا بیٹھے تو تجھے بھی مشک نہ آئے۔ آپ بھی روز کھال میں ڈبکی لگاتی ہے۔''

''کبھی تم بھی ڈبکی لگا لیا کرو گندیو! بی بی مجھے تو کوٹھا دے۔''

ساری ہنستی ہنستی ایک دُوجی پر ڈھیر ہو گئیں جیسے یہ جملے نہ بولے ہوں ساری ہی جگتیں کہی

ہوں۔ چنی نے ہاتھ کی پشت سے ذراسی موم جیسی ناک بند کی۔ ''نری مشک۔''

بی بی معصومہ نے قلعہ بند خم کھاتی پکی ٹیپ والی اندھی گونگی فصیل کے بیچوں بیچ جھانکا، اندھی دھول کے خاکناب خیمے تنے تھے، جن کی طنابیں آسمان تک کھنچی تھیں اور چوبیں مٹی کے سینے میں دور تک گڑھی تھیں جن میں بھوت مخلوق دھول غسل لیتی تھی، آسمان سے برستے آتش فشانی لاوے، جن کے کانوں، پپوٹوں، پلکوں اور نتھنوں میں گھستے تھے اور جھلسی ہوئی جلد پر سفید دھبے پڑتے تھے۔ ریز جیوں پہ ٹھنسی چیتھڑوں کی گٹھڑیاں۔ چمڑے کی باریک کترنوں سے بندھے سنہری تیلیوں والے چھاج، چوبوں پر اُلٹے ننگے کالے بھجنگ دیگچے۔ جیسے گہراد بادبایا کوڑے کا ڈھیر تیز آندھی اور بارش نے مل کر اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہو اور چھپی ہوئی ساری غلاظتیں برہنہ پا برہنہ سر باہر نکل بیٹھی ہوں۔ معصومہ بی بی نے سامنے بیٹھے، ادوڑی کے اس ڈھیر کو دیکھا۔ جسموں پر جمی میل کی پپڑیاں اُنگلیوں سے مزور، مزور اُتارتی تھیں اور شلواروں کے پائنچوں سے جوئیں نکال نکال مارتی تھیں۔ ایڑیوں کی تھاپ زمین پر ڈرمٹ کی مانند برستی تھی اور تالیوں کی بازگشت دیواروں، فصیلوں اور چھتوں کے گھنے جنگل میں پلٹتی تھی۔

ٹوں جو چلیا نوکری میرا باہمنا
مینوں وی لے چل نال میرا باہمنا
ٹوں کریسیں نوکری میرا باہمنا
میں کڈیساں رومال میرا باہمنا
ہک نکا تیری نوکری میرا باہمنا
سو نکا رومال میرا باہمنا

''رلیا۔ اُو رلیا۔''

چنی نے پکھی کا کپڑا لیٹے لیٹے مٹھی میں پکڑ کے ہٹایا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔''

حلق سے ''میں'' کا لفظ یوں برآمد ہوا جیسے پوری کائنات کا اثبات بس اسی ''میں'' میں ہو۔

''ہائے مرجاواں سائیں آپ۔'' اُس نے پکھی کا کپڑا تر نگلوں پر اُلٹا دیا جیسے مٹھی میں بھرا چوگا اُچھال کر کبوتروں کے آگے پھینکا ہو۔

جس سہ شاخے کھونٹے سے چکنی مٹی سے لپے پیندوں والے دیگچے اوندھے منہ لٹکتے تھے۔ اُس کے پیچھے وہ کھڑا تھا۔

''رلیا کدھر ہے۔''

''رلیا مائی باپ تیرے کتوں کی سیوا میں لگا ہے۔ کہتا تھا آج رات کی ڈیوٹی وہیں صیب نے لگائی ہے، کل سانجھرے لے کو نکلنا ہے شکار کے واسطے۔''

''تیرے پاس اَب کون ہے۔''

''بس اکیلا شبیرا ہے سائیں وہ بھی سو گیا ہے۔''

سہہ شاخے کھونٹے کی تیسری شاخ سے ٹنگی لالٹین، پوچا پھرے دیگچوں کے تلوں پر سیاہی پھیر رہی تھی جن پر کالک ملتا ہوا دُھواں...... فضا میں بکھرتا تھا، جیسے گیلے پتوں کے بدن دُہکتے ہوں۔ چاروں اطراف پھیلے کھیت تاریکی کی اوک میں ہموار تھے۔ اوکاں جنڈ اور ون کے پیڑ جن کی ہری کونپلیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چر گئے تھے۔ اور کھو کھلے تنوں میں گلہریاں اور نیوَلے سوتے تھے۔ ریتلے میدانوں کی بھربھری مٹی میں انگوٹھے کے پیٹ جیسے خرگوشوں کے کھروں کے نشان (نقشِ پا) کندہ تھے اور جلی سڑی جھاڑیاں کنڈیاریاں خشک زمین کے سینے پر سَر رکھے اُونگھتی تھیں۔

وہ دھوتی کے لڑ اُٹھائے پکھی میں اُتر آیا۔

''پکھی تو گڈی کی طرح سجائی ہے تُو نے۔''

جھکے ہوئے کندھے چھت کی لکڑیوں سے مَس ہوتے تھے۔

''ہے تو پھر بھی پکھی ہی نا۔ کتنی بار مالکن کی منت کی کوئی کوٹھا چھت دو۔ پر مالک تو مالک ہیں۔ جی آئے تو بخششیں لکھیں ہزاریں۔ نہ آئے تو خسیس ہو جائیں۔''

شبیرا پھوں پھوں پیٹ کو بھنبھورنے لگا، چنی نے قمیص اُٹھا اندر ہی چھپا لیا۔

''چنی سارے اُونٹوں کی دھاریں تو اکیلی ہی لے لیتی ہے کیا۔''

''نہ سائیں! رلیا کچھ چھوڑے تو میں لوں۔''

''تو پھر سیڑوں (خرگوشوں) کی گردنوں کا لہو تو، تو ہی سارا چاٹتی ہوگی۔'' ''نہ سائیں! کراہت آوے قسم لے لو جو کبھی حرام ماس کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ بابا جندو سارا چٹ کر جائے۔''

''پکی لسوڑیوں کی رَس تو چاٹتی ہوگی۔''

''ہاں سائیں وہ میٹھی لگے۔''

''پر چنی تیرے پنڈے میں تو، سارے خرگوشوں کا لہو، ساری اُونٹنیوں کا دُودھ اور ساری لسوڑیوں کا رَس گھلے ہیں۔ باہر جو ڈچھروں کا ڈھیر پڑا ہے نا اس پر بھی جا بیٹھے تو وہ بھی نکھر جائے۔''

''پر سائیں باہر تو دیکھ، ہوا تیز ہے۔ ڈھول آسمان کو چڑھ گئی ہے۔ اگر جھکڑ جھل گیا تو باہر بھی نہ نکل سکوں، چاروں کھونٹے اُوپر ہی آن پڑیں گے۔''

ہوا کے تیز جھونکے نے ترنگلوں میں ٹھنسا کپڑا نکال کر ہموار کر دیا۔ پکھی کو جیسے کسی باہر لے (سوَر) نے ٹکر ماری ہو اور کھونٹے سے ٹنگی لالٹین بجھ گئی۔ ساری پکھیاں، بے جان پُرانی قبریں، اندھیرے نے نگل لیں جن کے مُردے نجانے کب کے گل سڑ چکے تھے۔

''پر چنی تُو نے تو مالکن سے کہا کبھی ہم سے کہا ہوتا۔''

مَل مازیوں کے گھنے جنگل میں بھٹکتی معصومہ بی بی تیز جھکڑوں میں ذرہ ذرہ چکتی ریت ہتھیلیوں پر چنتی تھی گنجان چھتوں سے بوند بوند گرتی ہوا سانسوں میں اٹکتی تھی۔ باہر ڈچھروں کے ڈھیروں سے پرے جانوروں کے کھونٹوں کے بیچوں بیچ گھومتے بگولے، کاغذ، چیتھڑے بلوتے تھے اور تیز ہوا کھونٹوں سے کسی، رسیوں سے بندھے خیموں کا کپڑا پھڑ پھڑاتی تھی۔ جیسے زخمی کونجیں لمبے پر مٹی میں دھنسائے تڑپتی ہوں لیکن اُڑان نہ بھر پاتی ہوں۔ سائیں نے کہا۔

''کل گوری مر گئی تھی اُس کا اصطبل خالی پڑا ہے چنی تو لیپ لے۔''

تیز جھکڑ پکھی کو مٹی میں ڈبوتے بھنبھیری کی مانند گھماتے رہے۔ کھونٹے پھسل کر زمین چھوڑ گئے اور خیمے کی ٹوکری چنی پر اُوندھا گئی۔

چنی نے کوٹھا لیپنا کیا شروع کیا۔ پوری بستی کی سرگرمی کا مرکز یہی ہو گیا۔ چکنی مٹی کے ٹوکرے سر پر ڈھو ڈھو کر پہاڑ جمع کر دیئے۔ گاؤں سے گوبر اور لید مانگ ڈھولی، پانی کے گھڑے بھر بھر لائی اور مٹی کی گھانی میں اُنڈیلے۔ رلیے نے پاؤں اور پنڈلیاں چلا چلا گھانی تیار کی، اُس نے ہاتھوں سے مٹی

گوندھ گوندھ آٹا سا ملائم کر دی۔ چنی کے چہرے کی ساری ملائمت، جس میں اُونٹوں کے دُودھ کی دھاریں۔ خرگوشوں کا تازہ لہو اور لسوڑیوں کا گودا آمیز تھا۔ مٹی میں رَل مل گیا۔ پرچھتی کے کنگرے بنوانے کے لیے گاؤں کی جلیوں اور گجریوں کے کتنے ترلے منتیں ڈالیں۔ منوں اُناج صاف کر کے دیا، سیروں مرچیں پیسیں اور اُن سے محرابوں والی پرچھتی بنوائی جس کی جھالر میں دو، دو دِل لٹکتے تھے جو اُوپر سے ایک ہی شاخ ایک ہی رَگ سے جڑے تھے جیسے اُبھی ایک ساتھ دھڑک پڑیں گے۔

جس روز کوٹھا تیار ہوا سارے قبیلے اور گاؤں بھر کی عورتیں اُسے دیکھنے آئیں اور چنی کے چہرے پر پھیلی رعونت دیکھ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ جونہا دھو صاف ستھرا کھیس بچھا چارپائی پر رانی بن بیٹھی تھی۔

''دُھت درے گندے پیر جھاڑ جھنکار کے اُندر گھسو۔ یہ پکھی نہیں کوٹھا ہے۔''

شریکنیو نے بولیاں ماریں۔

''چنی یہ کوٹھا ہے کہ میت (مسجد)۔''

''بیائیاں پھٹی دُھول بھری ایڑیاں دہلیز پر زور زور ماریں جیسے چھینے کی تھاپ دیتی ہوں۔''

''تمہیں کچیانیو کو کیا پتہ کوٹھا میت ہی ہوتا ہے۔''

جھاڑو پکڑ دہلیز پر چھنڈ چھنڈ مارا۔

''کوٹھی (دل) تو میت سنی ہے۔ کیوں بھئی دھک رَب رَب جپے ہے۔ کوٹھا تو بھاں بھاں کرے ہے۔ میت کیونکر ہوا۔''

''مراثنیو تمہیں کبھی جڑا ہو تو پتہ ہوتا۔ گندی، مشک والیو اُندر پیر نہ رکھنا، دیکھو تو مٹی گوبے سے بھرے ہوئے۔ جو ویں تمہاری دھوتیوں پہ چلتی ہیں۔ میرا کوٹھا نہ ترکاؤ جاؤ پکھیوں میں جا بیٹھو۔''

طاق کو دھڑ سے بھیڑ دیا۔ شریکدیاں بند کواڑ پر ہنسی اور فقروں کی دستکیں تا دیر دیتی رہیں۔

رات نہایا دھویا رلیا جلد ہی خراٹے لینے لگا۔ شبیرا بھی اُس کی بغل سے چمٹا گہرے گہرے سانس کھینچتا تھا اور اُس کی نظر پرچھتی کے برتنوں پر تھی۔ لو ہا پلاسٹک چن چن یہ کانچ کے برتن بدلے میں وٹائے تھے اور جستی ٹرنک میں کپڑوں کی تہوں میں لپیٹ لپیٹ رکھے کتنے دَھکے کھائے کبھی لیے کبھی ریاست کبھی تھلوں میں پر کسی کی کنی بھی نہ بھری، آج یہ برتن کیسے لشک پشک رہے ہیں۔ سب کچھ اُجا

اُجلا نکھرا نکھرا چنی کے چہرے جیسا۔ کڑوی نیم کی گودا بھری میٹھی نمکولی۔

اُس نے پکھی کا خیال کیا جس کے آدھے حصے پر سُورج سدا، دَندناتا پھرتا ہے چارپائی اُٹھا کبھی پورب میں بچھاؤ کبھی پچھم میں، اور چاند تو سارے کا سارا اَندر ہی چلا آتا ہے جیسے کنویں کی اوک میں گھس آیا ہو۔ سوآنکھوں پر کپڑا ڈالو نیند اُچک کر ہی لے جاتا ہے لیکن یہاں تو بھورا بھی نہ گھسے، نہ کوئی درز نہ کوئی موری نہ کوئی کھڑکی، روشندان، ایک ذرا سا دروازہ وہ بھی بند، ہَوا بھی پر نہ مارے اُسے یکدم لگا اُس کے سانسوں میں ہوا بتدریج کم ہو رہی ہے اور شبیرے کے سینے میں گھسر گھسر کی آواز تیز ہوگئی ہے اور کوٹھے کی چھت خمیدہ ہو نیچے جھک رہی ہے۔ اَندر تو پتہ ہی نہ چلے کہ باہر جھکڑ ہے کہ بارش...... کسی خطرے کا علم ہی نہ ہو سکے اور اگر یہ کڑیوں اور شہتیروں والی چھت دھڑام سے نیچے آن پڑے تو......

''رلیا رلیا! اُٹھ چھت گر رہی ہے۔'' اُس کی ہانک کے ہمراہ ساری پکھیاں ہڑ بڑا کر باہر اُبل پڑیں۔

رَلیا بیٹھے بنا لیٹے لیٹے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شبیرے کو اُٹھا، رَلیے کا بازو کھینچتی دیواروں دروازوں سے ٹکراتی باہر نکل بھاگی۔ دَھک دَھک دلوں کے ساتھ کچھ دیر وہ کوٹھے کے گرنے کے منتظر رہے۔ پھر رَلیے نے خفت بھرا قہقہہ لگایا۔

''اری کملی یہ کوئی پکھی ہے جو ہمارے اُوپر آن پڑے گی۔ یہ تو پکی اینٹوں اور کڑیوں والی چھت ہے۔'' رَلیے نے کوٹھے کی سمت قدم بڑھایا۔

''نہ رلیا نہ۔'' وہ یوں چیخی جیسے یکبارگی ہاتھ کابلی بھڑ کے چھتے میں پڑ گیا ہو۔

رَلیا دس قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''رلیا! پکھی تو ہم پر روز گرتی ہے پر نہ کہیں چوٹ آوے نہ ہڈی ٹوٹے۔''

پر رلیا! اگر یہ شہتیریوں اور کڑیوں والی چھت ڈھ گئی تو پھر...... نہ رَلیا۔ نہ...... چھت وہی اچھی جو گرے بھی تو چوٹ نہ مارے۔''

چند گز کے فاصلے پر ساری پکھیاں ہَوا کی مٹھی میں پھڑ پھڑا رہی تھیں جیسے کاغذ کی بھمیریاں۔

ساگوان کی مہک چھوڑتا منقش دِلوں والا دروازہ چرر کر کے کھلا۔ سائیں نے پوچھوایا تھا۔

چنی کیوں چیختی ہے اور جواب واپس جانے سے پہلے ہی ریشم کا گٹھا سرسراتا ہوا باہر پھسلا اور

پکھیوں کی ڈھیریوں کے پیچھے سے جھکر کی طرح چڑھ کر جھلا،

''رلیے! کیا ھنیر (آندھی) گھلا ہے۔''

''جی سائیں! ملاحظہ ہو آسمان رتالال ہے۔ ڈکھن آلے پاسے ڈاڈا ھنیر گھلا ہے۔''

''ہاں وڈا ھنیر تیری ماں اور زال (بیوی) کو اُڑا لے گیا ہوگا۔''

سائیں نے ساکت کھڑی کیکری کو ٹھڈ مارا۔ رلیے نے کیکری کے تنے کو جھپا ڈال لیا جیسے گرنے سے بچا رہا ہو۔

''نہ سائیں ھنیر کہاں پتہ بھی نہ ہلے۔ ککھ بھی نہ اُڑے...... نرا وٹ (گرمی)......''

''تو پھر پکھیوں میں مینہ کی تراڑیں پڑتی ہوں گی۔''

''جی سائیں کن من ہوئے پر ابھی پکھیوں کا کپڑا گف نہیں ہوا۔''

''تیری زال پکھی کے گڑھے میں ڈبکیاں کھاتی ہوگی ذرا دیکھوں۔''

''نہ سائیں اس بار برنگ میں مینہ کنی کا کیا کام نرا ہسٹر (حبس)...... بھن گیا سارا بار۔''

''تو پھر یہ رولا رپا کیا ہے۔''

''اُو سائیں! چنی ڈرتی ہے کوٹھے کی چھت گر نہ جائے۔''

انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی کے بیچ کئی چنٹ بھر کر سائیں نے ران پر سے لنگی کو یوں اُٹھایا جیسے تالاب پاٹتا ہو۔

''چنی''

کوٹھے سے نکلتا دبدبہ پُرانے ڈیچروں کے ڈھیر پر چڑھ دھاڑا، شکاری کُتے مالک کی آواز پہچان زنجیر تڑوانے اور لعاب ٹپکاتی زبانیں لہرانے لگے۔

''سائیں......چنی......''

پکھیوں کی گول چپٹی پنڈ پر ہنسی کا گولا پھٹا اور پھس ہو گیا۔

چنی کا چہرہ کوٹھے کے دروازے سے اندر لٹکا، شرنبہ کی ٹہنی سی جھکی گردن پر کھلا پھول جیسے خود کو سونگھنے کو پیش کرتا ہو۔

سائیں نے انگوٹھے اور اُنگلی میں گال جکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ کھسکتی ہوئی دہلیز الانگ آئی۔

''گدھی! کدھر گر رہی ہے چھت، نیند خراب کردی۔ حرامڑ!''

''سائیں گر نہیں رہی تو گر تو سکتی ہے نا۔ اگر گر گئی تو......''

''تو تُو مرنے والی نہیں ایسی نازک اشناک، کچیا نن نہ ہوئی ملکہ نُور جہاں ہوئی سنیاسن......''

''نہ سائیں! نُور جہاں ہوتی تو پکھی میں تھوڑی ہوتی ریڈوے میں بولتی۔''

سائیں کے قہقہے کے جواب میں پکھیوں سے زنانہ مردانہ طنزیہ ہنکارا، اُبھرا۔

''ہوں آں ہوں اں'' اور جوابا کہتے یغ کُغ بھونکے اور گیلی جیبوں سے رالیں ٹپکائیں۔''

نہ سائیں یہ پکھی تھوڑی ہے کہ روز گرے اور کپڑے جھاڑ کر اُٹھ جاؤں، پکی شہتیری سَر پہ بجے تو کون بچے۔''

''پر سَر ہی کیوں بجے...... سَر سے اچھی جگہیں موجود ہیں بجنے کو......''

''چھوڑ سائیں! مخول کرتے ہو آپ......''

''گدھی، سوَرنی، چنگڑی......''

رلیا پُرانی ہڈیوں اور ڈھچروں کے ڈھیر پر بیٹھا اندازے لگا رہا تھا۔ یہ بھینس کی کھوپڑی ہے۔ لمبے زرد دانتوں والی، جن پر نسواری دھاریاں اور دھبے کھدے ہیں، گدھے کی پسلیوں کا پنجرہ جیسے پکھی کی چھت کے سُرمئی ترنگلوں کا جال، یہ بیل کا ثابت ڈھانچہ جس کے چتکبرے کھروں میں ابھی زرخیز مٹی بھری تھی، بیچ بیچ میں شبیرا روں روں کر دیتا، پر چنی ویلی (فارغ) ہو کے آئے تو اُسے دُودھ پلائے۔ باسو کی رانڈ اپنے نو بچوں کو سُلا اندھیرے میں لپٹی آئی۔ رلیے کو پتہ اُس وقت چلا جب بجھتی ہوئی آگ پر اُس نے رُگ بھر (مٹھی بھر) کر ککھ پھینکے، اور اندھیرے کی آنکھیں چندھیا گئیں، رلیا پنجروں کی گنتی ساری گڑ بڑا گیا۔ باسو کی رانڈ نے الاؤ پر دونوں بازو پھیلا دیئے۔

''رلیا اگر تو مرد نہ ہوتا تو پھر کنجری ہوتا۔'' دیکھ آگ کی لاٹ میں پنی کی طرح بھخ رہا ہے۔''

''ہٹ حرامڑ خنزیر کی بچی! تُو آپ جو کنجری ہے۔''

''ہاں نا، کنجری والا تال دکھانے ہی تو آئی ہوں۔ بول جھومر ڈالوں، چینا کہ سمی، کہ......''

رلیا آگ کی حدت میں تمتما گیا۔

''چنی ویلی (فارغ) ہو کے نہیں آئی ابھی۔''

ہونٹوں کی کلیاں رلیے کے کان کی لو پہ کھلیں۔ رلیے نے ہاتھ کونفی میں جھٹک دیا اور جلتا ہوا انگارہ پوروں سے اُٹھا کر چلم میں رکھا۔ تمباکو کا سلفہ دھوئیں کی لکیر بنا کر اُسے پھیلا گیا۔ باسو کی رانڈ نے حقے کا پیندا گڑگڑا کر نئے چھوڑ دی۔

نذرو بلتوئی پکڑے اُونٹنی کی پشت پہ کھڑا تھا اور ریشماں ذرا ذرا تھنوں پہ انگوٹھے کا دباؤ دے دے دھاریں نچوڑتی رہیں۔ بلتوئی میں دھار کی آواز ایسے پڑتی جیسے پکھی کے گف کپڑے پہ بارش کی بوچھاڑ۔

چنی ویلی ہو کر باہر نکلی تو باسو کا چھوٹا رورو ساری پکھیوں میں گھس رہا تھا اور پکھیوں کی آوازیں اندھیرے میں چھید کرتی تھیں۔

''باسو کی رانڈ آ، بال کو سانبھ (سنبھال)''

اندھیرے کا گولا ڈچھروں کے ڈھیر پر چڑھ بیٹھا تھا۔ شکاری کُتے مالک کی بُو سونگھ زنجیر تڑواتے اور گیلی زبانیں گھماتے تھے۔ بجھے الاؤ میں چنی کا پَیر پڑ گیا۔ ننھی ننھی چنگاریاں سرر رکر کے بجھ گئیں اور باسو کی رانڈ پکھی کی سرکی اُٹھا، باہر نکلتی ہوئی چنی سے ٹکرا گئی دونوں ماؤں نے روتے ہوئے بھوکے بچوں کو تھنوں پر ڈالا اور بچے اور مائیں سو گئے۔

پکھی کے گف کپڑے میں سُورج ترچھے ترمرے بناتا، راکھ سے بھرے گڑھے میں اُتر آیا تھا اور منجی (دھان) کی پرال کے سنہرے ریشے دہکتے تھے۔

''پکھی واس کا کیا راتوں رات اُچل جائیں سویرے بھا اُڑتی ملے۔''

''تین ہزار کا قرضہ ہے، لے کر اُچل (فرار) جاؤں کہاں؟ کچے میں، ملے میں کہ تھلوں میں ہر تھاں اُس کے کُتے بلے پھرتے ہیں۔''

رلیا مُردہ بکری کے کٹے ہوئے کھروں سے کھال کے اندر مُنہ سے ہَوا بھرنے لگا اور بکری کی کھال غبارے کی طرح گوشت چھوڑ کر پھول گئی، چنی خشک چمڑے کی کترن سے زگ زیگ بناتی چھاج کی تیلیاں جوڑتی اور گرہیں لگاتی چلی گئی۔

''تین ہزار کا قرضہ اور تین سالوں سے وٹا رہا ہے وہ، اَک (عاجز) گئی ہوں میں، میرا پنڈا کوئی پُرانے ٹین کا ڈبہ نہیں جسے تو کچرے سے اُٹھا لایا ہے۔''

''کیا کہتی ہے چنی۔''

بوڑھی سرو نے زرد کر یری جسے دانتوں میں گال دھنسا کر اور زور لگا کر دھواں اور سنے دونوں باہر اُگلے۔

''ماں وڈی! کہتی ہے سائیں کے پاس نہ جائے گی۔''

''دھت حرامزِ، کوٹھا کیوں چھتا تھا، جس کی تھاں وہ کیسے نہ آئے وہاں۔''

''وہ آئے شالا وہیں رہے پر میں کیوں جاؤں دو دو مرد رکھوں۔''

چلم سے اُٹھتا دھواں پکھی کی چھت کی پھانٹوں پہ لہرانے لگا، جہاں سانپ والی پٹاری لٹکتی تھی۔

''دادا جندو سانپوں کو مٹی چٹوانی ہے؟ آج تماشے کے لیے جاتا ہے کہ ابھی سُرت (ہوش) نہیں پھری۔''

چنی تمباکو کی کڑواہٹ میں کھانسی،

''کیہڑی (کون) پاک مریم ہے جو ایک پر بیٹھی ہے۔ دو نہ رکھیں تو لون مرچ کہاں سے لائیں تیل صابون کہاں جُڑے۔''

''ماں وڈی گا چنی ہے تھوڑی گھنی۔''

بھلونکی نے پکھی میں جھک کر جھاڑ جھنکار سر اندر ڈالا۔

ماں وڈی نے کھیسہ ٹٹولتے ہوئے ملتانی مٹی کی ڈلی باہر نکالی اور انگوٹھے اور اُنگلی کی پور سے ذرا سا کنارا بھورا بھلو کی ہتھیلی پر رکھا اُنگلی مُنہ میں چوسی۔

''ماں وڈی بھنوائی ہے۔''

بھلو نے چکنی مٹی کا ذرا داڑھ تلے دبایا۔

''ہاں تا چلی آنے کی دے کے کل ہی بھٹی سے بھنوائی ہے......''

''لے چنی تو بھی چکھ۔''

ماں وڈی نے ذرا سا سرا اور توڑا اور ہتھیلی چنی کی سمت بڑھائی۔ چنی نے مٹی اُٹھا کر زبان پر رکھ لی۔

''اری کملی تُو تو بھاگوان ہے۔ تیرا عاشق تو پنڈ کا مالک ہے۔''

''ری مورکھ! رُوپ تو سجرا پھول دو گھڑی کوئی مشک لے تو کیا، کملا تو جانا ہی ہے اسے جو شئے پاس رہنی ہی نہیں اُسے کیوں بچا سنبھال رکھیں۔ کھلر نے دے نا اس کا مشک، جوبن تو جوگی والا پھیرا۔ اس کا کیا گمان کرنا......''

بھلو نے مٹی والی ہتھیلی چاٹی۔

''ہاں ماں وڈی چاند چڑھے تو چاندنی کسی ایک کی تھوڑی ہوئے آگ بلے (جلے) تو سینک کسی ایک کو تھوڑا آوے۔ شرینہہ کھڑ جائیں تو مشک شرینہہ والے بوہے کی تھوڑی رہے۔ سارے جگ میں کھلر جائے۔ جب شئے ہی کھلر نے، مکنے والی ہے تو پھرا سے ونا (تبدیل) ہی کیوں نہ لیں۔ کوئی تو گاچنی کھلانے والا ہو۔''

بھلو نکی نے گاچنی کا آخری ذرہ داڑھ تلے پیسا اور بھوکی نگاہوں سے ماں وڈی کے کھیسے کو تاکا۔

''نہ ری بس گاچنی ہی کیوں اتنے بڑے بڑے آم تے سیب، نی چنی وہ سُوٹ تو دکھا جو کل تجھے چڑھا۔''

''بھا لگے اُسے، نہ چاہیے مجھے آم تے سیب اُسے چاہئیں گو گے۔ ساوی پینگ کو، پتے اگانے کو......کوڈیاں کھیلنے کو......''

اُس نے پرالی کی مٹھ بھر کے رلیے کی طرف اُچھالی۔

''اور یہ سُوٹ بڈھیے تُو پہن تجھ پر لال جوڑا، ڈاہڈا سجے۔'' اُس نے ترنگل سے سُوٹ نکال بڑھیا پر پھینکا۔

''نہ اللہ تجھے نصیب کرے چنی! تُو نیا پہنے اور میں تیرا اُترا ہوا پہنوں، کتنی ہیں جنہیں نیا جوڑا ہے، تو تو کرماں والی ہے چنی ایک ادھرانا نہیں ہوا کہ نیا مل گیا۔ قبیلے والیو! آؤنی دیکھو چنی کو نیا جوڑا چڑھا ہے۔''

قبیلے والیاں چھاجوں کی تیلیاں اور بھمبیریوں کے کاغذ رنگتی اُنہیں باندھتی اُڑنگتی بھاگیں اور جوڑے کو اُنگلیوں میں مسل مسل دیکھنے لگیں۔

''چنی ہے ہی گوڑھے دی پونی کس کا جی نہ چاہے کتنے کو۔''

ریشماں نے جہاج کی مٹھ پر سیاہ کترن کس کر باندھی اور رنگے ہوئے پَروں کا پھندنا اُڑسا۔

''ہائے شوہدی ریشماں کتنے دیہاڑے میائیں دی بانگ ویلے (اذان کے وقت) صدا پڑتی اور میائیں دی بانگ ویلے ای کوٹھے سے ویلی ہو کے نکلتی۔''

خم دار پھانسوں کے جال میں سے اُترتی دھوپ میں بیٹھی عورتیں ایک دوسری کی جٹاؤں سے لیکھیں چنتی تھیں۔ اُن ڈھلے بال اور بدن دھوپ میں میل پگھلاتے پُرانے کپڑے جیسی بساند مارتے تھے۔

خم دار پھانسوں کے ننگے بدن سے اُترے کپڑے پر چنی مزید کپڑوں کی تہیں جوڑ جوڑ اُنہیں گف بناتی تھی جسے خیمے کی عریاں ہوتی لکڑیوں کو ڈھکنا تھا اور سردیوں کی یخ بارش کو اپنے اندر سموتا تھا۔

''کتنے دیہاڑے ریشماں کی یو بارہ رہیں گھونگھٹ چھے جوڑے چڑھے ہوں گے۔''

تمو نکلتی ہوئی پرالی کی تہوں میں سے پکے روڑ گیٹے ڈھونڈنے اور چبانے لگی۔

''نہ کھچری تو بھی نہ ''سک'' (ترس) اَب تیری باری ہے دن لگ گئے ہیں تجھے...... جوانی کے مٹی روڑ چبانے کے دن گئے، گا چنی سے کھیسہ بھرا رہے گا۔ تیرا...... ہر ویلے (وقت)......''

''گوڑ ھے میں سے بوٹی کی پونی چھپنے کہ چھپنے وہ تو چرخہ ڈاہے بیٹھا ہے۔''

''نہ اسے جوڑے کیوں نہ چڑھیں۔ میری تمو، چنی سے گھٹ ہے کیا۔ لوی تلے ملوک (تر و تازہ)، سرسوں کی گندل، بل دے کے گرہ لگا دو۔''

تمو کی ماں نے بھمیری کے سینے میں کانٹا چبھو تیلی میں گاڑا اور ہوا کے رُخ پر سیدھا کر دیا۔

''معصومہ بی بی سے وہ ملوک (بڑھ نازک) ہے کیا، جو رات اکیلی محل ماڑیوں کو چھپے مار روتی ہے، اور بندہ سہروں (خرگوشوں) کی رت نمکولیوں کا گودا اور لسوڑیوں کی لیس چاٹتا پھرتا ہے۔''

جوان عورتیں اوڑھنیوں کا پلو مُنہ میں داب گلا گھونٹ کر ہنسیں جیسے ایک ہی ہاتھ نے ساریوں کو گدگدی کر دی ہو۔ چنی نے ڈھتے ہوئے چولہے سے پک پک کھرنڈ ہوئی مٹی کا بھورا توڑ کر مُنہ میں رکھا اور ماں وڈی کے ہاتھ سے اُچک کر حقے کی نے اپنی سمت موڑی، ڈھیلا ڈھالا کرتا سینے کی چھلک سے دودھ میں سن گیا۔ پیر کا انگوٹھا چوستے ہوئے پرال میں دھنسے شبیرے کو بازو سے پکڑ کر بے دردی سے گود میں ڈالا۔

''مجھے تو معصومہ بی بی پر ترس آوے۔''

''تمو نے اوس میں بھیگ بھیگ بوجھل ہوئی نرمے کی گڈی (کپاس کا پھول) سے گال میں انگلی چبھوئی۔''

''نہ وہ بھوکی ننگی بیٹھی ہے جو تجھے ترس آوے، کھانے کو ڈھیر پہننے کو ون پونا (رنگ برنگا). نہانے دھونے کے سوا کام ہی کیا، کیا نہیں ہے اُس کے پاس جو مرد دیوے، مرد کی لوڑ (ضرورت) ہی کیا اُسے، ہم شودیاں (بیچاریاں) ، اپنے مرد نکھٹو، دوسروں کے مرد کسیں، ایک بار دیویں سو بار روناں ئیں۔''

ماں وڈی نے سگریٹ کی پنی میں لپٹی سیاہ گولی میں سے باجرے کے دانے جتنی بھور بھور ساریوں میں حشیش بانٹی، چنی نے بڑھیا کے بازو کے قریب تھوکا۔

''نہ کھاؤں حرام شئے۔ نہ چاہیے مجھے مرد، نہ اپنا نہ پرایا آپ کماؤ ہوں۔ چھاج باندھوں تو تیلیاں گنی نہ جائیں۔ بھمبیریاں بناؤں تو ہوا سے جیتیں چوڑیاں چڑھاؤں تو باہوں کی ہڈیاں توڑ چھلے چڑھا جاؤں۔''

''نہ چاہیے تھا تجھے مرد تو پھر کوٹھے کے لیے کیوں مری جاتی تھی۔''

بھاو نے چوڑیوں کے ٹوکرے میں رنگ برنگ گچھوں پر ہاتھ پھیر پھیر انہیں ہموار کیا اور میل خوری چادر سے ڈھک کر بڑبڑائی۔

''گھونگھٹ آدھا گچھا ٹوٹا نکلا، کیا پتہ حرامی مانے کہ نہ مانے کتنا اُدھار پلے ڈالے۔''

پرال اٹی پکھی کے گڑھے میں بیٹھی ساری عورتوں کے گھٹنوں پر چنی کی پکھی کا کپڑا اچھا تھا جس کے ساری ہی کھندوئیوں سے توپے بھر رہی تھیں۔

''کوٹھے میں رہنا چاہتی تھی اپنے مرد کے ساتھ دوسروں کے مردوں کے ساتھ نہیں پر اپنا مرد تو نامرد ہے بے غیرت۔''

چنی کے گال کی گڈی میں بھرا شبنم سوکھنے لگا اور حلق چرا گیا

مردہ ڈھور کی کھال کی باریک کترنیں کاٹتے ہوئے رلیے نے رمبی پر پورے ہاتھ کا زور دیا۔

''سن رہی ہے ماں وڈی! سن رہی ہے کاٹ کے رکھ دوں اس کی لمبی جیب۔''

''اُس نے رمبی والا بازو چنی کی سمت لہرایا۔''

''رلیے! تو جیب کاٹ ڈالے گا تو پھر وہ کیا پُو سے گا اور پھر تیرا قرضہ...... یہ ساوی کے چسکے...... تے کوڈیاں......''

رلیا سائیں کے پالتو باز کو ہاتھ پے چڑھے کھوپے پر بیٹھا اُس کی سنہری زنجیر ہلانے لگا، بلیا سائیں کے کالے تیتروں کو ہتھیلی پر سے مکھن کی گولیاں چُنا تا تھا۔ باسو، قاسو اور نذر وشکاری کتوں کی لمبی ٹانگیں مالش کر کے بجلی کے ٹوندے جیسی سبک بنا چکے تھے۔

چولہوں کے گرد بیٹھی عورتیں دھوئیں کی کڑواہٹ میں کھانستیں اور ڈھیلے، چھڑیاں، ٹانڈے، بوریاں اُٹھا اُٹھا بچوں کے حیوانی ریوڑ پر اُچھالنے لگتیں۔

''خنزیر کی اولا دو۔ حرامیو جاؤ خیر ین کر لاؤ۔ نہیں تو بھو کے مرو شالا۔ میائیں کی بانگ کے ساتھ جنازے اُٹھیں تمہارے جب کوٹھے سے چنی کی صدا پڑے اُس وقت تمہاری گوریں کھدیں کبھی نہ جوانی چڑھو۔ حرامیو...... خنزیرو۔''

اور پھر چنی کی آواز سے آواز ملانے لگیں، گیت کا سوز بار کی وُسعتوں میں جھلتے جھکڑوں میں گھل گیا۔

چلیں اُو میرے نال سوہنی اوڈنی
جاواں نہ تیرے نال بھولا بادشاہ
تینوں تاں دیساں ہار تے مالے
چلیں او میرے نال سوہنی اوڈنی
بھٹ گھتاں تیرے ہار تے مالے
جاواں نہ تیرے نال بھولا بادشاہ
تینوں تے دیساں اُونٹ تے گھوڑے
چلیں او میرے نال سوہنی اوڈنی
بھٹ گھتاں تیرے اُونٹ تے گھوڑے
جاواں نہ تیرے نال سوہنا بادشاہ

سامنے ٹیلے ٹبوں، روز بھکرے، آک کنڈیاریوں، لئے دھتورے میں برف کے گالوں جیسے

خرگوشوں پر آسمانی بجلی کے کوندے شکاری کتے لپکتے تھے، لہو ٹپکاتی مُردہ گردنوں پر رلیا وحشیانہ رمبی چلانے لگا۔

''حلال ہوگئے، سیٹر حلال ہوگئے، سائیں جی سیٹر حلال ہوگئے۔''

ڈھول کے سیلاب اُونچی فصیلوں کے بند توڑ گئے۔ مُردہ خرگوشوں کے گرم جسموں سے کھال ادھڑنے لگی، باریک باریک انتڑیوں، اوجھریوں، کلیجوں کے ڈھیر لگے تھے جنہیں بچے کچا چباتے تھے اور بابا جندوں بہتا ہوا لہو لمبا پڑ پڑ جاتا تھا۔ سلاخوں پہ چڑھے الاؤ پہ دہکتے خرگوشوں کی مہک حویلی کی اُونچی فصیلوں کو پاٹ گئی۔ معصومہ بی بی پچھواڑے کا پٹ کھولے لمبے لمبے سانس کھینچتی تھی۔ تیل ٹپکاتے بھن بھن لال ہوئے خرگوشوں کے پٹوں میں سائیں دانت نکوستا تھا، نرم نرم بوٹیاں نوچ باقی حصے اِدھر اُدھر بکھیرتا پھینکتا، جن پر پکھی واس اور بھوکے کتے جھپٹتے تھے اور ہڈیاں چچوڑتے تھے۔ سائیں لمبا ڈکار لے کر اُٹھا اور پچھواڑے کی کھڑکی کھڑک کر کے بند ہوئی۔ سائیں نے پکار کر کہا۔

''اوئے رلیے! سارے کام چھوڑ پہلے کھڑکیوں کے باہر چرنا لگا کر کیل ٹھونک دے۔ مٹی گھنا اُندر جاتا ہے...... اُندر حویلی میں......''

معصومہ بی بی سیل بند کھڑکی سے پشت ٹکائے لرزتی تھی جس پر بجتا ہوا ہتھوڑا ایک ایک کیل لکڑی کے سینے میں اُتارتا تھا۔ باریک باریک ریشے چھدتے تھے۔ ٹھک ٹھک، ٹھک ٹھک ٹھونکنے والا ہاتھ رلیے کا تھا، مضبوط اور وحشی ہاتھ نس نس لُوں لُوں میں پڑتی ہوئی دھمک، سخت کھردری اور وحشیانہ، یہ سارے کتے بلے، یہ نوکر بردے، سارے خصی جانور مرد کب سے ہوگئے۔ ان کے ہاتھوں میں زور آ گیا اور یہ جھکے ہوئے اوندھے موندھے وجود کھڑے ہونے لگے، مُردہ خرگوش اور سانے گل گل جھڑتے تھے آگ کے لانبوں پر پک پک تیل چھوڑتے تھے اور گوشت گلتے تھے اور کھانے والے انہیں نگلتے اُگلتے تھے۔ چنی سارا وقت سرکنڈوں کو ایک دوجے سے باندھ باندھ، سر کی بناتی رہی تھی پکھی کا ننگا مُنہ رات کی ٹھنڈ سے ڈھکنے کے لیے جب رلیے نے ہاتھ بڑھا کر کولہے میں چٹکی بھری۔

''ابھی وہ ہلکا پڑ جائے گا، آج میں نے بھی سالم سانا بھون کے کھایا ہے۔''

''نہ تُو میرا لگتا کیا ہے۔ رَن تو میں اُس کی ہوں جو سُوٹ چڑھاتا ہے مجھے، قرضہ دیتا ہے تجھے، اُس نے بھی حرام سیٹر کھایا ہے۔ جا ساوی پی کے گلوکی زال کے پاس جا، اُڈیک میں بیٹھی ہوگی ساوا بانا کر

کے، اُسے بھی خبر لگ گئی ہے تُو نے سالم سانا کھایا ہے۔''

چنی سرکنڈوں کو جوڑتی سَر کے پاندوں سے گرہیں لگاتی چلی گئی۔ سر کی کے بندھے ہوئے حصے پر اکڑوں بیٹھی ان بندھے سرکنڈوں کو جوڑتی ہوئی۔

'تیری ہڈیاں بڑے دنوں سے نہیں کڑکیں نا۔''

رلیے نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ کھڑا کر کے چھت کی تڑنگل سے شہتوت کی چھمک کھینچ لی۔

''میں دیکھتا ہوں تو اپنے بندے کو کیسے ناں کرتی ہے، گدھی حرامزا! تجھے پتہ ہے خاوند کو نہ کرنا کتنا گناہ ہے۔ اللہ سائیں کیسا ٹھک کے ناراض ہوتا ہے۔''

''اے ہے اے اللہ سائیں کہ بندہ سائیں۔''

شہتوت کی پتلی چھمک سرر سرر پھن کی طرح لہرائی۔ چنی نے سَر پر دونوں ہاتھوں کا چھاتا تان لیا۔ چچوری ہوئی ہڈیوں کو نوچتے آوارہ کتوں کے غول کی چخ پخ سے ہوکر صدا ابھری۔ ''چنی''

چنی یوں اُٹھی جیسے چوڑیوں والی کلائی جھٹکا کھا کر سیدھی ہوئی ہو اور رلیے کے ہاتھ سے چھمک چھٹ گئی جس سانپ کا سَر کچلنے کو اُٹھائی ہو جیسے اُسی نے ڈس لیا ہو۔ مالک کی آواز پہچان کر کُتے بھونکتے تھے اور چنی کی ہنسی اندھیرے کی جھریوں سے ذرا ذرا بہہ رہی تھی۔ رلیا شہتوت کی چھمک سامنے رکھ کر ڈیچروں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ کب چنی ویلی ہو کر آئے۔ پہلے تو وہ اُسے جی بھر کر پیٹے جب چھمک تین نوٹے ہو جائے تو پھر..... اُس کی نگاہ میں حویلی کا پچھلا دروازہ تھا جس سے ساگوان کا مشک چھنتا تھا اور جس کے کھلے پٹوں میں تاریکی کا غبار بھرا تھا جس کے بیچوں بیچ لمبے قد کا سایہ متحرک ہوا تھا، سائیں کے کُتے بلے ہوں گے، ہرو یلے تو پہرے پر رہتے ہیں۔ سیاہ چادر میں لپٹا سایہ ڈیچروں کے ڈھیر پر تر چھا ہو کر پڑتا تھا۔ پکھیوں کی قبریں ڈھول کے سینے میں دھنسی تھیں جہاں عورتیں اور مرد اپنے اپنے مرد اور عورتیں ادل بدل کر سوئے تھے۔ باسو کی رانڈ اپنے سسر کی پکھی میں تھی اور کینوا اپنے دیور کی جھگی میں اور والو اپنی ہی بیٹی کی پکھی میں انگڑائیاں توڑتا تھا۔ آج سب نے حرام سیڑ اور سانے ادھ کچرے نگلے تھے اور ہڈیوں کا گُو دا چُو سا تھا اور ساوی کا گھٹ لگایا تھا۔

''چنی کدھر ہے۔''

بولنے والی بھی عورت تھی جس کا مرد عورت بدل کر سویا تھا اور خود اُسے کسی دوسرے مرد سے

بولنے کی ممانعت تھی۔ پر وہ پرائے مرد سے مخاطب تھی اور لہجے میں سزا کا خوف بے باک ہو گیا تھا۔

''چنی جی......وہ کوٹھے میں......''

رلیے کے خشک حلق میں باجرے کی روٹی کا کھردرا ٹکڑا اٹک گیا اور لسی کا کٹورہ خالی تھا۔

''اور سائیں۔''

''دونوں اکٹھے ہیں۔''

''وہ دونوں اکٹھے ہیں اور تُو اکیلا...... ہوں...... میرا مرد تیری عورت کے پاس اور میں اکیلی......''

''خشک ٹکڑا بنا لسی کے گھونٹ کے خراش دے کر حلق سے گزرا۔''

''سائیں پکھی واس کا کیا تیرا میرا، نہ حیاتی اپنی نہ نام نہ کام نہ زال نہ اولاد، بس سب میں تھوڑا تھوڑا حصہ ہے اُس کا......''

''پر وہ خُود تو پورا ہے نا......''

سیاہ چادر کی انتہائی کالی کنی سے جھلملاتے تیکھے نقوش اپنے اپنے وجود میں سمٹ کر ساکت ٹھہرے تھے جیسے سنگ مرمر کی چٹان تراش کر نمایاں کر دیئے گئے ہوں۔

''ہاں سائیں! جانوروں کی سیوا میں جتا ہوا جنور، گھوڑوں کی کھریل، کتوں کی مالش، کالوں کی سیوا......تو کبھی......''

''تو کبھی بیبیوں کی سیوا، جن کے مرد تمہاری عورتوں کی سیوا میں ہوتے ہیں۔''

ساکن نقوش ذرا سے پھیلے جیسے ہلکی سی پھونک سے ہَوا ابھری ہو اور دراز قد سایا جھک کر پکھی میں چلا گیا جیسے پیٹھ پیچھے چکی بندھی ہو اور بوجھ نے دوہرا کر دیا ہو۔

''سنا ہے چنی نے پکھی گڈی کی طرح سجائی ہے مشک نام کو نہیں چاہے میں بھی بیٹھ جاؤں۔''

''سائیں ملاحظہ ہو۔ پکھی نے کیا سجنا حویلی تھوڑی ہے۔''

''پر تیری پکھی تو سنا، پنی کی طرح لشکتی ہے۔''

پکھی کی درمیانی ترنگل میں لٹکی لالٹین بھک بھک کرتی تھی شاید لاٹ کو تیل زیادہ چڑھ گیا تھا۔ نامکمل جہاج کے برت صندوق پر رکھے تھے جن کے مٹھ ابھی باندھنے تھے اور لال ہری گڈیاں بھی ٹانکنی

تھیں اور پکھی کا فرش نرم پرال سے گف تھا، جو اسفنج کی طرح سب کچھ اپنی آغوش میں سمو لیتا تھا، رلیے کی نظریں پرال میں دھنسے پیروں پر تھیں اتنے ملوک پیَر، اتنے تو چنی کے گال بھی نہ تھے۔

''سائیں! مجھے حکم کیا ہوتا تم نے کیوں کھیچل کی۔'' وہ دوزانو ہو رخساروں جیسے ملوک، پیروں پر پڑی دھول کی سنہری تہ ڈب کے پلو سے جھاڑنے لگا۔

''سائیں! حکم ہو تو پیر دبا دوں۔''

''رلیا سر کی لگا کے پکھی بند کر دے پہلے۔''

کمر پر بندھی چاٹی گھمر گھمر چلنے لگی۔

''نہ سائیں! نہ۔''

رلیا جھٹکا کھا کر پکھی کے تنے ہوئے رسّے سے جا ٹکرایا۔

چاٹی کی گھمر گھمر تیز ہوگئی، ہلکے ہلکے پھیلے نقوش ٹیڑھے ہو کر بدوضع ہونے لگے۔''

''کیوں؟''

''سائیں! میں نے سالم سانا کھایا ہے اور حرام سیڑ (خرگوش)......''

پوری پکھی جیسے تیز جھکڑ میں ڈول گئی۔

''یہ تو اُس نے بھی کھایا ہے جو تیری عورت کے پاس ہے اور اُن سب نے کھایا ہے جو اَدل بدل عورتوں کے پاس ہیں۔''

کھمبی سے بھی زیادہ ملوک پیَروں پر رلیے کا سَر مرگی کے مریض کی طرح جھولتا تھا جس سے تعفن اُٹھتا تھا جیسے مُردار کی اوجھری چیر دی گئی ہو۔

''سائیں! ایک ڈوجے کے گھر کی لید پھوسی کا اَدل بدل کیا...... پر کعبے کا کنگرا چھونے کو یہ ہاتھ ناپاک ہیں۔''

بگڑے پھیلے نقوش اپنی اپنی جا سمٹ کر ساکت ہو گئے۔ لالٹین کی چمنی سے اُڑتے کالے سلیٹی ذرات، پکھی کی چھت پہ جالے بناتے اور پرال پر جھڑتے رہے۔ وہ تاریکی کی اوک میں یوں سمٹ گئی جیسے کبھی الگ ہوئی ہی نہ تھی۔ بوسیدہ کھوپڑیوں اور پنجروں سے ٹکرا کر بازگشت اُبھری۔

''رلیے کبھی نہا بھی لیا کر تیرے سے بہت بُو آتی ہے۔''

یا پروردگار

صائمہ کا نکاح ٹوٹنے کا سبھی کو دُکھ تھا، ایسا دُکھ جس میں انسان پتھر ہو جاتا ہے اور جب تڑپتا ہے تو پھر بے پناہ رو دیتا ہے یا ہنس دیتا ہے۔ دونوں عمل اپنی شدت میں یکساں ہوتے ہیں ہیجانی اور جنونی......

صائمہ کی امی کو اپنی چھوٹی بہن کی کمینگی پر بڑا دُکھ تھا، جس نے بڑی بہن کی بیٹی کا بچپن کا رشتہ تڑوا کر اپنی بیٹی دے دی۔ وہ رو دیں اور دامن پھیلا کر بد دعا دی۔ ''یا پروردگار اس کا کیا اُسی کے سامنے لا۔''

صائمہ کے والد کو اپنے ہم زُلف پر بڑا افسوس تھا، جس کی تنگی ترشی میں ہمیشہ وہ اُس کے کام آئے لیکن جیسے ہی بیٹے نے سی ایس ایس کر لیا، تو بلیک کے مال کی طرح اُس کے نرخ بہت چڑھ گئے اور پرانے سودوں سے وہ یکسر منحرف ہو گیا۔

صائمہ کا والد بھی رو دیا اور ہاتھ اُٹھا کر دعا کی۔ ''یا خدا انصاف کر، بلاشبہ تو انصاف کرنے والا ہے۔'' اور وقت دُعا دُکھ اور خوشی کا ہیجان متوازن ہو جایا کرتا ہے۔ وہ دونوں مطمئن ہو گئے اور اپنی دعا کے اثر کا انتظار کرنے لگے۔

صائمہ کے بھائی عاصم نے نہ بد دعا کی، نہ رویا، نہ ہنسا، دونوں کے انتہائی ہیجان میں پھنکارا۔

''خدا انسانوں کو قانونِ فطرت کے حوالے کر کے دعائیں یا بددعائیں نہیں سُنا کرتا۔ مُقدر محض حالات کی سازگاری یا ناسازگاری کا نام ہے، جو فطرت کے اُتار چڑھاؤ میں بنتا بگڑتا ہے اور فطرت جنگل کا قانون ہے۔ طاقتور کمزور کو، جابر محکوم کو مقدر عطا کیا کرتا ہے جیسا بھی وہ چاہے۔''

نہ دُعا کا توازن، نہ خوشی اور غم کا ہیجان، غصے کی پھنکار میں دلیل کی سنگینی ٹھہر گئی۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے، جب دنیا کی سب سے نہتا اور غریب قوم پر دنیا کی سب سے ترقی یافتہ اور امیر قوم نے موت مقدر کیا، جیسے کیڑے، مکوڑوں، مچھر اور مکھیوں کی بڑھوتری انسان کو پسند نہیں آتی، اور اُن کے مقدر کا فیصلہ وہ زہریلے سپرے وغیرہ سے تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح ان کیڑا نما انسانوں کی کثرت خدا نما انسانوں کو اچھی نہیں لگتی وہ آسمانوں سے ان پر بارود وغیرہ سپرے کرتے ہیں اور ان کے مقدر کے فیصلے کرتے ہیں، جس انداز میں کہ وہ چاہیں۔

صائمہ کی ماں انسانوں پر انسانوں کی لائی ہوئی اس تباہ کُن مقدر کی ہولناک تصویریں ٹی وی پر دیکھتیں تو جھولی پھیلا پھیلا کر دعا کرتیں۔

''یا میرے خالق! کیا تو نہیں دیکھتا، تیرے بے بس انسانوں پر تری صفات میں سیندھ لگا کر کس تکبر سے موت برسائی گئی یا خدا! تیری غیرت جوش میں کیوں نہیں آتی۔''

وہ خدا کی غیرت کو اُکساتی رہیں اور عمیر کی بارات ٹھاٹ سے ان کی چھوٹی بہن کی بیٹی کو بیاہ لے گئی۔ تبھی بے شمار خطوں اور لاکھوں ہاتھوں سے دُعائیں چھلنی بھرے پانی کی طرح پھسل گئیں اور خدا کی بستی میں داڑھیوں، عماموں والے روزہ دار جسموں کو کُتے اور گدھ نوچتے رہے کہ خدا نما نے اُن کے مقدر کا فیصلہ ایسے ہی دیا تھا۔

صائمہ کے باپ نے چنگھاڑ نما دُعا پکاری۔ ''اے میرے رب العالمین، ظالموں کو ظلم کی سزا دے کہ اگر ظلم رسم ہو جائے تو پھر انصاف سے نا اُمید مظلوم متشدد ہو جایا کرتے ہیں۔''

صائمہ کا بھائی اس دعا پر ہنس دیا، ایسی ہنسی جو رونے کے ہیجان سے پھوٹتی ہے۔

''آئینِ کائنات میں خدا دخل نہیں دیتا، اور آئینِ کائنات کا پہلا اصول۔ Survival of Fittest ہے جو بدلتے حقائق کی نبض کو نہیں پہچانتا۔ تقدیر کے قاضی کا فتویٰ نہیں پڑھتا، تو پھر قوانینِ فطرت اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور اُسے گھیر کر مار دیا کرتے ہیں۔ کیونکہ عضوِ معطل کی گھیری ہوئی جگہ

قدرت ہمیشہ اپنے فعال عناصر کو الاٹ کر دیتی ہے۔"

صائمہ تو اُس ایک نگاہ کے کھکھل میں ڈربہ بند ہوگئی تھی۔ نہ روئی نہ ہنسی کہ کھکھل میں نمو نہیں ہوتی، اور نمو آئینِ فطرت کی دوسری شق ہے۔ اُس نے تو اُسی خول کو خود پر فولاد کر لیا جو اُس کے احساس کی پہلی کروٹ پر انگڑائی کی طرح کھلا اور پھر بنا جنبش وہیں پڑی رہی۔ مہینوں، سالوں بعد ہی عمیر کے ہونٹوں کے قوس کی جنبش سے کھکھل کی چھال ذرا سا مسکتی، جس کے قالب میں وہ قلبوت ہوگئی تھی۔

صائمہ کی امی تسبیح پھرولتی رہیں "مکافاتِ عمل ہوگا، ضرور ہوگا، یہاں بھی، وہاں بھی۔" لیکن آسمان کو تو سیارچوں اور بمباروں نے گھیر رکھا تھا۔ تسبیح کی تاثیر شاید انہی سے ٹکرا کر واپس پلٹتی رہی۔ ہُوا کیا کہ ہمیشہ فسٹ آنے والی صائمہ ایم۔ اے انگلش کے پارٹ ٹو میں بُری طرح فیل ہوگئی۔ دماغ کی لوحِ تختہ سیاہ ہوگئی جس پر لکھے حرف گڈمڈا گئے اور لفظوں کی شناخت دم توڑ گئی۔ صائمہ کی امی کی دعائیں با آواز ہوگئیں۔

"یا پروردگار! دکھیاروں، غریبوں اور آفت زدوں کا تو ہی ہوتا ہے، خود کو دکھا کہ تیری رحمت سے مایوس لوگ یا غلام بن جاتے ہیں یا باغی اور غلام مٹی چاٹنے لگتے ہیں اور باغی آگ، ہر دو خوراک موت ہے، سو غلام اور باغی زمین برد ہو جاتے ہیں یا جل مرتے ہیں۔"

ابابیلوں کے کنکروں، نوح کے طوفانوں، نیل کی طغیانیوں اور مچھروں کی فوجوں کے انتظار میں بستی کے سارے روزے دار، لاشوں اور لہو سے سحری افطاری کرتے اور ہاتھوں میں دعاؤں کے خالی کشکول تھامے بستی کو کھنڈر بنتے اور انسانوں کو مشینوں کے تیز دندانوں تلے گتاوہ ہوتے دیکھتے رہے۔ شاید دعائیں بھی مشینوں کے خوفناک جبڑوں میں آ کر کچلی جاتی ہیں۔ جدید سیٹلائٹ سسٹم انہیں راہ میں ہی کہیں بیچے پنجا مارتے ہیں۔

صائمہ تو عمیر کی اُسی نگاہ کے کھکھل میں سکڑتی چلی گئی تھی، جیسے سورج تلے رکھا ہوا مردہ گوشت، تیل چھوڑتا، سیاہ پڑتا اور سکڑتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے زندہ انسان فولادی کنٹینروں میں دم گھونٹتے، سڑتے، بُو مارتے، صحراؤں کی ریت میں دھنسے، گدھ شکروں کا دستر خوان بنتے تھے۔ موت کو ایسی جدت خدا نہیں، خدا نما ہی دینے کا فن رکھتا ہے۔

اس گلتے سڑتے گوشت میں اُبلتا ہوا دماغ پتہ نہیں کس فارن ہائٹ پر دہکا تھا کہ اک روز

صائمہ ہنسنے لگی۔ ایسی ہنسی جو رونے اور ہنسنے کی ہیجانی انتہا پر جنم لیتی ہے۔ صائمہ کا باپ، ماں اور بھائی اُسے دماغی امراض کے ڈاکٹرز کے پاس لے گئے اور اُس کی ہنسی کا علاج ہونے لگا، یہ ہنسی بھی بڑی ظالم شے ہے، ایک بار کسی کو لگ جائے تو پھر بڑھتی چلی جاتی ہے جیسے دوائیاں اُسے گدگداتی ہیں اور مرض کے مضحک قہقہے جنوں خیز ہو جاتے ہیں۔ علاجوں، معالجوں پر خندہ کرتے ہوئے۔ جیسے جیسے یہ دوائیاں دماغ کی جھلی کو پھلانے لگیں، ذہن کے دریچے حال اور مستقبل پر بند ہونے لگے اور بھیجا ماضی کے پنجرے کی سلاخوں میں پرویا گیا جیسے کباب سیخ میں، جیسے گوانتاموبے کے پنجروں میں بند انسان نما کیڑوں کے دماغوں کو زنجیروں کی سولی پر لٹکایا جاتا ہے اور اُن کے جسموں کے سیخ کبابوں کی سلاخوں کو دہکی ہوئی انگیٹھیوں میں پخت پر لگا دیا جاتا ہے۔ جہاں دماغ کی جھلیاں سکڑتی ہیں اور بھیجے بھاپ چھوڑتے ہیں۔ جن کی جلی ہوئی مہک کو لوگ ناک پر رومال رکھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ داڑھیوں اور عماموں والے جو روزے رکھتے اور پانچ وقت زمین پر ماتھے ٹیکتے ہیں۔ دنیا کی مہذب ترین زبان کی جدید ڈکشنری میں ان کا مطلب دہشت گرد، انتہا پسند اور بنیاد پرست لکھا ہوا ہے، کیونکہ یہ احمق تقدیر ساز خدا نما کو نہیں خود خدا کو سمجھنے لگے تھے سو ان کے خراب دماغوں کے علاج کے لئے مختلف واٹ کے جھٹکے تجویز ہوئے۔

صائمہ کی امی نے صائمہ کے سکڑے ہوئے دماغ کو کرنٹ لگوانے کا علاج سوچا اور صائمہ کے لیے ایک رشتہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔

لڑکے والے اس سوگوار حُسن کو پسند کر چکے تھے اور انگوٹھی پہنانے کا سوچ رہے تھے کہ صائمہ کی چچی نے لڑکے کی ماں کے کان سے منہ لگایا۔

''دیکھا کتنی پیاری ہے، اُداس چہرے زیادہ پیارے لگتے ہیں، بیچاری......''

چچی کی ٹھنڈی سانس پر لڑکے کی ماں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیوں خیریت۔''

''خیریت کہاں جی! ابھی پہلا نکاح ٹوٹے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ اپنا خالہ زاد تھا، غیر تھوڑی تھے۔ ملتے جلتے ہنستے کھیلتے نکاح کے پانچ سال گزرے۔''

لڑکے کی ماں انگوٹھی سمیت کر واپس چلی گئی۔

صائمہ کی امی سوچتی رہ گئیں۔ ہُوا کیا اور جب معلوم ہوا تو بد عادی۔

''اللہ کرے اپنا کیا اپنی ہی بیٹی کے آگے آئے۔''

لیکن کیا ہوا کہ بیٹی اُسی لڑکے سے بیاہ کر امریکہ چلی گئی، جس کا رشتہ صائمہ کے لیے آیا تھا۔

صائمہ کے بھائی عاصم نے اس صریحاً زیادتی پر اُن کے گھر جا کر احتجاج کیا، کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ یہ فطرت کا گندا رخ ہے، جس کی بداعمالیوں کو روکنا جہاد ہے، لیکن وہ واپس نہ آ سکا، اور 302 میں اندر ہو گیا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب قلعہ جنگی میں ہزاروں کیڑا نما انسان بند کر کے جہازوں سے اُن پر موت سپرے برسایا گیا، سارے مچھر، مکھیاں، کیڑے مکوڑوں کا صفایا ہو گیا اور آسمانوں تک خون اور بوٹیوں کے گل رنگ فوارے اُچھلتے رہے لیکن عرش کے کنگرے کو نہ چھو پائے کہ خلا میں تو سارے، سیارچے اور بمبار بھرے تھے، دنوں لہو اور گوشت کی جنونی بُو، ٹی۔ وی سکرین اور اخبارات کے صفحات پر سے اُٹھتی رہی، اور لوگ رومال رکھ رکھ اپنی اپنی ناکیں ڈھانپتے رہے۔

دنیا کی سب سے مہذب و متمدن قوم نے دنیا کی سب سے اُجڈ اور وحشی قوم کو ایسے مارا، جیسے وحشی جانوروں کو مارنے کا حق ہوتا ہے۔ آدم خوری کی خصوصیات کی مہارت بھی انہی مہذب قوموں کو شوبھا ہے، جس کی مثالیں بھی بس انہی کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ساری انسانی حقوق کی تنظیمیں واہ واہ کر اُٹھیں۔

جدید ڈکشنریوں میں اپنے نام کے مطالب تبدیل کرنے والوں کے خلاف احتجاج کرنے والے احمق بھی دیسی ساخت کے بموں کی طرح اُڑ گئے اور نام تبدیل کرنے والے ان برہنہ لاشوں کا لباس اُدھیڑتے رہے، خونخوار پنجوں میں جکڑی زندگی کی عصمت دری کو صائمہ کی ماں نے دیکھا اور جھولی پھیلا کر دُعا کی۔

''یا باری تعالیٰ انصاف کر، ظالموں کو ظلم کی سزا دے کہ اگر سزا کی طنابیں ڈھیلی پڑ جائیں تو ظلم کی باگیں دراز ہو جاتی ہیں۔''

صائمہ کا بھائی اُس گھر میں گیا تو محض غصے کے ہیجان کا ہتھیار لے کر جو قانونِ فطرت کے بہیمانہ قتل کے خلاف احتجاج تھا، لیکن اُس سے بندوق بھی برآمد ہو گئی، جس سے ایک زخمی بھی ہو گیا۔

بہت سے عینی شاہد بھی مل گئے اور اُسے دس سال کی قید بامشقت سُنا دی گئی اور میڈیکل کے تیسرے سال کی پڑھائی جیل کی تاریک کوٹھریوں میں دم توڑ گئی یہ وہی دن تھے جب کابل اور جلال آباد کے عقوبت خانوں میں بند نوجوان اپنے نام پتے اور شناخت سب بھول گئے تھے جن کے بھیجے مومیائی بنا کر نچوڑ لیے گئے تھے اور آنکھوں کی بے نوری میں صحرا ابھر گیا، جس میں زندگی کی بے مقصدیت جنون بن کے ناچتی ہے۔

ہزاروں لاشوں کی بے حرمتی، لاکھوں بیواؤں، یتیموں کی آہیں، معذوروں کی بد عائیں اور بارود کی آگ نے بستی کے ادھورے، اندھے، لولے لنگڑے ہضم کر لئے اور جب حرام ہضم ہو جاتا ہے تو پھر معدہ بہت کشادہ اور آنکھ کی چربی بہت موٹی ہو جاتی ہے۔ تو ایسے میں بربریت سے اگلا قدم بشیت ہوتا ہے۔ طاقت کو جب ظلم راس آ جاتا ہے تو پھر وہ خدائی کی دعوئی دار ہو جاتی ہے اور سب بستیوں سے سجدۂ یکتائی چاہتی ہے۔ تبھی خدائی کے دعوے دار نے اک اور بستی پر گدھوں کے لشکر بھیجے، لاکھوں کروڑوں ہاتھوں سے دعائیں ریت کے ذرّات سی پھسل کر کہیں خلاء میں تحلیل ہو گئیں۔ کہیں آتش زار گلزار نہ ہوا۔ کہیں نیل پُر آب نہ ہوا، کہیں فرشتہ اجل روح شداد کو قبض کرنے کو نہ بڑھا۔ کوئی سرخ صحرائی آندھی جو ناحق خون بہنے پر چلتی ہے نہ چلی۔ موت سے لدے بحری بیڑے ڈبونے کو کوئی سمندری طوفان نہ بپھرا، بمبار عقابوں سے سیاہ پڑے آسمان پر کوئی بجلی نہ کوندی اور خدا کی بستی فوق البشر کے لہو سے سینچ دی گئی۔

صائمہ کے امی، ابو کے وظائف بڑھ گئے ہر وقت ہاتھ جھولیاں پھیلائے رہتے۔

''اے غریبوں، بے کسوں اور مظلوموں کے حادی، جس انصاف کا وعدہ تیری ذات سے وابستہ ہے۔ اُسے ایفا کر، ورنہ تیری ذات سے نا اُمیدی ہو جائے گی اور نا اُمیدی گناہ اور جرم کی پناہ گاہ ہوتی ہے۔''

عاصم ہنسا ایسی ہنسی، جو پھانسی کے مجرم کی کال کوٹھڑی میں سے آتی ہے۔

''جہاں توازن نہیں رہتا، وہاں انصاف کیونکر ممکن ہے، انتہائیں غیر متوازن ہوا کرتی ہیں۔ تب فطرت کا شوق یکتائی خدا کی ہمسری کا دعوے دار ہو جایا کرتا ہے۔ طاقت، دولت اور اقتدار اپنا شریک برداشت نہیں کرتے۔ پہلا اور بروقت وار اور شراکت کے دعوے دار کا خاتمہ ہی دراصل

Survival of Fittest کا اصول ہے اور پھر دولت، طاقت اور اقتدار کی مسند کا یکتا جسے چاہے موت دے، جسے چاہے زندگی بخش دے جہاں چاہے رزق اُگا دے، جہاں چاہے قحط نازل کر دے، اُسے کسی فیصلے کے لیے کسی منشور یا تائید کی ضرورت نہیں ہوتی، جو تقدیر کے قاضی کے اس فتویٰ کو نہیں سمجھتا وہ مٹا دیا جاتا ہے۔''

جس رات صائمہ کے بھائی عاصم کو گوٹے کناری والا لال دوپٹہ اوڑھا کر جیلر کی خواب گاہ میں دھکیلا گیا، اور وہاں موجود لال کالی شکلوں اور خون اُتری زرد آنکھوں والوں نے اُسے شادی مبارک، شادی مبارک کے بیہودہ مذاقوں سے گھسوٹ ڈالا، اُسی رات متمدن معاشرے کے جدید میڈیا نے ابوغریب جیل کی مہذب تصویریں نشر کیں۔

ننگے بدنوں کو نوچتے ہوئے کتے، پیغمبروں کی سرزمین کے باسیوں کے چہروں پر چڑھے ہوئے عورتوں کے زیرجامے، اور بجلی کے تاروں میں لٹکے ہوئے یکتائے فطرت کی آزادی کے مجسمے، کہ عبرت پکڑو، سرتابی کی جرأت کا تصور بھی نہ کرو کہ جہنم زار ہمیں دہکاتے ہیں۔

اُسی رات صائمہ مینٹل ہوسپٹل پہنچی اور اُسے پہلا شاک لگا، اور صائمہ کی خوبصورت جوانی اور صورت بجلی کے جھٹکوں اور ٹیکوں اور دوائیوں میں گھلنے لگی، جیسے کاسٹک سوڈے کی چٹکیاں بھر بھر جلد کے اندر چُن دی جائیں۔ آنکھوں کے حلقے پھانسی گھاٹ کے کنوئیں ہو گئے اور پتلیوں میں مردنی گزدوں لٹک گئی۔ وہی جو کابل و قندھار کی جیلوں سے بچ آنے والوں کی آنکھوں میں سنسناتی ہے۔ ماحول کی بیگانگیت اور وجود کی عدم شناخت کی حیرانی۔

صائمہ کی ماں کی دعائیں کرب انگیز ہو گئیں، اُن کے دل سے نکلتا ہوا کوئی تار سا مٹل ہسپتال سے گزرتا، ڈسٹرکٹ جیل سے جڑتا تھا اور بجلی کا ہر جھٹکا، اور کمینگی کا ہر شاک یکبارگی اُن کے وجود سے گزر جاتے تھے۔

صائمہ کا باپ عاصم سے ملاقات کے واسطے جیل کے بے حس پتھر کے بینچوں پر انتظار میں بیٹھے بیٹھے دن گزار دیتا اور پولیس کے بینڈ اور مارچ پاسٹ کے بھاری بوٹوں کے ساتھ شام پڑے باہر دھکیل دیا جاتا ایک روز جب اُس نے عاصم سے ملے بغیر باہر جانے سے انکار کر دیا تو بس دو چار بوٹوں کی ٹوہیں ہی کافی ثابت ہوئیں اور وہ پتھر کی بے حس اور ٹھنڈی بینچ کو سیاہ خون کے جمے ہوئے لوتھڑوں سے

رنگین کرتا ہوا اُسی بنچ کے پتھر جیسا بے حس اور ٹھنڈا ہو گیا اور پھر کسی مصروف سڑک پر پڑی ہوئی اس لاش کو کسی سماجی تنظیم نے لاوارث قرار دے کر دفنا دیا۔

عاصم سیلو نے پتھر میں رچے خون کی اس سرخی کو رگڑ رگڑ ہاتھوں پر ملنے کی کوشش کرتا۔ تب وہ نہ ہنستا نہ روتا۔ نہ غصے کا ہیجان اُبال دیتا اُس کے بے بس وجود کے اندر ایک بھرپور قوت نے جنم لیا۔ مار کر مر جانے کی خواہش ''موت کا خریدار'' ایک ایسی منہ زور قوت جس کے سامنے موت کے بیوپاری موت کی ہزاروں اقسام رکھنے کے باوجود بے بس نظر آتے ہیں۔ صائمہ کی امی نے دونوں ہاتھ فضا میں پھیلائے۔

''اے میرے مولا! انصاف کر تیرے انصاف کی رسی جتنی دراز ہو گی۔ بے انصافی اتنا ہی دنیا کا چلن ہو جائے گی تو پھر مظلوم بے صبرے ہو کر موت خریدنے لگیں گے۔''

عاصم جیل کے خلوت کدوں سے جوانی بھر باہر نہ نکل سکتا، اگر وہ شخص جیل میں نہ آتا، جس پر دہشت گردی کے بے شمار الزامات تھے، لیکن جسے کسی معزز مہمان کی طرح جیل میں لایا گیا تھا، جس سے بات کرتے ہوئے سپاہیوں کے ڈنڈوں کا رخ زمین کی سمت ہوتا تھا اور جب وہ مخاطب ہوتا تو بغلوں میں دبی بندوقوں کی بے رحم نالیاں لرزتیں، وہ موت کا خریدار تھا، جس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی زندگی تھرتھراتی تھی کہ زندگی کا ست کشید کر کے کسی چھلکے کی مانند اُسے پَیر تلے مسل ڈالنے کا فن وہ خوب جانتا تھا۔ عاصم جیسے کئی نوجوان اُس کی مقناطیسی شخصیت کی سمت کھنچے چلے گئے۔ اُس نے اپنے پہلے خطاب میں کہا تھا۔

''زندگی بنا مقصد کے جانوروں کی طرح جینا ہے اور انسانیت کا سب سے بڑا مقصد شر کی سرکوبی ہے لیکن آج کا دَور شر کے اقتدار کا دَور ہے اور مقتدر وقت کو للکار کر ہم اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم گھات لگا کر اُسے ذرہ ذرہ توڑ سکتے ہیں، جیسے بار بار پَیر رکھنے سے پتھر گھس کر کمزور ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو ظالم بہت سہا ہوا اور کمزور ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ اپنی پوری قوت اِن نہتے اور کمزوروں پر کیوں صرف کر ڈالے، جن کے پاس سوائے موت کی قوت کے کچھ نہیں ہوتا۔ ظالم اور جابر بظاہر جتنا طاقتور ہوتا ہے۔ بباطن اُتنا ہی کمزور اور خوفزدہ کیونکہ اُس کی زندگی ہماری موت کی گھات میں ہے اور ہماری موت اُس کی زندگی کی گھات میں۔ موت ہمہ نوع ہے، جبکہ زندگی یک نوع، ہم پر جو حکمران مسلط

کیے گئے ہیں۔ وہ شر کے مقتدرِ اعلیٰ کے ہاتھوں ناچنے والی چھوٹی چھوٹی پتلیاں ہیں، جن کے اپائنٹمنٹ لیٹر شر کے ناخدا جاری کرتے ہیں اور جب تک ضرورت رہتی ہے۔ انہیں دھاگوں کے سَروں پر جھلاتے رہتے ہیں اور جب یہ بے کار ہو جاتے ہیں تو پھر کسی حادثے میں یا کسی طیارے میں بیٹھا کر انہیں ایسے ہی مار دیتے ہیں، جیسے ان کے Pets جب معذور یا بانجھ ہو جائیں تو پھر اُنہیں گولی مار دی جاتی ہے۔ ہمیں ان پتلیوں کو نہیں ان ہاتھوں کو کاٹنا ہے۔ یہ ہاتھ مضبوط سہی لیکن ان کا ضعف انہی کے ظلم کی بنیاد میں چھپا ہے اور کمزور بنیادیں جلد یا بدیر ڈھ جاتی ہیں۔ ہمیں ان کھوکھلی بنیادوں کو دھکا لگانے والے ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ ان ہاتھوں کی جنہیں بے بسی کی رسن میں جکڑ دیا گیا ہے، جن کی قوت خود انہی کو ڈسنے لگی ہے۔ ہمیں اس بے کار قوت کو صحیح استعمال دینا ہے۔ ہمیں انہیں زندگی و موت کا فلسفہ سمجھانا ہے۔"

بہت سے قیدی نوجوان اُس پُر تاثیر زبان کے اسیر ہوتے چلے گئے، جس کی زبان کو روکنے کی جرأت اُن اکڑی ہوئی کریزوں اور آہنی بوٹوں کو نہ تھی جو ایک لفظ بولنے پر قیدیوں کو انہی کے ازار بند سے پھانسی دیتے اور خودکشی کی خبریں اخباروں میں لگوا دیتے ہیں۔ یہ نوجوان جن کی زندگی کو دھونس دھاندلی کی نقب لگی تھی، جن کے گرم خون سے ہر سرگرمی چھن گئی تھی، جن کے جوان اعصاب بے عملی کے دیمک میں ذرّہ ذرّہ جھڑ رہے تھے، جنہیں کچھ کرنے کو درکار تھا۔ بے مقصدیت کی سُولی پہ لٹکی لاش کو کسی عمل کے کندھے کی ضرورت تھی وہ سب اُس کے قریب ہوتے چلے گئے۔

عاصم جب باہر آیا تو اُس کے چاروں اور سب دروازے بند تھے۔ بس ایک دروازہ کھلا تھا، جس میں داخلے کے بعد پیٹھ پیچھے اُسے بھی بند ہو جانا تھا۔ کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ مینٹل ہوسپٹل میں ہنستی ہوئی صائمہ اُسے اُکسا رہی تھی۔ اسی دروازے میں داخل ہو جاؤ کہ قانونِ فطرت نے اُس کے لیے اسی کا چناؤ کیا ہے۔ اُس کے دشمنوں کی فہرست طویل تھی۔ جیل کے کئی افسر، کئی قیدی، جگے اور نمبردار اُسے جیل بھجوانے والے سارے عناصر لیکن اُس کے پاس صرف ایک جان تھی جو زخموں سے چھلنی تھی اور ہر ہر زخم سے انتقام کا بارود چھلکتا تھا۔ اس بارود کو کسی آہنی نالی کی ضرورت تھی جس میں سے چھٹتا ہوا وہ اپنے ہدف کو چیر سکے۔

جب وہ زیرِ زمین آہنی نالی جیسی اس خفیہ عمارت میں داخل ہوا، تو وہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں پہلے سے موجود تھے، جن کے جسموں میں بارود لوڈ کیا جا چکا تھا، جن کے پھٹنے کے ٹائم مقرر

تھے، اور جلد باری لگنے کو وہ ایسے ہی بے قرار تھے، جیسے دولہا پہلی بار اپنی دلہن کا گھونگھٹ اُٹھانے کو بے تاب ہوتا ہے۔

اس بلڈنگ کی لہورنگ دیواروں پر بے شمار تصویریں چسپاں تھیں، اُن ٹائم بموں کی جو اپنی اپنی باریاں لے چکے تھے اور اُن عناصر کی بھی جنہوں نے انہیں بم بنا ڈالا تھا۔ بلڈوزروں کے جبڑوں میں کھنڈر بنتی آباد بستیوں کی تصویریں، درندوں کے نرغے میں چیختی ہوئی بہنوں، بیٹیوں کی تصویریں، کٹے پھٹے جسموں اور چہروں والے نوجوانوں، علماء اور راہنماؤں کی تصویریں، عاصم کے پاس بھی صائمہ کی ایک تصویر موجود تھی جو اُس کے نکاح کے روز اُتاری گئی تھی، جس میں وہ مسکرا رہی تھی اور اُس کی یہ مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل کر دی گئی تھی، وہ تصویر بھی عاصم نے اُسی دیوار پر چسپاں کر دی۔ یہ ساری تصویریں ان نوجوانوں کے مضبوط جسموں اور جوان بازوؤں کی غیرت کو للکارتی تھیں۔ بے حمیتی کے طعنے دیتی تھیں، جن کے پاس اک جان کے ہتھیار کے سوا کچھ نہ تھا لیکن یہ جسم لوڈ کیا جا سکتا تھا، کسی بھی مادی ہتھیار کی طرح، بمبار طیاروں میں گولی کی طرح لگنے کے لیے، جدید کیمیائی ہتھیاروں میں گھسنے کے لیے، بستیاں اور نسلیں نگلتے، ٹینکوں اور بلڈوزروں کے سامنے بچھنے کے لیے کہ ان کٹے پھٹے جسموں میں اک عجب قوت نے جنم لیا تھا۔ مرنے کی قوت جو زندگی کی حرکی قوت کی نسبت کہیں شدید، قوی اور دندان شکن ہوتی ہے۔ موت سے بھاگنے والے کو مارنا بڑا آسان لیکن موت کے طلبگار کو مارنا بڑا مشکل۔

اُن کے رہبر نے کہا تھا۔

''اپنی ذات کے اعتراف کے لیے اس مادی وجود کی قربانی دینا سیکھو جس پر شکرے اور گدھ چھوڑے جا چکے ہیں جو اسے جلد یا بدیر نوچ لے جائیں گے۔ ان گدھوں کی حرام چونچوں کا نوالہ بننے کی بجائے دو چار گدھ مار کر مرو، مار کر نہیں مرو گے تو بے مارے مار دیئے جاؤ گے، کیونکہ تمہاری موت کے پروانے تو مدت ہوئی شر کے مقتدر اعلیٰ نے جاری کر دیئے ہیں۔ خبردار تمہیں غلام بن کر بھی جینے کا حق نہیں دیا جائے گا۔ بے شمار غلاموں کا انجام تمہارے سامنے ہے۔ جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر شہادت کی موت کا تحفہ قبول کرو شہید جو کبھی مرتا نہیں...... جنت کی حوریں تمہاری دلہنیں تمہارے انتظار میں بے قرار ہیں...... غلمان...... دودھ کی نہریں...... پھلوں کے پیڑ...... سب تمہارے استقبال کے لیے......''

مقرر کی پُر تاثیر آواز اور جنت کی ترغیبات انتہا کو پہنچ جاتیں۔ لبیک لبیک کی صدائیں تہہ خانے کی دیواریں ہلا دیتیں۔ شہادت کے خانے میں نام لکھوانے والے بڑھ بڑھ کر ہاتھ کھڑے کرتے اور عاصم کا ہاتھ سب سے بلند ہوتا۔ موت کی طلب زندگی کا منہ چڑاتی۔

صائمہ کی ماں کے دل کا تار اس تہہ خانے سے جڑا تھا اور وہ جھولی پھیلائے کھڑی تھیں۔

''یا پروردگار! ہمارے بچوں کی شہادت کے تحفے کو قبول فرما کہ تیری راہ میں دینے کو ہمارے پاس اور کچھ نہیں بچا، ہاں اگر ان بچوں کو اس قربانی سے بچانا ہے تو پھر آسمانوں سے کوئی دنبہ اُتار کہ دنیاوی دُنبے یا کٹ گئے، یا اسیر ہو گئے، یا غلام ہو گئے اور عاملوں کے حکم کی بجا آوری میں معمول بن گئے، یا خدا تو میری فریاد سُن لے، ایسا نہ ہو کہ اک دن سارے بچے کٹ جائیں اور تیری راہ میں قربانی دینے والا اس قوم میں سے کوئی نہ بچے۔ یا میرے پروردگار سُن کہ تُو سُننے والا ہے۔

شہرزاد

دلہن کے ارمانوں سا شوخ رنگ، پیار کے لمس سی مخملی دبازت اور شادی کے اشتراک سا پھیلاؤ۔ امینہ نے جہیز کی تیاریوں میں اس کمبل کی خریداری میں سب سے زیادہ دلچسپی لی تھی لیکن موسم ابھی کمبل اوڑھنے کا نہ تھا، سو وہ اپنے کور میں ہی بند رہا، شاید وہ اسے کھول کر اے۔سی روم کی ٹھنڈک میں لپیٹ ہی لیتی، لیکن ویسے کی رات ہی کمبل کی رات نہ بن سکی۔ کیونکہ عباد کو ویسے کی تقریب سے اُٹھ کر سیدھا ایئرپورٹ روانہ ہونا پڑا، کیونکہ کمپنی کا ایمرجنسی بلاوہ آ گیا تھا اور اُس کی دو مہینے کی چھٹی فی الفور منسوخ کر دی گئی تھی۔

رات اکیلے کمرے میں عروسی مسہری پہ لیٹے ہوئے اُس نے بند کمبل کے پیکٹ کو دیکھا، اب اُسے کھولنے اور اوڑھنے کا کوئی منطقی جواز ہی نہ رہا تھا، لیکن انتظار تو یہی چند دنوں کا تھا۔ اُس کا ویزہ جلد لگ جائے گا۔ عباد سارے کاغذات مکمل کر کے ساتھ لے گیا تھا، وہ رات بھر امریکہ کے لیے پیکنگ کی پلاننگ کرتی رہی جس میں کمبل سرِفہرست تھا۔

وہ پلاننگ کرتی رہی یہ سوٹ یہاں پہننے کا فائدہ، عباد کے ساتھ ہونلنگ کے لیے جائے گی تو پہنے گی۔ یہ گرم سوٹ برف باری کے موسموں کے لیے موزوں رہیں گے۔ شام کی سیر کے لیے یہ سوتی کپڑے صحیح ہیں اور رات کی پارٹیز کے لیے یہ فینسی جوڑے پڑے رہیں۔ سارے کپڑے عباد کی معیت

میں پہننے کی مجبوری سے دوچار ہو کر انتظار کے پَل فنائل کی گولیوں پر گننے لگے۔

رات جب نیند نہ آتی تو وہ سوٹ کیس کھول کر بیٹھ جاتی، مواقع کی مناسبت سے جیولری، جوتے، پوری میچنگ تیار کر کے دوبارہ سوٹ کیسوں میں بھرنے لگتی۔ اللہ جانے کب بلاوہ آ جائے اور میچنگ تیار کرنے کا وقت ہی نہ ملے۔ وہاں کی زندگی تو سُنا ہے بہت ہی تیز اور مصروف ہے لیکن اتنی تیز تو نہ ہوگی، جتنی تیزی سے یہ کپڑے اُسے تنگ ہونے لگے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی، جس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر انہیں بنایا گیا تھا۔ اُس سے تو دوچار ہونے کا انہیں موقع ہی نہ ملا، جس شخص سے وہ پوری طرح متعارف بھی نہ ہوئی تھی، جس کے وجود کی مہک ابھی سانسوں سے آشنا بھی نہ ہوئی تھی، جس کی شبیہہ بھی ذہن پر زور دینے سے پردۂ بصارت پر اُبھرتی تھی۔ اُس کے بچے کی ماں، یہ قدرت کی تخلیق کا اشتراک بھی بڑا بے حس اور میکانکی ہے، جیسے جنگل میں بھاگتے بھاگتے کوئی نر مادہ کی دم سونگھ یہ جا وہ جا، اب دھرتی کی کوکھ دُکھ جھیلے، درِ دِزہ میں مَر جائے یا بند آنکھوں والے لاروؤں کو چاٹتی رہے۔ چوگا چگاتی رہے، پالتی رہے، بیج پھینک کر غائب ہو جانے والے کی بلا سے۔

عباد نے ٹیلی فون پر اس خبر کو خوب سیلی بریٹ کیا، اب چیک کے ہمراہ نومولود کے کپڑے، کھلونے بھی آنے لگے، اور یہ وعدہ بھی کہ یہ بچہ امریکن نیشنیلٹی لے کر پیدا ہوگا۔ اینہ کوکھ میں پلتے اس اجنبی اشتراک کو امریکہ کے کسی ہسپتال میں جنم پاتے ہوئے دیکھنے لگی، شادی شدہ زندگی کی دوسری رات امریکہ کے یخ بستہ موسموں میں آنی تھی۔ نگاہیں پھر کمبل کے محور پہ گھومیں، جس سے خواہش، ارمان آسودگی تحفظ کے کتنے ہی رنگ پھوٹتے اور سب سے گہرا رنگ سانجھ کا رنگ تھا۔

ٹیلی فون آتے رہے۔ کاغذات مکمل ہوتے رہے۔ ویٹنگ لسٹ میں اُس کا نمبر بڑھتا رہا۔ ہر روز اک نئی کہانی کہی جاتی رہی جس کا انجام آنے والی کل سے مشروط تھا لیکن زری نے نہ تو کہانی کے نامکمل انجام کے مکمل ہونے کا انتظار کیا اور نہ ہی امریکن ویزے کے کسی اصول قاعدے کی طوالت کو کھینچا اور پاکستانی نیشنیلٹی لے کر ہی آ رہی۔ اینہ کو عجب سا احساس ہوا جیسے اُس کے کورے بدن کو کسی پیار کے لمس نے نہیں بلکہ لیڈی ڈاکٹر کے نشتروں نے آلودہ کیا ہو۔ وہ کسی تدریجی مرحلے سے گزرے بنا ہی دوشیزہ سے ماں بن گئی، جیسے کسی ریپ کی تلچھٹ وجود کو پراگندہ کر جائے۔ یہ اَن چاہا وجود پیرِ تسمہ پا کی طرح اُس کے جسم پر سوار ہو گیا۔ وہ کسی جھولے یا کارٹ میں لمحہ بھر کو بھی نہ پڑتی، صرف اینہ کی گود کی

گرمائش میں ہی سوتی اور جاگتی، کھاتی پیتی، کھیلتی ہزار دانہ تسبیح پر شہرزاد کہانیاں پھرولتی رہی، اگلے دن کی زندگی کی مہلت کے لیے ہر نئی رات پرانی کہانی کو نیا موڑ دیتی رہی، ورنہ تو وہ ماری جاتی۔

عباد نے کہا تھا۔ زری کا پہلا دانت نکلتے ہوئے وہ ضرور دیکھے گا لیکن پہلا دانت نکلنے میں ابھی وقت باقی تھا کہ ایک روز سیریل کھلاتے ہوئے چمچہ زری کے منہ میں ٹھک سے بجا اور اُس کی زبان سے نکلا۔ اس کے منہ میں تو دانت ہے۔ ابھی کل ہی تو چار ماہ کی وہ ہوئی ہے۔ عباد نے فون پر کہا۔ چلیں دانت نکالنے میں تو اس نے جلدی کر دی پر پہلا حرف بولتے ہوئے وہ اُسے ضرور سنے گا۔ عباد نے پہلا حرف سنا، مگر ٹیلی فون پر البتہ اُسے قدم قدم چلتے ہوئے دیکھنے کا دعویٰ یوں پورا ہوا کہ ویڈیو بنا کر اُسے روانہ کی گئی۔

زری بڑی جلد باز نکلی، ہر کام میں افراتفری مچا دی۔ کوئی پلاننگ کامیاب ہی نہ ہونے دے رہی تھی۔ اتنی ہی جلد باز جتنا کہ دھرتی کی کوکھ میں گرا اُس کے وجود کا بیج سریع العمل تھا۔ امینہ نے اُسے بتایا کہ اُس کا باپ دُور دیس میں رہتا ہے اور یہ پیارے پیارے کھلونے اور فراک جو آتے ہیں یہ وہی بھیجتا ہے لیکن اُسے کوئی خاص رغبت ان کھلونوں سے تھی، نہ فراکوں سے اور نہ ہی انجام کے انتظار میں رکی کھڑی اس کہانی کے تجسس سے۔ وہ تو بس کسی امر بیل کی طرح امینہ کے وجود سے لپٹ گئی تھی، جیسے کہتی ہو تم اپنے لیے نہیں رہی۔ بس میرے لیے ہو جب میں تمہارے وجود سے پھوٹی تو تمہارا اپنی ذات پر حق ساقط ہو گیا، میرا اسقاط ہو گیا ہے۔ وہ غسل خانے تک نہ جا سکتی۔ کپڑے نہ بدل سکتی۔ کنگھا نہ کر سکتی۔ امینہ کو اُلجھن ہونے لگتی، یہ بچی جو کسی پیار کی فطری نمو، نہ تھی۔ بلکہ لیڈی ڈاکٹر کے بے رحم نشتروں کی تخلیق تھی۔ وہ جو فائل کی گولیوں پر شمار کیے گئے لمحوں کی تلچھٹ تھی، جو ٹیلی فون پر دی گئی تاریخوں کی ایکس پائیری ڈیٹ تھی۔ وہ اُس کے وجود کے جملہ حقوق پر کسی غاصب حکمران کی طرح قابض ہو گئی تھی۔ دیکھنے، سننے، سوچنے کی ہر حس کو اغوا کر لیا، جیسے ہزاروں ڈیسی بل شور کی چیخ دھاڑ کے ساتھ، کسی بڑے طوفان کی ایمرجنسی کی مانند کسی بڑے مجمع کی بھگدڑ کی طرح، دیکھنے، سننے، سوچنے کی ہر حس کو مفلوج کرتی ہوئی۔

میک اپ کٹ سوکھنے لگی، کپڑوں کی تراش خراش کے فیشن بدلنے لگے، جو یہ سوچ کر نہ پہنے گئے تھے کہ ان پر پہلی نظر عباد کی پڑنی چاہیے۔ امریکن ایمبیسی کی ویٹنگ لسٹ میں اُس کا نمبر آگے بڑھنے

لگا۔ زری کا ایڈمیشن امریکہ کے ایک سکول میں ہو چکا تھا۔ ذاتی فلیٹ خریدا جا چکا تھا۔ گاڑی بک ہو چکی تھی۔ ہزار داستانیں ہزار راتوں میں کہی جاتی رہیں، جو اپنے انجام کے لیے اگلی رات کی کہانی کی منتظر ہوتی تھیں اور اگلی رات پھر کسی نا تمام انجام کے ساتھ اُس سے اگلی رات کے انتظار میں کھڑی ہوتی، لیکن انجام والی کہانی کی باری آنے سے پہلے ہی زری کے سکول جانے کی باری آ گئی، جس کی ننھی سی جان سے ایکٹوبس کی ٹانگوں کی طرح اَن گنت مسائل چمٹ گئے۔ شاید ان ہزاروں نا تمام کہانیوں کا تار اُس کے وجود کی اَتی کو گنجھل بنا گیا تھا۔

سکول میں ٹیچر نے اس کی بجائے کسی اور بچی کے گال پر پپی فیس بنا دیا تھا۔ گویا اُس کا حق چھین کر کسی اور کو دے دیا تھا۔ اُس نے اپنا گال چھیل ڈالا تھا۔ ٹیچر نے کلاس میں کاپیاں تقسیم کرنے کو کسی اور سے کہہ دیا تھا۔ وہ روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اُس کی سہیلی نے کسی اور لڑکی سے بات کر لی تھی۔ اُس نے اپنی کلائی کاٹ کھائی تھی۔ پُرانی کہانی کے ٹھہرے پانیوں میں بلبلے اُٹھتے رہے۔ وہ سکول جا جا کر اُس کی کلاس ٹیچر سے ملتی۔ اُس کے مسائل حل کرنے کی درخواست کرتی، ٹیچر اُلٹا اُسی کو سمجھانے لگتی، جو اس بچی کی مناسب تربیت میں ناکام رہی تھی اور نتیجتاً وہ بہت سے نفسیاتی عوارض کا شکار ہو گئی تھی۔

نفسیاتی امراض کا ڈاکٹر بھی یہی کہتا تھا۔ ''وہ ہر شخص، ہر اعزاز اور ہر متعلقہ چیز کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ اسے شیئر کرنا سکھایئے۔'' دُکھ تو یہ ہے کہ یہاں شیئر کرنے کو کوئی نہ تھا۔ نہ بہن بھائی، نہ باپ۔ نہ ماں کی شراکت، نہ بیٹی کی شراکت۔ نہ دُکھ کی، نہ خوشی کی سانجھ، وجود کی، جذبے کی، لمس کی عدم شراکت، خلا پیدا کرتی ہے جسے طلب کی شدت بھر دیا کرتی ہے اور شدت غیر متوازن ہوا کرتی ہے۔

رات گلے میں پڑی زرّی کی بانہوں کی رسّی اُسے جکڑ لیتی۔ یہ رسیاں پھولتی پھلتی رہیں اور وہ ان کی گرفت کی جکڑن اور پھیلاؤ میں سُوکھتی گئی۔ کبھی دم گھٹنے لگتا تو اس طوق کو اُتار پھینکتی، زرّی رونے لگتی۔ وہ اسے ڈانٹ دیتی، زرّی چیخنے لگتی، پھر اُسے لپٹا لیتی۔ دونوں روتیں، جیسے کسی مَنٹل ہسپتال کے وارڈ میں نئے نئے آئے دو مریض، ایک دوسرے سے لپٹتے، پیار کرتے ہسٹریائی ہنسی ہنستے تو کبھی ایک دوسرے کو نوچتے، زخمی کرتے، جنوں خیز چیخیں مارتے۔ کبھی کوئی اُن کے گھر آ جاتا تو زرّی روٹھ جاتی۔ کبھی وہ بازار جاتی تو واپسی پر زرّی کا منہ پھُولا ہوا ہوتا، جیسے وہ کوئی سخت گیر باپ ہے، جو نوعمر بیٹی کو ہر

نگاہ کی آلودگی سے بچانا چاہتا ہے۔ کوئی عاشق صادق ہے، جسے شہر میں چلتا پھرتا ہر شخص اپنا رقیب نظر آتا ہے۔ یا کوئی شقی القلب شوہر ہے جسے بیوی کی ہر حرکت میں بے وفائی کی بُو آتی ہے۔

اُس کی ٹیچر کہتی تھی، اسے شیئر کرنا سکھاؤ۔ لیکن وہ تو خود شراکت کے لمحے کے انتظار میں برسوں قطرہ قطرہ پگھلتی رہی تھی شاید یہی گھلاؤ زری کے وجود کے بیج کی آبیاری کرتا رہا تھا۔ دوسری رات کی دلہن اس رات کے اشتراکی عمل کے انتظار میں ہزاروں راتوں کا ایندھن بنی گیلی لکڑی کی مانند کڑوا دھواں چھوڑتی رہی، تیرہ برس کی ہر رات کے آتش دان میں سلگتی رہی، ہزار رات کی فصیل سے سر ٹکائے کہانی کے ایک ہی انجام کی منتظر کہ کب اس کا نمبر آئے گا اور اپنی سہاگ کی دوسری رات امریکہ میں گزارے گی۔ شراکت کی یہ بھکا اُس کے وجود میں قحط سالی مچارہی تھی اور جب قحط پڑتا ہے۔ چاہے زمین کے پیٹ میں چاہے انسان کے وجود میں، تو پھر ظلم اور لوبھ اندھیر مچادیا کرتے ہیں، اموات اور بے حسی دوچند ہوجاتے ہیں۔ حرام ماس ہر سُو بکھر جاتا ہے اور چیلیں اور گدھ پاگل ہوجاتے ہیں۔

جب عباد کے ایک قریبی دوست نے دستاویزی ثبوت کے ساتھ تیرہ برس کی ہزاروں راتوں کی کہی ناتمام کہانیوں کا یکبارگی انجام سُنا دیا تو اُس وقت سڑک کنارے پڑی لاوارث لاش تعفن چھوڑتی تھی، پاگل گدھوں کو دعوت دیتی ہوئی کہ آؤ اور مجھے نوچ نوچ پردہ دے دو، جس شخص کی دلہن بنے وہ تیرہ برس کی ہزاروں راتوں میں انہی قدموں کی آہٹ سننے کو گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی رہی۔ وہ وہاں کسی اور عورت اور بچوں کے ہمراہ   تب اُسے رونے کے لیے کسی کندھے کی اشد ضرورت تھی۔ یہ بم دھماکہ کرنے والا ہی اُس کے بدن کے چیتھڑے سمیٹنے والا بن گیا تھا۔ ہمہ گیر بربادی کے بعد بحالی کی سرگرمیوں میں یہ تخریب کار ہی رضا کار بھی تھا۔

"بھابھی! میں آپ کی عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں، جس طرح آپ نے اُس بے وفا اور دغا باز کے انتظار میں اپنی عمر کے خوبصورت سال اُس کے دیپ کی سنگن میں جلائے......"

تباہ حال شخص کو مظلوم کہلانے سے بڑی تسکین ملتی ہے۔ وہ اُسی کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگی۔ اصغر اکثر و بیشتر آنے لگا۔ کبھی زری کے لیے ٹافی ومٹھائی لے کر۔ کبھی اُس کے لیے پھولوں میں سجا امریکہ کا کوئی تحفہ لے کر، زخموں پر پٹی تبدیل ہوتی، مرہم لگتا، پھاہے رکھے جاتے جن کی آسودگی میں زخم پر انگور آنے لگا۔

اس مرد کی نیت اور مردانہ فطرت کو وہ خوب جانتی تھی، لیکن تیرہ برس پرانے آہنی خود کے حبسِ بے جا کے خلاف فطری احتجاج لازمی تھا اور احتجاج اندھا ہو جایا کرتا ہے۔ صندوق کی گھٹن میں رکھے گدیلے کو ہوا لگوانے کی ضرورت تھی، جسے پھپھوندی کھا رہی تھی، جب ایکس پائیری ڈیٹ گزرنے کو ہو تو پھر اس پروڈکٹ کو استعمال ہو جانا چاہیے۔ ورنہ ضائع ہو جائے گا۔ اُسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ زری نے اصغر کی آمد و رفت پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ شاید اُس نے شیئر کرنا سیکھ لیا تھا۔ ڈاکٹر بھی تو یہی کہتا تھا اور ٹیچر بھی کہ اسے خود سے دُور کیجیے اور خود کو اور اسے دوسروں سے مکس اَپ ہونے دیجیے۔ اصغر عموماً شام میں آتا، وہ خوشی خوشی اصغر انکل کے دیئے ہوئے لفافے کھولتی اور کھاتی، تبھی قاری صاحب آ جاتے اور وہ سکارف باندھ کر اور وضو کر کے قرآنِ پاک کی دُہرائی کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جاتی، تب اینہ کو شدت سے یہ احساس ہوتا کہ وہ کسی مرد کی معیت میں اکیلی ہے۔ برسوں انتظار کی ٹکٹکی پہ چڑھی ان تنہا آنکھوں کے ترساؤ میں اصغر جھانکنے کی کوشش کرتا تو وہ نگاہیں چراتی کہ اگر مل گئیں تو گزر چکی ایکس پائیری ڈیٹ صاف پڑھ لی جائے گی اور زائد المیعاد اشیاء کی قیمت نہیں رہا کرتی۔ تب اُسے زری کی احتسابی نگاہوں کا شدت سے انتظار رہتا، وہ اُٹھتی۔

''میں ذرا زری کو تو دیکھوں۔''

''ارے رہنے دو۔''

''پڑھ رہی ہے۔''

اصغر سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتا اور وہ جیسے راکھ کی جھاگ کی مانند وہیں بیٹھ جاتی۔

''پڑھنے دو، قاری صاحب سورہ الرحمٰن کی قرأت سِکھا رہے ہیں۔ یعنی تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ گویا انسان نعمت کی قدر نہیں کرتا۔ اگر کرتا ہے تو اُسے کھو دینے کے بعد۔''

اصغر قدرِ نعمت بعد از زوال کے فلسفے پر بولتا۔ اینہ سنتی اور سَر دھنتی جب دل کے زخموں کا شمار راز داں کو سونپ دیا جائے۔ تو پھر ہر چرکا، منہ کھول دیتا ہے، جس کی دُکھن بڑی آسودگی دیتی ہے، وہ ایک ایک آبلے میں چھپے خار کو ہمدردی کی سوزن سے پھرولنے لگی۔ ان کمزور لمحوں میں راز دان کی قربت میں وقت اپنی کمیت کھو دیتا، جب وقت اپنی کمیت گم کر دے تو ذہن اور وجود کاغذ کی ہلکی پھلکی ناؤ کی مانند ہمدردی کے کشادہ تلاؤ میں بنا کسی ارادے اور کوشش کے بہنے لگتا ہے۔

وہ تو دوسری رات کی دلہن تھی۔ اس دلہن کی پہلی اور دوسری رات کے بیچ تیرہ برسوں کی ہزاروں راتوں کا ہجر موسم پھیلا تھا۔ ان ہزاروں راتوں کے دیپ میں سلگتی یہ شہزاد ہر رات کے دُکھ کی داستان کہنا چاہتی تھی۔ سننے والا سُن رہا تھا۔ بنا کسی بے صبری اور اُکتاہٹ کے، خاموش لبوں کی گویائی میں وہ سناتی رہی۔ ولیمے کی تقریب سے اُٹھ کر عباد کا چلے جانا تیرہ برس میں ہزاروں بار امریکہ کے لیے کی گئی پیکنگ کی کہانی پھر تخلیق کے سنگین عمل کی تلچھٹ کی کہانی، کنواری ماں کے دکھ کی کہانی جتنی تعداد ان دنوں کی تھی، اتنی ہی محرومیوں کی کہانیاں اور پھر ان ہزاروں راتوں میں اس بند کمبل کے پیکٹ کے محور پر گھومتی ترسی نگاہوں کی مزید کہانیاں، تبھی اصغر نے بڑھ کر کمبل والا پیکٹ الماری کے اُوپر لے خانے سے باہر کھینچا، تیرہ برس کی جمی ہوئی دھول اُڑی اور آنکھوں میں اَٹ گئی، اَن گنت رائیگاں شاموں کی سیاہی کمرے کو لبالب بھر گئی۔ ہزاروں دنوں کی کہی نامکمل کہانی کو المیہ انجام دینے والا اِک نئی کہانی کے آغاز کا سرا پکڑ بیٹھا۔ کہانی شعلے کی بھڑک لیتی اپنی منتہا کو پہنچی، یہ نقط ''انتہا'' اتنا مختصر کیوں ہوا کرتا ہے۔ برق کوندے کی سرعت سے نئی کہانی اپنے عروج کی ہانپ کانپ سے زوال کی رائیگانی کی سمت بہی تو وقت اپنی کیت بحال کرنے لگا، اور ازیل گھوڑا بے قابو ہو گیا، بے وزن ناؤ اپنے بہاؤ کے لیے ارادہ اور کوشش مانگنے لگی، کمبل کی گرمی میں جون کی تپتی دوپہر گھس آئی۔ وہ پسینے میں شرابور نکل کر بھاگی۔

''زری۔''

قرأت کی آواز بند دروازے پر دستکیں دے دے کر نجانے کب سے خاموش ہو چکی تھی۔

زری جیسے دم لینے کو صوفے پر قاری صاحب سے چپک کر بیٹھی تھی اور اُس کے ہاتھ قاری صاحب کے ہاتھوں میں تھے، جیسے نازک سا کوئی پھول کسی عفریت کے شکنجے میں، جیسے دستکیں دیتے دیتے، ہاتھ اور حوصلے دونوں چور ہو گئے ہوں، کہانی کے رائیگاں انجام کی تمام تر کراہت امینہ کے حلق سے دھاڑی۔

''زری''

جس رفتار سے قاری صاحب باہر نکلے، اُسی رفتار سے زری نے دوسرے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی چڑھا لی۔ اسی رفتار سے اصغر اُس کی دھاڑ سے گھبرا کر بھاگا آیا۔

''کیا ہوا کیا ہوا؟''

پسینہ اُگلتے بدن کے تمام مسام ہانپتے تھے۔

زیاں کار کی پشیمانی جنوں ہو جایا کرتی ہے۔ کسی جنات زدہ انسان کی سی طاقت سے اُس نے اصغر کو دروازے کے باہر دھکیلا، اور اُس کے حیرت زدہ منہ پر جب اُس نے تڑاخ سے دروازہ بند کیا، تو اُس کے اپنے چہرے پر کئی بند کواڑوں کی دستکیں بجیں۔

تخلیق کے نو مہینے جس پیاس کے صحرا کی آبلہ پائی میں گزرے، شاید وہی زری کے خمیر میں گندھ گیا تھا۔ سانجھ کا دُکھ اُس کے وجود میں پلتے پلتے زہر بن گیا تھا، جیسے ٹھہرے پانی کا تعفن، باسی غذا کی سڑاند، جمے ہوئے پتھر کی کائی، تیرہ برس کی تنہا راتوں کے زہر کی نیلاہٹ، سب کچھ اس ایک وجود میں کھرل ہو گیا تھا۔

تعفن خوشبو کی بھوک ہے، سڑاند تازگی کی بھوک ہے۔ انجماد لمس کی بھوک ہے اور بھوک ظالم ہوتی ہے۔ سب کنکر پتھر نگل جاتی ہے اور وحشی ہو جاتی ہے جیسے زری...... نہیں نگل سکتی تو مر جاتی ہے۔ جیسے وہ خود...... وہ کمبل کی بوسیدہ متعفن لاش کو گھسیٹتے ہوئے باہر لائی اور جب اُس میں سے گھٹ گھٹ کر نکلتا دُھواں پورے گھر میں دیواریں بنا گیا۔ زری کا دم کمرے میں گھٹنے لگا تو وہ دھوئیں کے کثیف بادلوں میں سسکتی کھانستی امینہ کے گلے سے لپٹ گئی۔

''ماما! ہمارے درمیان کوئی تیسرا نہیں آ سکتا، کبھی نہیں آ سکتا۔''

دوسری رات کی دلہن کی اُجڑی مانگ میں کثیف کاربن کے ہزاروں ذرات بھر گئے تھے۔ ہزار رات کی ادھوری کہانیاں اپنے اَن کہے انجام کی لحد پر گنگ تھیں۔ انتظار کے بجھے دیپ کمبل کے خالی بے نُور آنکھ جیسے طاق میں دھرے تھے، جس کی سلگتی ہوئی لاش دونوں ماں بیٹی کے بیچ ڈھیر تھی۔

مظفر آباد سے ایک خط

اچھی آپی! میرا یہ غیر روایتی خط دیکھ کر تم پریشان تو ہوگی کہ تمہاری یہ بہن جونئر نویسی کے مختلف مقابلوں میں ہمیشہ اوّل رہا کرتی تھی۔ کیا وہ خط لکھنے کے اصول و قواعد سے بھی نا آشنا ہوگئی لیکن آپی! تمہیں یہ بھی معلوم ہے نا کہ ازبر اصول و قواعد کن حالات میں بھول جایا کرتے ہیں اور ذہن کی سلیٹ کب خالی ہوکر اندھیرے کے گھپ سمندر میں تیرنے لگتی ہے ہاں اک تارہ سا جھلملایا تو ہے، مجھے یاد آیا کہ خط کا آغاز۔

ازمظفر آباد

لکھ کر کرنا چاہیے تھا لیکن آپی اگر تم دیکھ سکو تو شاید تمہارے بھی دماغ کی سلیٹ ایسے ہی تڑخ کر گھپ اندھیرے میں اُتر جائے، جیسے یہاں کے سارے گھر، سکول، ہسپتال، بینک، بازار سب اپنی ہی بنیادوں کی تاریکیوں میں اُتر گئے ہیں۔ درودیوار باغ باغیچے سب ایسے ہی کرچی کرچی ہو ڈھیر ہوئے ہیں جیسے خود میری یادداشت سوچ اور قالب میں بھرا سب کچھ ریزہ ریزہ ہوکر بہت اندر کہیں ملبہ ہوگیا ہے۔ تو کیا خط کا آغاز ازمظفر برباد لکھ کر کروں۔ میرے دماغ کی سلیٹ پر پھر کچھ آڑی ترچھی لکیریں سی اُبھری ہیں۔ ہاں میں نے خط کی پیشانی پر تاریخ بھی تو نہیں درج کی لیکن زمیں برد بستیوں پر تو ایک ہی تاریخ درج ہوا کرتی ہے۔ ہڑپہ، موہنجوداڑو، بابل و نینوا، تہذیب مصر...... سب پر بس غرقابی کی تاریخ ہی

لکھی رہ جاتی ہے اور یہاں اس مرحوم بستی کی لحد پر، دماغوں کے کھنڈروں پر اور قالب کے ملبوں پر بھی بس ایک ہی تاریخ درج رہ گئی۔

8/ اکتوبر

اور اب یہاں سے جو بھی لکھا جائے گا اُس پر یہی تاریخ درج ہو گی کیونکہ سورج کی گردش اور اذہان کا محور آٹھ اکتوبر ہو گیا ہے اور یہاں کی ہر شئے کا انہدام اور سب گھڑیوں کا وقت اسی تاریخ کے آٹھ بج کر پچاس منٹ پر ٹھہر گیا ہے۔ آپی! خدا کرے کہ تم خیریت سے ہو۔ اپنی خیریت میں کیا لکھوں کہ ہمارا حال یہ زمین خود بیان کرتی ہے۔ عجب تماشہ ہوا آپی! بولنے والی زبانیں کچلی گئی ہیں اور نہ بولنے والی اس زمین کے زبان نکل آئی ہے اور یہ ایک ہی بولی بولنے لگی ہے، جس کے الفاظ کے ملبوں میں سے کھنڈر معانی نکلتے ہیں، جب سے اس کا تمیں کلومیٹر لمبا اور چوڑا دھانہ کھلا ہے اور جو کچھ سما سکا نگل گئی ہے۔ تب سے یہ بولتی ہے اور جو کچھ نگل چکی ہے اُس کی مہک چھوڑنے لگی ہے۔ اس کے نگلے ہوئے اَن گنت نوالوں کی مہک بھی ایک جیسی ہے۔ اسی میں کہیں ناصر کی مہک بھی ملی ہے۔ آپی! تمہیں ناصر بہت پسند تھا نا، تمہیں کیا خاندان کی ہر لڑکی کو اس کی کوئی نہ کوئی خصوصیت پسند آ جاتی تھی۔ تمہیں اس کی سنجیدگی پسند تھی تو رابعہ کو اس کی حسِ مزاح اور مریم اُس کی سمت دیکھتے ہوئے لرزتی تھی کہ ناصر کی آنکھوں میں کوئی ایسی چیز ہے جو اپنی سمت کھینچے لے جاتی ہے، پر ناصر کو تو مَیں پسند آئی تھی اور مجھے اُس کی گفتگو کا ٹھہراؤ پسند تھا۔ ناصر نے جب میرا انتخاب کیا، تو سب مجھے ایسے دیکھنے لگے تھے، جیسے اچانک میرے دائیں بائیں پَر نکل آئے ہوں، اور مَیں ابھی اُڑنے لگوں گی۔ آپی اس مٹی کی سرشت بھی عجب اندھی بہری ہے۔ بس منہ کھول دیتی ہے۔ یہ دیکھے سوچے بنا کہ اس کا نوالہ بننے والا کیا اسی سلوک کا مستحق تھا جو اس کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اگر یہ کھا سکتی ہے بول سکتی ہے تو پھر اس کو جس تمیز بھی ہونی چاہیے۔

آپی سنو! ناصر اسی پھٹکی ہوئی مٹی کی پتہ نہیں کس داڑھ کی کس کھوڑ میں اُتر گیا ہے۔ آپی! تمہارے دل کی دھڑکن کی آواز مَیں نے ری ایکٹر سکیل پر 8.7 سنی ہے اور تمہارے سارے وجود کا ملبہ اپنے ہی قدموں میں گرنے کا منظر تصور کی آنکھ سے دیکھ لیا ہے۔ ایسا ہی ملبہ جیسا آپی اس فیلڈ ہسپتال کے سامنے سے ہٹایا جا رہا ہے۔ مَیں اپنے بستر سے اکثر باہر دیکھتی رہتی ہوں۔ بلڈوزروں کے

منہ میں چڑھتے اُترتے ہوئے انسان ہاں جو کبھی انسان ہی تو تھے۔ کوئی کُرسی پر بیٹھا ہوا، کوئی کھڑا ہوا، کوئی بھاگنے کے انداز میں قدم اُٹھائے ہوئے۔ کوئی نوالہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے۔ مَیں دیکھتی رہتی ہوں۔ شاید ناصر بھی کہیں ــ لیکن پہچانا تھوڑی جائے گا۔ زمین کی سرشت کی طرح یہ ڈھانچے بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ساری شناخت نگل جاتے ہیں۔

آپی! جب زمین نے غرا کر کانپنا شروع کیا تو ناصر دفتر جانے کو گھر سے نکل چکا تھا۔ اُسے زمین کی غراہٹ سُن کر واپس نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ بھاگ کر واپس آیا اور اپنے ہی گھٹنوں پر گرتی ہوئی دیواروں میں سے مجھے باہر کھینچا تھا۔ تو میری گودی میں سے مُنا پھسل کر اندر ہی گر گیا تھا، وہ منے کو اُٹھانے جھکتی ہوئی چھت تلے گھسا اور پھر باہر نہ نکلا۔ البتہ اُس کے دونوں ہاتھ ہموار ہوتی چھت سے باہر تھے، جنہیں وہ تیزی سے ہلا رہا تھا، جیسے ہاتھ نہیں باہر لٹکی ہوئی زبانیں ہوں جو چلا رہی ہوں۔ مَیں ابھی زندہ ہوں میرے اُوپر پڑے چھتوں اور ستونوں کے ملبوں کو ہٹاؤ میں باہر نکلنا چاہتا ہوں، مَیں زندہ ہوں۔ تم اندازہ کر سکتی ہو آپی! کہ ناصر نے زندگی ڈھونڈنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔ وہ کہ جو زندگی کے سمندر کی پُرخروش لہر تھا۔ بحر الموت میں دن بھر اُس کے تڑپتے ہوئے ہاتھوں پر جب رات اُتری تو ان کی تڑپ بتدریج سست پڑ گئی تھی۔ مَیں چیختی رہی ارے کوئی تو آئے۔ زندگی تلاشتے ان ہاتھوں کو موت کے جبڑوں سے نکالنے کو کوئی تو آئے۔ پر کوئی کیسے آتا کہ ہر ملبے کے ڈھیر پر ایسی ہی مدد کی پکاریں تھیں، لیکن مدد کہیں نہ تھی۔ ملبوں تلے سے اُبھرتی زندگی کی نزعی چیخ و پکار پر شام اُتر رہی تھی۔ حلق دھول سے اٹ گئے تھے۔ دماغ اور وجود کی مختلف سطحیں چیخ چیخ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ چیخیں اور فریادیں اب سسکیوں اور کراہوں میں معدوم ہو رہی تھیں۔ گھپ اندھیرے کی خوفناک چاپ موت کے قدموں سے قدم ملا کر ساری بربادبستی پر آزادانہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ اس ظالم فاتح کے موت علم تلے سب پسپا ہو رہے تھے لیکن ناصر کے ہاتھ ابھی حرکت کرتے تھے مزید دو روز تک وہ پتھریلی سلیں ہٹانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ دوسری رات جب وہ حرکت کرتے ہاتھ سیاہ پڑ کر ساکت ہو گئے اور گلتے ہوئے گوشت کی بُو متحرک ہو کر بربادبستی پر اُبکائیاں تھوکنے لگی تو مَیں انہیں ہلانے کی کوشش کرتی رہی، چیختی رہی ناصر ہاتھ ہلاؤ۔ ناصر پلیز ہاتھ چلاؤ۔ شاید کل کوئی آئے ــ شاید کوئی کرین، کوئی بلڈوزر، کوئی مدد...... مگر اُس نے میری ایک نہ سنی۔ آپی کیا تم تصور کر سکتی ہو کہ ناصر نے میری بات کا جواب تک نہ دیا۔ تب میرے دماغ کی

چیختی سلیٹ پر ایک ادھوری سی لہر اُبھری۔ مُنّا...... منے کو تو باہر جھولتے ہوئے ان ہاتھوں نے میری گود میں پٹخ دیا تھا۔ پھر مُنّا...... مُنّا...... مُنّا...... میری چیخیں کھنڈر بستیوں میں گونجتی رہیں لیکن یہاں جواب دینے والا کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ شاید سب مَر گئے تھے...... یا مَر رہے تھے۔ تب مَیں ساری برباد بستی میں گھومی۔ مُنّا مُنّا چلائی کہ میرے دماغ کی سیاہ سلیٹ پر بس یہی ایک لہر زندہ بچی تھی اور جب سے اس فیلڈ ہسپتال میں میرے اندر رُکتی ٹھہرتی زندگی کو پھر سے رواں کر دیا گیا ہے تو مَیں ہر ڈاکٹر، ہر نرس سے پوچھتی ہوں۔ مُنّا کہاں ہے۔ وہ مجھے کئی مُنّے لا لا کر دکھاتے ہیں۔ مَیں دیکھتی ہوں اور کہتی ہوں یہ مُنّے جیسا ہے مگر مُنّا تو نہیں۔ ابھی ابھی نرس مجھے جو مُنّا دکھا کر گئی ہے۔ اُسے دیکھ کر مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ مُنّا نہیں تھا۔ مُنّا تو اتنی تکلیف برداشت ہی نہ کر پاتا۔ کتنا گول مول، گورا گورا بازو تھا اس کا جس کے ساتھ کا دوسرا بازو نہ رہا تھا اور جب یہ مُنّا درد سے چیختا ہے تو اُسے دلاسہ دینے والی بس یہ نرس ہے جو کبھی موجود ہوتی ہے تو کبھی کسی دوسرے مُنّے کی کَٹی ہوئی ٹانگ کی پٹی تبدیل کر رہی ہوتی ہے۔ تب میرے دل میں بڑا سفاکانہ سا خیال گزرتا ہے۔ یہ سارے منے دوسرے بے شمار منوں کی طرح اپنی ماؤں کے سینوں سے چمٹے اپنے گھروں کے ملبوں کی تاریکیوں میں ہی کہیں گم ہو جاتے! ایسی روشنی کا کیا فائدہ جو بینائی چھین لے یہ خود غرضانہ سوچ اُس وقت شدت اختیار کر جاتی ہے جب مَیں بستر پر پڑے پڑے سامنے والے کیمپ کے باہر خوراک تقسیم ہونے کا منظر صبح و شام دیکھتی ہوں تو شکر ادا کرتی ہوں کہ ان لائنوں میں لگے ہوؤں میں ناصر شامل نہیں ہے۔ یہ بھک منگے اپنے برباد گھروں کے ملبوں میں سے جھانکتے کتنے ہاتھ کتنے چہرے، ٹانگیں اور بازو وہیں چھوڑ کر صرف پیٹ کا بوجھ اُٹھائے یہاں آ گئے ہیں اور اتنی سی خوراک کے لیے بدست و گریباں ہیں، جو اِن کے دسترخوانوں پر بچ رہتی تھی اور ہڈیوں کے ہمراہ آوارہ بلی کتوں کے سامنے پھینک دی جاتی تھی۔ اب انہیں زیادہ بھوک کیوں لگنے لگی ہے، شاید منہدم چھتوں تلے دفن زندہ تعفن انہیں زندگی کا زیادہ حریص بنا گیا ہے اور حرصِ جاں عزتِ نفس اور غیرت کے احساس کو ایسے ہی کھا گیا ہے جیسے یہ تڑخی ہوئی زمین ساری بستیوں کے در و دیوار کو اُن کے مکینوں سمیت نگل گئی ہے۔ موت جس قدر خود غرض اور سفاک ہوتی ہے، غمِ زندگی بھی ایسا ہی خود غرض اور بے رحم ہو جاتا ہے۔ اس موت دیو نے چادر اور چار دیواریاں ہی نہیں نگلیں منہ اور پیٹ بھی ایسے ہی ننگے کر دیئے ہیں، جیسے بُو مارتے لاشے برہنہ کر کر ہر سُو بکھیر دیئے ہیں۔ موت کی افراط زندگی کی حرص بڑھا

دیتی ہے۔ رسد کی قلت طلب کی کثرت ہوا کرتی ہے۔

ٹھہرو آپی! مجھے مُنّے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ پر اُٹھ کر کیسے دیکھوں کہ میری ٹانگ تو خود پلاسٹر میں بندھی ہوئی ہے۔ پر اللہ نہ کرے کہ یہ مُنّا ہو۔ اس کا تو گنگرین بنا بازو کاٹا جا رہا ہے، کٹا ہوا حصہ ابھی تڑپ رہا ہے بالکل مُنّے کے بازو ایسا جس کی کلائی میں تین سلوٹیں پڑی ہیں گوشت میں دھنسی ہوئی موٹی موٹی لکیریں جو بے اختیار چُوم لینے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ بازو سامنے ہی تو کٹا پڑا ہے۔ یہاں کچھ بھی تو چھپا نہیں رہا۔ زمین کی غصیلی کروٹ نے سب پردے اُتار پھینکے ہیں۔ آپریشن، ہسپتال، لاشے، بھوک، زندگی سب کچھ برہنہ سَر ہے۔ چادروں اور برقعوں والیاں جب ننگے سَر پیر ٹرکوں اور ہیلی کاپٹروں کی سمت بھاگتی ہیں تو میری زخمی ٹانگ سے لہو لگاتار بہنے لگتا ہے اور میرے ساتھ والے بستر پر آنکھوں پہ چڑھی پٹی والی زرینہ پر مجھے رشک آتا ہے کہ اگر وہ دیکھ سکتی تو شاید اس منظر کی تاب نہ لا کر آپ ہی اندھی ہو جاتی کہ اُس کی بوڑھی ماں اور شوہر خوراک کے تھیلے پر جھپٹتے ہوئے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ شاید اچھا ہی ہوا کہ اب وہ کبھی کچھ نہ دیکھ سکے گی اس فیلڈ ہسپتال کے پچھواڑے والے سکول کے کھنڈر کو بھی نہیں دیکھ سکے گی، جس کے ملبے پر اُس کی گڑیا کا بستہ اور ایک بوٹ پڑا ہوا کئی روز سے میں دیکھ رہی ہوں البتہ اُس کی یادداشت کی سلیٹ ابھی مکمل سیاہ نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ باہر کچھ نہ دیکھنے کی وجہ سے اندر کو دیکھنے لگی ہے۔ تبھی تو کل اُس نے یاد دلایا تو حیرت سے مَیں ملبہ سی رہ گئی کہ گڑیا کا تو مَیں نے پتہ ہی نہیں کیا اور میرے دماغ کی سیاہ سلیٹ پر پھر ایک دھبہ سا جھلملایا۔ آٹھ اکتوبر کی صبح ہی تو مَیں نے سُرخ ربن ڈال کر اُس کے دو چوٹیاں گوندھی تھیں، جو اُس کے قد کے برابر جھولتی تھیں۔ اُس کے گلے میں سکول بیگ لٹکایا تھا اور اُس کے ماتھے پر جو بوسہ دیا تھا۔ اُس کا لمس اپنی پوری مٹھاس کے ساتھ یکدم میرے لبوں پر تازہ ہو گیا تھا۔ آپی تمہیں یاد ہے نا وہ بالکل تمہاری ہم شکل تھی اور جو فراک تم نے اُس کے لیے سی کر بھیجے تھے۔ ابھی تو اُس نے وہ پہنے ہی نہ تھے وہ تو سکول یونیفارم میں ہی کہیں کھوگئی کہاں کھوگئی۔ زرینہ نے مجھے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا آپی تم حیران ہو رہی ہوگی کہ ماں اپنے بچے کو ہی بھول جائے یہاں ایسا عام ہے۔ موت اور معذوری، کھنڈر اور ملبے، بھوک اور بے بسی، یتیمی اور بیوگی...... جو چیز عام چلن ہو جائے، وہ واقعہ نہیں رہا کرتی، جب سے ذہن اور یادداشتیں معطل ہو چکی ہیں، ماؤں کو بھولے ہوئے بچے آہستہ آہستہ یاد آ رہے ہیں۔ شاید چار تھے کہ پانچ، کتنے سکول

گئے تھے کتنے گھر میں ہی...... مائیں جب خیراتی ٹرکوں سے ملنے والی خوراک کی چھینا جھپٹی سے اپنا پیٹ بھر لیتی ہیں تو پھر بچوں کے حصے کے لفافے اُٹھائے اُنہیں ڈھونڈنے نکلتی ہیں تو بھکارنیں معلوم ہوتی ہیں، جو بھیک کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی ہیں۔ خوراک کی بھیک بچوں کی بھیک، وہ سکولوں کے کھنڈروں میں بکھرے جوتے اور بستے، کتابیں اور کاپیاں اکٹھی کرتی ہیں، جیسے کچرے کے ڈھیر پھرولتی چمارنیں...... کپڑوں کی دھجیاں اور اُن میں پھنسے اعضاء پہچانتی ہیں۔ کبھی روتی ہیں کبھی ہنستی ہیں۔ پیروں میں پھنسے بوٹوں کو چُومتی ہیں۔ خشک آنکھوں سے روتی ہیں اور بنا لفظوں کے بین ڈالتی ہیں کہ صفِ ماتم تو پُرسے کے لیے آنے والوں کے واسطے بچھتی ہے۔ یہاں برہنہ لاشوں پر رونے والا بچا ہی کون ہے جو بچے ہیں اُن کے آنسو اُنہی کے گھروں کے سنگی ملبوں کو بھگوتے بھگوتے خشک ہو گئے ہیں۔ بینوں کے حرف اُن کے بچوں کی کتابوں کاپیوں میں لکھے حرفوں کو بھگو کر سُوکھ گئے ہیں، جنہیں پڑھنے والوں کو شاید ابھی تک چھٹی نہیں ملی۔ آپی! ان بکھرے ہوئے کالے بوٹوں میں مجھے گُڑیا کے بوٹ نظر آ رہے ہیں جنہیں مَیں نے خود اُس صبح پالش کیا تھا لیکن اس کے ساتھ کا دوسرا بُوٹ کہیں نظر سے اوجھل ہو گیا ہے لیکن یہاں تو اَن گنت بوٹ بکھرے پڑے ہیں، کُچھ ابھی تک پیروں میں پھنسے ہوئے ہیں، جیسے یہ پَیر بھاگنے کو تیار ہوں کہ چھٹی کی گھنٹی بجے اور وہی سب سے پہلے گیٹ سے باہر نکل کر بھاگیں...... مائیں اُنہیں گھر لے جانے کو انتظار میں تا دیر کھڑی رہتی ہیں۔ اَن گنت ملبوں تلے بے شمار ہاتھ پَیر جھانکتے ہوئے جیسے کہتے ہوں ہمیں اب کبھی چھٹی نہ ملے گی۔ ان کی شناخت سکولوں کے ان ملبوں نے نگل لی ہے یہ شریر بچے گھر چلنے کو آمادہ ہی نہیں ہو رہے ہیں۔ شاید ریڈی گو کھیلتے ہوئے کہیں دُور نکل گئے ہیں۔ شاید گڑیا بھی اُن کے ساتھ ہی ہے یا اندر کہیں شٹاپو کھیل رہی ہے۔ مَیں اُسے لے کر جاؤں گی بھی کہاں، گھر کے کھنڈر تلے سے ناصر کے دونوں ہاتھ باہر لٹکتے ہیں، جن کی جلد سیاہ غبارے کی مانند پھول رہی تھی کہ ملبوں تلے سے ایسے ہی اَن گنت ہاتھ پَیر جھانکتے ہیں جن سے اُٹھتی مہک بھی ایک جیسی ہے۔ بوٹوں والے پَیر بھی ایک جیسے ہیں۔ پیٹ پیٹ پُکارتی خیراتی خوراک پر یلغار کرتی زخمی جسموں والی مائیں بھی ایک جیسی ہیں، اور گھروں اور سکولوں کے کھنڈروں میں منے اور گڑیاں تلاش کرتی مائیں اور بہنیں بھی ایک جیسی ہیں۔

آپی یہاں سب کچھ ایک چہرہ ہو گیا ہے۔ زمین ایک سی، گھر، سکول، ہسپتال ایک سے

کھنڈر...... گلتے ہوئے گوشت کی بُو بھی ایک سی، بچ رہنے والوں کی بھوک کی شدت بھی ایک سی، ایک سی لحدیں اور لاشے ایک سے......

آپی تمہیں یاد ہوگا ایک بار ہم سب مل کر (ناصر بھی تھا) کوئی کھنڈرات دیکھنے گئے تھے، جہاں مختلف تختیاں لگی ہوئی تھیں، جنہیں دیکھ کر ہم خوب ہنسے تھے۔ ادھوری دیوار کے ساتھ محل کی تختی تھی کسی معدوم ہوتی بنیاد پر منڈی کی تختی لگی تھی۔ کہیں زیرِ زمین گم ہوتے ہوئے نشانات پر عبادت گاہ لکھا تھا۔ ہم خوب ہنسے تھے جیسے ہم کوئی جگت بازی دیکھ رہے ہوں۔ یہ بھی کیا شہر ویران تھا، جہاں آبادی کے سائن لگا دیئے گئے تھے، جیسے زبردستی منوا رہے ہوں کہ مانو کہ یہاں کبھی کچھ آباد بھی تھا، جن کے معدوم ہوتے آثار زمین کے سینے سے چمٹے تھے...... یہ زمین بھی کتنی سنگ دل اور سخت جان ہے۔

آپی ٹھہرو ذرا مجھے پھر مُنّے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ یہ سارے کٹے پھٹے جسموں والے منّے روتے بھی تو ایک جیسے ہیں...... اچھا آپی اب خط ختم کرتی ہوں مَیں ذرا اُٹھ کر دیکھوں شاید...... لیکن یہ سبز ماسک چڑھائے اور سفید دستانے پہنے یہ سب میرے بستر کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں۔ ساتھ میں ٹرالی گھسیٹتی ہوئی وہ نرس بھی ہے جو مجھے کئی روز سے یہ یقین دلا رہی ہے کہ میری زخمی ٹانگ بنا کاٹے ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ اُس کی دھیمی مسکراہٹ کبھی جھوٹ نہیں بولتی لیکن وہ نشتروں سے بھری ٹرالی گھسیٹتی میرے بستر کی سمت کیوں بڑھ رہی ہے...... پتہ نہیں کیوں...... یہ تو اگلے خط میں ہی لکھوں گی۔ آپی یہ لوگ میرے بستر کے پاس آ کر رُک گئے ہیں۔ اب تو خط کو روایتی انداز سے ختم کرنے کا وقت بھی نہیں بچا......

ٹرانسپلانٹیشن

ٹیلی فون کی گھنٹی بج بج کر پوری ختم ہوگئی، ہاتھ گھنٹی کے مقناطیس کی سمت کھنچتا اور بڑبڑاہٹ بازو کی ڈھیلی لگام کھینچ لیتی۔

''آج آئی ہے میری یاد...... تین مہینوں کے بعد...... ہوگا نا کوئی مطلب...... بجاتے رہو...... مَیں بھی نہیں اُٹھاتی...... بجاتے رہو......''

گردن مورنی سی تنتی، ٹیلی فون پر اُبھرآنے والے نمبروں پر نگاہ سے چھنتا نور سا ٹپکتا بدن کے سرچشموں سے کوئی ملائم سا جھاگ پھوٹتا اور پوری جلد کو لپیٹ لیتا، نرم گرم، لیکن جب بیل بج بج کر ختم ہو گئی تو دوبارہ بجنے کے انتظار میں بدن پر اُگ آئی ملائم سی فرکھردرے گھاس میں تبدیل ہونے لگی، لیکن فون دوبارہ نہ بجا۔ بے مائیگی کے احساس نے پچھتاوے کے کندھے سے سر ٹکا کر بین کیا۔

''مہینوں بعد ہی سہی فون تو اُسی کی جانب سے آیا تھا نا۔''

خواہش کی شدت اور بے توقیری کی ذلت کا ساتھ اتنا قریب کیوں ہوتا ہے۔ اگر تین مہینے خواہش کی لاش انتظار کی سولی سے لٹکی رہ سکتی ہے تو اب بھی...... وہ فیصلے کی راکھ کو اَنا کی گرہ میں باندھ کر اُٹھی لیکن ہاتھ غلطی سے ٹیلی فون ریسیور پر پڑا۔ جوابی آواز میں فتح مندی میں گھلا غصہ حکم حاکم کی طرح باجواز تھا۔

''فون کیوں نہیں اُٹھا رہی تھی۔''

ہزاروں گلوں، شکووں اور بے اعتنائیوں کے دفاعی ہتھیار اس پہلے جملے کے حملے نے ہی پسپا کر دیئے۔ وہ معذرتیں کرنے لگی

''تمہیں کچھ معلوم ہے۔ امی بیمار ہیں اور مَیں کس قدر پریشانی کا شکار ہوں۔''

احساسِ جرم ضمیر کے ہراس میں گھلا اور زبان دانتوں تلے بَل کھا گئی۔ فردِ جرم جاری ہوئی۔

''تم نے تو فون تک کی بچت کی اور یہاں سب کچھ بک گیا۔ آج کی دوائی تک کے پیسے نہیں بچے ہیں میرے پاس......''

مجرم کی پشیمانی چہرے کے عضلات کی طرح دماغ کے خلیوں کو ڈھیلا چھوڑ گئی۔ اس نقصان کی ذمہ دار وہی تو تھی اور اب اس کی تلافی ہی جرم کا کفایہ تھی۔

''مَیں ابھی آ رہا ہوں جتنا بینک بیلنس ہے۔ چیک بنا کر رکھ چھوڑو۔''

وہ منہ میں بلبلاتا ہوا اقبالی بیان بند فون کے ریسیور پر اُگل کر چیک لکھنے لگی۔

وہ آیا، چیک پکڑا اور یوں چلا جیسے امی جان کے لیے یہی خون کی بوتل پکڑنے ہی تو آیا ہو۔ وہ پوچھتی رہ گئی ''کس ہسپتال میں...... کس کمرے میں؟''

جو بات اُسے کہیں بہت اندر سے اور بہت قطعیت سے معلوم تھی اور جس کی تصدیق وہ نہ چاہتی تھی کہ یہ جو اندر کوئی لڑکی سی مچلتی اور کھیلتی ہے۔ اُس کا یہ پتولا مسک گیا تو پھر وہ بہت روئے گی لیکن تصدیق ہو ہی گئی...... امی نہ صرف گھر پر تھیں بلکہ کچھ ایسی بیمار بھی نہ تھیں۔ تب فرحت ہنسنے اور رونے کی درمیانی کیفیت میں خواہش کی سولی پر ذلت کی ٹکٹکی سے لٹکی رہ گئی اور ٹوٹے پھوٹے پتولے کی دھجیاں پھر سے جوڑنے لگی کہ وہ اُس کی اس قسم کی شرارتوں کی عادی تھی، جب وہ اُس کی پہلی شرارت کا شکار ہو گئی تو پھر اُس کی شرارتوں کے رحم و کرم پر ہنسنے اور رونے لگی وہ اُس کی پہلی شرارت تھی، جب اُس نے فرحت سے اظہارِ محبت کیا اور پچھلے کئی برسوں کی خاموش پرستش کا واسطہ دے کر منگنی کے درپے ہو گیا۔ فرحت پہلے ہنسی، پھر حیران ہوئی، پھر پریشان اور آخرکار سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔ عورت کا محبت میں سنجیدہ ہو جانا نسوانیت کی بے بسی کا عنوان ہوا کرتا ہے اور مرد کا اظہارِ محبت کسی رومانوی شرارت کی سازش۔ پہلے تو کئی روز ہنس ہنس کر اس شرارت کا وہ مذاق اُڑاتی رہی تھی۔

"عاشق صاحب! کیا آپ رزلٹ کے آنے تک کا وقت عشق عشق کھیلنے کی بجائے نیٹ وغیرہ کھیل کر نہیں گزار سکتے۔" لیکن جب واحد نے ٹیلی فون بجا بجا کر گھر والوں کو بھی متوجہ کر لیا تب وہ پریشان ہوئی اور اُسے بڑی بہن کا مقام یاد دلایا۔

"چھوٹے بھائی! تم بھول رہے ہو کہ عورت اگر مرد سے پانچ چھ برس بڑی ہو تو اُس کی ماں کہلاتی ہے۔"

یہ بھی عجب بات ہے مرد عورت سے ہر لحاظ سے بڑا ہے، عقل میں، علم میں، عمل میں، لیکن عمر میں کبھی بڑا نہیں ہوتا، اور اُس سے کہیں کم عمر کی عورت اُس کے ذہن، فہم اور عمل کا ساتھ دینے کے لیے چنی جاتی ہے۔ جتنی کم عمر ہوگی اُتنی ہی موزوں اور قابلِ احترام اور جتنی بڑی ہوگی اُتنی ہی نامناسب، بے توقیر۔ اس لیے اُس نے واحد کو بڑی بن کر سمجھایا لیکن وہ اتنا سنجیدہ ہوا کہ یکدم اپنی عمر کے کئی برس پھاند کر اُس کے برابر آ گیا۔ بلکہ کچھ بڑا بڑا سا دکھائی دینے لگا۔ یوں کہ سب گھر والوں کو فرحت کا ہم کفو معلوم ہونے لگا، جو پانچ برس سے مقامی کالج میں پڑھا رہی تھی لیکن اب تک آنے والے تمام رشتوں میں سے کوئی بھی اس قدر مناسب کفو نہ تھا، جس قدر کہ واحد...... جس روز فرحت کا باقاعدہ رشتہ مانگنے کے لیے واحد کے گھر والوں نے آنا تھا۔ اُسی روز واحد کی امی جان کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ یوں رشتہ مانگے بنا ہی جیسے رشتہ طے ہو گیا۔ البتہ منگنی کی تاریخ کئی بار متعین کی گئی مگر ہر بار عین وقت پہ کوئی نہ کوئی اَن ہونی ہو جاتی اور عموماً لگی ہوئی ملازمت چھوٹ جاتی اور وہ قلاش ہو کر کہتا "جو پیسے منگنی کے لیے جمع کیے تھے وہ تو سب لگ گئے......"

تب فرحت اپنے منگنی کے لیے جمع کیے ہوئے پیسے اُس کی مٹھی میں دبا دیتی، مٹھی بند کرتے ہوئے لمس کی کوئی برق سی روم روم میں کوندے بھر دیتی۔ دِنوں بعد تک جس کے پازیٹو نیگیٹو سرے جڑتے رہتے اور جب بھی وہ چاہتی کرنٹ سا پیدا کر لیتی۔

"کوئی بات نہیں...... منگنی تو رسم ہی ہے، ضرورت تو نہیں...." تب وہ مٹھی یوں بند کرتا جیسے فرحت کی جان پر بڑا احسان کیا ہو۔

"ہاں منگنی پر خرچے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیدھی سادی شادی کی ڈیٹ ہی رکھیں گے بہت جلد......"

اور پھر ان پانچ برسوں میں بیسوؤں بار تبدیل ہوتی شادی کی تاریخوں میں بیسوؤں ہی رشتے موڑ دیئے گئے تھے اور اب تو لوگ خود ہی آنے سے گریزاں تھے کہ دس برس پرانی نوکری والی لڑکی تو یقیناً کسی اور کے نام اپنی دل و جان کی پونجی نذر کر چکی ہوگی۔ گویا حالات کے تانے بانے نے ان پانچ برسوں میں فرحت کے گوڑھے کے تار کو واحد کے گرد یوں بن دیا تھا کہ اب اُس کا ہر سرا کسی گُنجھل کی گرہ ہو گیا تھا جو ان پانچ برسوں میں اتنی ہی ملازمتیں چھوڑ چکا تھا، جتنی بار شادی کی تاریخ بدلی تھی لیکن عشق ایک ہی تھا جس کی اصل استقامت بے روزگاری کے دِنوں میں اُمڈ کر سامنے آتی جس کی شدت کے لحاظ کے مارے فرحت کا وہ اکاؤنٹ جس میں اُس کی تنخواہ آتی تھی وہ خالی ہو جاتا اور جتنا خالی ہوتا دل اُتنا ہی ارمانوں اور آرزوؤں سے بھر جاتا لیکن روزگار کے دِنوں میں فرحت اُس کی آواز سننے کو ٹیلی فون کی گھنٹی بن آپ ہی آپ پل پل بجتی رہتی اور پھر جواب نہ ملنے پر انکشاف ہوتا کہ اُس کے وجود کے موبائل میں پڑی چپ کا بیلنس ختم ہو چکا ہے، جب تک ری نیو نہیں ہوگا یونہی بے صدا بے جان اور فالتو پڑا رہے گا۔

تب اُسے اپنا بھرا ہوا اکاؤنٹ فضول بوجھ لگتا، جسے استعمال کرنے کو اس کی کوئی ضرورت ہی باقی نہ بچی تھی۔ ٹیلی فون بے کار کا خرچہ معلوم ہوتا، جس میں سے کوئی جواب موصول ہی نہ ہوتا ہو تو پھر اس مُردہ چیز کا فائدہ تا آنکہ وہ بے روزگار ہو کر پھر اُس کے پاس لوٹ آتا۔

تب اُس پر کبھی بچھڑے ہوئے محبوب سے ملنے والی دیوانگی چھا جاتی کبھی گھر دیر سے لوٹنے والے بچے پر انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوئی ماں کی طرح وہ برس پڑتی، کبھی اُس کی غیر مستقل مزاجی پر بڑی بہن بن کر اُسے سمجھاتی تو کبھی اُس کی فضول خرچیوں پر پرانی بیوی کی طرح اُسے کوستی، جس کی غیر ذمہ داریوں اور لاپرواہیوں نے اُس اکیلی جان پر مستقبل کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔ منگنی شادی کی تاریخ سے لے کر بچوں کے سکول اور اُن کی شادیوں تک کے کئی معاملات وہ خود طے کر چکی تھی بلکہ کئی بار تو بچوں کے رشتوں پر دونوں کے بیچ اختلافِ رائے اور تُو تکار بھی ہو چکی تھی۔

فرحت کو لگنے لگتا، اس کی شادی برسوں پرانی ہو چکی ہے اور پُرانی شادی کے پیدا شدہ مخصوص مسائل میں وہ بری طرح گھر چکی ہے۔ اگرچہ اپنے اپنے گھر میں رہتے ہوئے دونوں کے بیچ بس ٹیلی فون کا ہی تعلق تھا اور جن دِنوں اُدھر سے مہینوں فون نہ آتا تو فرحت کو لگتا اُس کا شوہر ملک سے باہر کمائی

کرنے گیا ہوا ہے، جب وہ واپس لوٹے گا تو بچوں کا اچھے سکول میں داخلہ ہوگا، گھر بنے گا اور......
اور......اور جب وہ کنگال ہو کر لوٹتا تو فرحت کو محسوس ہوتا کہ وہ ڈالر جو باہر سے وہ اُسے بھیجتا رہا ہے۔
وہی اُس نے سگھڑ بیویوں کی طرح سینت سنبھال رکھے ہوئے تھے جواب ضرورت کے وقت کام آ رہے ہیں۔اُس کی شاہ خرچیوں پر اُسے ٹوکتی بھی رہتی۔

''کچھ مستقبل کے لیے بھی ہمیں بچا کر رکھنا چاہیے۔آخر کل بچوں کی ضروریات......''

اُن دِنوں بنا کسی جسمانی تعلق کے اُسے اُبکائیاں آتی محسوس ہوتیں، کئی بار وہ دردِ زہ سے گزری، تین بچے تو اپنے ناموں کی شناخت کے ساتھ اُسے تنگ کرتے، ہر وقت اُس کے گرد اُچھلتے کودتے رہتے اور جب وہ اُس کی جمع پونجی لینے کو آتا تو وہ چیک پکڑاتے ہوئے پُرانی بیویوں والی تنبیہ کرتی۔

''کچھ عباد اور حماد کے لیے بھی رہنے دیا کرو۔آخر تو کل شرمین کی شادی بھی کرنی ہے۔''اور جب اُس کا بینک بیلنس برابر ہو جاتا تو پھر نمازوں، وظیفوں کی طوالت سے بھی دُعا کی طوالت بڑھ جاتی۔

''یا خدا واحد کو اچھی سی ملازمت دے۔اُس کی کمائی میں برکت ڈال۔اُس کے مزاج میں استقامت پیدا کر......نئی بیوی بننے سے پہلے ہی وہ برسوں پرانی بیوی کے مزاج میں ڈھل گئی۔لاابالی شوہر کی متفکر اور ذمہ دار بیوی جو بچوں کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی پلاننگ کرتی اور شوہر کے سدھر جانے کی دُعائیں مانگتی رہتی، جو شادی کے ابتدائی دِنوں والے عاشق نما شوہر کی بجائے برسوں پُرانے شوہر جیسا چوبی تختہ بن چکا تھا جو اپنی بے روزگاری، تنگدستی اور دفتری اُلجھنوں کی ساری تلچھٹ برسوں پُرانی بیوی پر اُنڈیل دیتا ہے۔کیونکہ پُرانے شوہر کے تمام تر ناکام رویوں کے کتھارسس کا ہدف پُرانی بیوی ہی ہوا کرتی ہے۔وہ بھی پُرانے شوہر کی تنک مزاجی سے پتھر سی نکرانے لگی تھی۔کیونکہ اب وہ بھی تو پُرانی شادی کے مخصوص سنگلاخ ٹھنٹھ میں دھڑ بھر اُتر چکی تھی اب تو اُس کی خیالی دنیا میں شادی کا دن سہاگ کی رات شوہر کی محبوبیت، چھ سات برس پُرانی شادی کے منطقی مسائل اور روز افزوں مہنگائی کے چکر میں گھس پھس گئے تھے اور جب واحد ساری بچت سمیٹ کر لے جاتا تو پھر اُسے یکدم زیرِ تعمیر مکان، اور بچوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات گھلانے لگتیں، اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی مارنے لگتی

دودھ پینا چھوڑ دیا، پھل تو پہلے ہی قوت خرید میں نہ رہے تھے۔ صابن، خوشبو اور میک اپ غیر معیاری خریدنے لگی۔ کپڑے جو کبھی کالج کی مختلف تقریبات میں بن جایا کرتے تھے وہ بھی ضرورت نہ رہے۔
ایک روز بجلی نہ ہونے کی وجہ سے جب وہ صحن میں آئینہ لا کر لپ اسٹک لگانے لگی تو اُس پر عجب انکشاف ہوا کہ وہ واحد سے پانچ برس نہیں بلکہ دس برس بڑی ہوگئی ہے کیونکہ شادی کے پانچ برس گزرنے کے بعد عورت ویسے ہی عمر میں مرد سے پانچ برس آگے کا سفر طے کر جاتی ہے اور وہ تو پہلے ہی پانچ برس آگے تھی۔ اُس پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اُس کے قدم تو وہیں کے وہیں کھڑے ہیں، جہاں سے سفر شروع ہوا۔ جب کہ اُس کے خدوخال اور اعضاء برق رفتار ہو چکے ہیں۔ وہ دانتوں میں اُنگلی دابے آئینے کی سنگینی میں لپٹی کھڑی تھی کہ وہ پھر ایک دفعہ کنگال ہو کر لوٹ آیا۔ اس بار اُس پر دس برس پرانی بیوی والی ساری کرختگی مل کر حملہ آور ہوئی اور آئینے کی تمام تر کڑواہٹ اُس نے واحد پر اُنڈیل دی۔
''بس بہت ہو چکا۔ دو دو گھروں کے اخراجات برداشت نہیں ہوتے، یا تم اس گھر میں آ جاؤ۔ یا مجھے اُس گھر میں لے چلو کم از کم خرچہ تو ایک گھر کا ہوگا نا ''
دونوں گھروں کی جمع پونجی ایک نیلی فون کال کے فاصلے سے اُچک لے جانے والا، جوان بچوں کی ماں جیسی کرخت محبوبہ اور صدیوں بوسیدہ بیوی کے تیور دیکھ کر تیورا گیا، پھر شکست خوردہ شوہر والی ساری تنگ مزاجی اپنالی۔
''تمہیں معلوم نہیں میری ملازمت ختم ہو چکی ہے، جمع پونجی بھی گئی، میرے پاس تو کارڈ تک چھپوانے کو چند سو روپے نہیں بچے ہیں اور تم شادی ''
فرحت نے سگھڑ بیوی والا بچت بکس کھولا اور کچھ رقم اُس کی اُلٹی ہوئی خالی جیب میں ڈالی۔
''یہ صرف کارڈ چھپوانے کے لیے ہے۔ باقی اخراجات کی باری کارڈ چھپنے کے بعد آئے گی۔''
اماں ابا تو شادی کی ان طویل ہوتی ہوئی تاریخوں نے نگل لیے تھے۔ بہن بھائی آج کل کی مصروفیت نے کھا لیے تھے۔ اُنہوں نے خود ہی پندرہ نومبر تاریخ طے کر لی۔ لمبے چوڑے خرچے کی ضرورت تو آئینہ کے سچ نے رد کر دی تھی۔ البتہ ڈلہا ڈلہن کا جوڑا، چھوٹا سا مہندی اور ولیمے کا فنکشن تو ہونا ہی تھا ...... واحد جب کارڈ چھپوانے چلا گیا تو برسوں پرانے صندوقوں میں بند پڑی شادی کی لاش تعفن چھوڑنے لگی اور دیمک کے کیڑے جھڑنے لگے۔ وہ نیم، تمباکو کے پتے بنا بنا اُسے ہوا لگوانے لگی جیسے

یہ شادی اُس کی نہیں اُس کے کسی بہن بھائی یا بیٹی بیٹے کی ہو۔ اُس نے اپنے اردگرد گھومتے عباد، حماد اور شرمین کو مدد کے لیے پکارا اُنھوں نے جواب دیا۔ آخر تو ان کی بقا کے لیے پہلے اُس کی اپنی شادی ضروری ہے۔ اس پُرانی بیوی کی توقیر کے لیے، نئی بیوی کی بازیافت لازم تھی۔

تب وہ سب ٹرنک ڈبے پھرولنے لگی اور ہواڑ چھوڑتی جہیز کی مختلف اشیاء کو دھوپ لگوانے لگی۔ جب وہ کارڈ چھپوا کر لوٹا تو اُس وقت تک وہ برسوں پرانی ہو چکی اس شادی کے کئی نئے سلسلے جوڑ چکی تھی۔ زیور پالش ہو کر نئی دمک دے رہا تھا۔ جہیز کا فرنیچر روغن ہو کر نیا لگنے لگا تھا۔ بیاہ کے جوڑے مناسب تراش خراش کر لیے گئے تھے لیکن ابھی بھی برات، ولیمے کا جوڑا اور کھانے کے علاوہ بھی کئی اخراجات باقی تھے۔ واحد نے ایک ہاتھ سے ان اخراجات کا خرچہ پکڑا۔ دوسرے سے کارڈ اسے تھمائے تو لمس کی وہی پرانی برقی روبوٹی بوٹی میں جھرجھری بن تادیر جھنکار دیتی رہی کہ اس برسوں پرانی ہمک مارتی ہوئی شادی پر چڑھی کائی کی تہہ جیسے شفاف جھرنے کی دھار نے دھو دی ہو پتہ نہیں واحد نے یہ چکا چوند دیکھی بھی کہ نا، وقت کی کمی کے باعث وہ واپس بھاگا۔ سارے ہی انتظامات اُسی کو تو کرنا تھے لیکن اس سنہرے روپہلے کارڈ پر لکھے ''شادی مبارک'' کے شوخ رنگ حروف نے فرحت کے اندر باہر جگ مگ کرتے رنگ وروغن کے مزید کتنے ہی ست رنگ برش پھیر دیئے۔ دل، جگر، ٹیکہ، جھومر ماتھے پر لاکائے شرمانے لجانے لگے، جیسے زرتار گھونگھٹ کی اوٹ سے آرسی مصحف ہوا ہو۔ فضا سے گل رنگ آب داروں کی جھری سی لگی تن من سیراب ہو گیا لیکن کیا آسمان کے اُفق پر پینگ کے ہوا لارے لیتی دھنک میں سے برق گرتی ہے۔ اُس نے ہزار زاویوں سے کارڈ پر لکھے ہوئے دُلہن کے نام کے ہجے بنائے۔ اپنا نام اپنی ہی پورسے ہتھیلی پر لکھ لکھ دیکھا، لیکن کارڈ پر لکھا ہوا نزہت مقبول کسی طرح بھی فرحت جبیں نہ بن پا رہا تھا۔ نس نس پر وجود بھر حلق کھل آئے تھے اور سارے نرگٹ یکبارگی اُلٹ گئے تھے، ہزاروں بار بنی دُلہن کا تصور، تینوں بچوں کے مستقبل کی پلاننگ، لااُبالی شوہر کے لیے جمع کیا گیا بینک بیلنس سب کچھ آتشیں لاوے کی طرح باہر اُمڈا اور وہ پل بھر میں خالی بھنبھار ہو بازگشت سی بجنے لگی۔ اندر سے چھٹتا ہوا سب کچھ در و دیوار اور چھتوں سے ٹکراتا ہوا اُسی کو مار کرنے لگا۔ بہہ جانے کے خوف سے وہ کسی منہ بند دراز میں اُترتی چلی گئی۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی، پہلی ہی بیل پر ہاتھ ریسیور پر تھا، کہ یہ اس ہاتھ کی پرانی عادت تھی اور پرانی عادتیں پرانی بیوی کی استقامت سی بے بس ہوتی ہیں۔

''سوری فرحت! شاید تمہیں وقتی طور پر دُکھ بھی ہوا ہو لیکن تم خود مجھ سے بہتر سمجھتی ہو کہ ہمارے درمیان تو اِک روحانی تعلق ہے، جو کسی مقدس محبوب سے ہوتا ہے۔ کسی مخلص دوست یا سہیلی جیسی ماں سے ہوتا ہے۔ بھلا ہمارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ...... اُف...... توبہ...... جب کہ اتنے برسوں میں اِک دوجے کو چھونے کی خواہش تک ہمارے اندر کبھی نہ اُبھری۔''

اُس کے وجود پر جابجا کُھل آنے والے بڑے بڑے حلقوم نے وجود بھر اُبکائی باہر اُگلی اُسے پسیے پکڑاتے ہوئے جس لمس کو اُس نے بارہا محسوس کیا تھا، جس کی گرج چمک کے آہنگ پر وجود کا تار تار مدتوں کھنکتا رہتا تھا۔ اُس لرزش کی سنسناہٹ ہی تو تھی جو اس کی واپسی تک پورے وجود میں واحد واحد کی گھنٹیاں بجاتی تھی لیکن اب تو وہ رشتوں کے تقدس میں بندھی ماں بہن کے احترام میں ذرہ بہ بند ہو چکی تھی۔ تب وجود کے شیش محل میں جڑے اَن گنت شیشے ایک ہی چھناکے سے ٹوٹے اور روم روم میں کھب گئے۔ وہ لہواُگلتی لاش کو گھسیٹتے ہوئے پوسٹ مارٹم کے پھٹے تک لائی۔

کیا اُسے بہت پہلے بہت اندر سے کہیں اس شخص کے مزاج سے آگاہی حاصل نہ تھی۔ اُس کی نیت اور مقصد اُس کے ہر ہر عمل کا آئینہ نہ تھے۔ تو پھر وہ راہزن کے رستے میں ہی کیوں پڑی رہی۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ اُس کے وجود میں یوں شب خون مار کر گھسا کہ ہر کونے کھدرے میں بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا اور جب بھی اس نے اُسے نکال باہر کرنے کا سوچا۔ وجود کے بھنڈار میں ایسی ہو ہو کار مچی کہ اُس کا اپنا سب کچھ اُسی کے خلاف برسرِ پیکار ہو گیا۔ آخر اپنی ہی بغاوت اپنے خلاف کیسے فرو کی جائے۔

دل، جگر، گردے کچھ بھی باغی سا بدن سے نکال دینے کی صورت میں ٹرانسپلانٹیشن ضروری ہوتی ہے۔ یعنی ایسا ہی ایک عضو پہلے کی جگہ پر لگنا چاہیے، ورنہ موت...... اور جب جلد اور ہڈیوں کے اندر کسی باغی اعضاء کی پلانٹیشن ممکن نہ رہے، تو پھر اُسی بیمار عضو کے ساتھ ہی جینا ہوتا ہے۔ جتنی زندگی بھی وہ دے سکے، اور اب جبکہ ہر ہر بیمار اعضاء یکبارگی اُس کے بدن سے بغاوت کر کے اُس کے سامنے پڑا تڑپ تڑپ کر مر رہا تھا تو ان کی خالی کی ہوئی جگہ کو پُر کیا جانا ضروری تھا ورنہ موت...... کوئی تو مصنوعی اعضاء لگنا ضروری تھا جیسے کوئی لے پالک بچہ جو محبت کے ناکارہ ہو چکے خلیوں کی جگہ نئی پلانٹیشن کر سکے۔ کوئی چیریٹی جو خیر کے منہ زور جذبے کی پلانٹیشن کر سکے۔ کوئی مصروفیت جو فیل ہو چکے توجہ کے جذبے کی جگہ فٹ آ سکے۔ کوئی تو، کچھ تو...... جو بے کار جاتی زندگی کی توقیر کا منطقی جواز بن سکے۔ اس

وقت اس کا خالی بھنبھار وجود موت اور زندگی کی درمیانی تڑپ پھڑک میں تھا۔ لے پالک جگر، دل، گردے کی تنصیب کے انتظار میں، اگر وجود اپنے فالس اور لے پالک اعضا کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے تو پھر جذبے بھی لے پالک جذبوں سے مجوکر دھڑک سکتے ہیں۔ زندگی بھی مستعار سانسیں لے کر جی سکتی ہے۔ فالس بیوی، فالس بچے، فالس محبوب سب تصوراتی خیالاتی...... لیکن کسی خارجی لہو کی ڈرپ کی طرح مرتے ہوئے انسان کے لیے از حد ضروری علاج...... ورنہ موت...... اگر لے پالک بچہ ہو سکتا ہے تو لے پالک محبوب کیوں نہیں...... محبوب تو ہوتا ہی لے پالک ہے۔ کسی مستعار لی ہوئی شے جیسا جس کے لوٹائے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے، پوسٹ مارٹم کے پھٹے پر پڑی لاش بڑے بڑے ٹوپوں میں سل چکی تھی۔

اک لمبا عرصہ بے ہوش پڑے اعضاء میں پہلی جنبش کے ساتھ ہی ہاتھ نیلی فون ریسیور کی سمت بڑھا۔

''واحد! آج شام کو ذرا آجانا...... بازار چلیں گے...... نزہت مقبول کے لیے تحفہ خریدنا ہے...... شادی کا تحفہ......''

بشیر چائے والے کا کھوکھا استعاراتی حیثیت کا حامل تھا۔ یہاں سے سودا خریدنے والے یہاں بیٹھ کر گپ شپ کرنے والے محلے بھر کا اکلوتا اخبار جو صرف اسی کھوکھے پر آتا تھا۔ اُسے پڑھنے والے اور مزید جو کچھ کہ اس میں موجود تھا، یا اس سے متعلق ہو سکتا تھا۔ سب اسی مستعار لہ کا مستعار منہ تھا۔

ساجد کو اس استعارے کی یہ بلاغت ہرگز پسند نہ تھی۔ جہاں سب کچھ حقیریت کا لوازمہ تھا۔ ذرا ذرا جینا، ذرا ذرا مرنا، ذرا ذرا سے انسان اور اُن کے ذرا ذرا سے مسائل، جن کی ضرورتیں اونٹ کا کھلا منہ اور آمدنی وہی زیرہ زیرہ۔ پتہ نہیں یہ قصور ساجد کی کج فطرت کا تھا کہ اُس کی چودہ جماعتوں کا کہ وہ اس سب حقیریت سے ایسی ہی مغائرت محسوس کرتا جیسے انسان اپنی ہی گندگی سے محسوس کرتا ہے لیکن نجات نہیں پا سکتا۔ ساجد بھی اسی سب کا شکار تھا جو اس حقیریت کے لوازمات ہیں۔ پتہ نہیں یہ ان بونے بونے سے انسانوں کے مسائل اتنے یکساں کیوں ہیں۔ وہی سفید پوشی کہ آگے سے اُٹھے تو ننگی پیچھے سے اُٹھے تو بھی ننگی اور آگا پیچھا ڈھانپنے کے جتن میں پھر وہی بھوکے پیٹ اور اُن پر بندھے ہوئے سخت پتھر۔ وہی بے روزگاری کھانے والے چیونٹیوں کے بھرے بل، کمانے والا اکیلا دوکیلا۔ وہی ذرا ذرا سی بیماریاں، جو نہ مارتی ہیں نہ جینے جوگا چھوڑتی ہیں۔ چونا مٹی جیسی ہر وقت جھڑتی ہوئی۔ ٹی بی، دمہ، گھنٹیا گھس گھس کے مرو۔ جب مرنا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر نزع کی حالت کا رُک جانا تو عذاب ہے نا۔ جینا بھی

عذاب مرنا بھی عذاب، اور ایک وہ رئیسانہ امراض ایک دم ہارٹ اٹیک، ایک دم برین ہیمرج۔ اِدھر حملہ اُدھر تخت یا تختہ، ادھر کیا کہ قطرہ قطرہ بوند بوند مرو، اور پھر یہ گھسے پٹے سے لوگ اس نزعی حالت کا خاتمہ خود اپنے ہاتھوں کرنے لگتے ہیں لیکن مرنے کا ڈھنگ بھی تو نہیں آتا انہیں، پانی میں ڈوب مرے، پٹڑی پر سَر دَھر دیا۔ خود کو آگ لگالی۔ شاید زہر قیمتاً آتا ہے اور بندوق پستول دسترس میں ہی نہیں اور ایک وہ رئیسانہ اندازِ خُودکشی کہ بدن تکلیف کے لمس سے بھی آشنا نہ ہو سکے۔

ساجد کا باپ جل مرا تھا اور دس افراد کے خالی پیٹ اُسے وراثتاً دے گیا اور پانچ بہنیں جو جہیز کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھیں۔ سفید پوشی کی دیگ میں دَم پر لگی ہوئی یہ بہنیں، بیٹیاں بھی اُسی حقیریت کا شکار ہوتی ہیں۔ وہی حقیر سار کھ رکھاؤ، پاس لحاظ، صبر، برداشت اور مسکینی سب انہی گھسی پٹی بکلوں میں لپٹی بوند بوند، قطرہ قطرہ اپنا ہی لہو چوستی ہوئی۔ اپنے وجود کی خود جونکیں سی اور ایک وہ کہ ادھر خواہش اُدھر تکمیل، جن کی رئیسانہ طلب انتظار اور صبر کا دم لگائے اَندر ہی اَندر پخت نہیں ہوا کرتی کہ بھاپ کی شدت یا بھک سے اُڑا دے یا جلا کر خاکستر کر دے۔

بہت پڑھنے بہت سوچنے، بہت کُڑھنے والے ساجد نے جب گہرا تفکر کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دراصل قصور اِن ذرا ذرا سے لوگوں کی اسی حقیریت کا ہے۔ دھرتی کے سینے پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کا تو کچلے جانا ہی مقدر ٹھہرا۔ سمٹ جانے والا ہی تو پھیلنے والے کو جگہ دیتا ہے۔ سو اُسے معدوم سے گھیراؤ والی نوکری نہیں کرنی کہ پھیلنے والے کے لیے اتنی جگہ چھٹ جائے کہ اُس کا اپنا وجود سمٹتے سمٹتے نامعلوم ہو جائے۔ گھیراؤ اور پھیلاؤ والی نوکری کی تلاش میں وہ روز کھوکھے پر آتا ہے اور نوکریوں کے اشتہار پڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر کی چوکھٹ اور کھوکھے کے کھلے دَر کے درمیانی حصے میں اُبلتے بہتے پھیلتے غلیظ پانی کو پھلانگتا ہے تو گندگی پر افزائش پاتے مچھر اور مکھیاں بے آرام ہو کر فضا میں بھنبھنانے لگتے ہیں۔ اِسی طرح نوکریوں کے ذرے پر بھی لاتعداد مکھیاں، چیونٹیاں اور مچھر مل کر یلغار کرتے ہیں اور جب تک ساجد کی باری آتی ہے وہاں کچھ بھی بچا نہیں رہتا اور نوکری کا ٹکڑا اُونچی پرواز کرتے شاہین کی چونچ میں دبا ہوا ہوتا ہے اور وہ خالی ہاتھ پھیلنے والوں کو پھیلتے ہوئے اور خود کو سمٹتے سمٹتے معدوم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اُس وقت وہ آنکھیں بن چکا ہوتا ہے جو خالی پیٹ کے بیچوں بیچ بٹ بٹ کھلی دھری ہوں۔ اُس روز بھی جب وہ لاتعداد مکھیوں اور مچھروں کو ڈسٹرب کرتا اَن گنت غلاظتوں کو پھلانگتا

اور بے شمار لاروؤں کو جوتوں اور پاؤں سے لپیٹتا ہوا کھوکھے کے دَر میں اُترا تو کھوکھا مکھیوں اور مچھروں کی بھنبھناہٹ سے بھر چکا تھا۔

اس غیر معمولی سرگرمی سے ساجد کو معلوم ہوا کہ وزیرِاعظم اُن کے شہر میں تشریف لا رہے ہیں اور پورا شہر حوالۂ پولیس اور ایجنسیز کر دیا گیا ہے جیسے دشمن نے زبردستی قبضہ جما کر ساری آبادی کو مشکوک قرار دے دیا ہو اور کھوجی کتے چپے چپے کو سونگھتے پھرتے ہوں۔ ان دنوں کھوکھے پر لوگوں کے بیٹھنے کا دورانیہ دُگنا ہو گیا۔ اور انہیں اپنی گلیوں میں گھومتے پانی سے تعفن محسوس ہونے لگا۔ اور وبائی امراض اُن کے بچوں کو بے تحاشہ ہلاک کرنے لگے۔ اُنہیں پہلی بار وہ ٹرک بھی کھٹکنے لگے جو شہر بھر کی غلاظتیں بھر بھر کے اس بستی کے اطراف میں اُنڈیلتے رہتے تھے۔ جن پر افزائش پاتے ہوئے حشرات الارض کی تعداد اس بستی کے مسائل کی طرح لاتعداد تھی۔ اور ان غلاظتوں کے ڈھیروں سے کارآمد غلاظتیں چننے والے ان مکھیوں، مچھروں کو اُڑا اُڑا کر بستی کے ہی مکانوں میں منتقل کر دیتے تھے۔ جن کے مکینوں کا گندا خون چوس چوس کر وہ مر جاتے اور مار ڈالتے۔

سلولائڈ کے تھالوں میں رکھے کڑک کر کے ٹوٹنے والے سخت کیک کے ٹکڑے اور پرانی مہک والے سیلے رسوں سے مکھیوں مچھروں کی یلغار کو دونوں ہاتھوں سے روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بشیر کھوکھے والے نے کہا۔

''ساجد پتر، اک عرضی لکھ دے۔''

''عرضی کیسی؟''

ساجد اپنی بہت کم بولنے، کم ہنسنے، کم سونے، کم کھانے اور بہت کم گھلنے ملنے والی طبیعت کے بموجب بہت ساری کمتریوں کے بوجھ تلے اخبار میں دھنسا رہا۔

''ہاں، ہاں لکھو۔''

رنگ برنگی صدائیں ہم آواز ہو گئیں۔

''لکھو کہ اگر اس غریب بستی میں یہ کھوکھا نہ رہا تو ہم سب نہتے ہو جائیں گے۔ اگر ہزاروں لاکھوں ایکڑ سرکار کے ڈکار لینے سے کچھ فرق نہیں پڑا تو اس چار فٹ جگہ سے سرکار غریب نہیں ہو چلی اور یہ بھی لکھو کہ اس بستی کی صفائی کروائی جائے۔

''اور یہ گندگی کے ٹرک...... یہ اُبلتے ہوئے گٹر...... یہ...... یہ۔''
بھنبھناہٹ بڑھتی گئی۔
واپڈا کے لائن مین نے پانی کا گڑھا پھلانگا تو جوتے کا اگلا حصہ غلیظ محلول میں بھر کر باہر نکلا۔ جس کے چھینٹے اُس کی پلکوں، گالوں پر لیپ ہوتے ہوئے چائے کے دیگچے میں کھولتے ہوئے پانی میں گرے اور اُبل گئے۔
''میری عرضی بھی لکھو اور انگریزی میں لکھو۔''
''صرف پچاس روپے، صرف پچاس'' خود ہی بخشش دی، خود ہی پکڑ وا دیا اور خود پچاس کروڑ، پچاس لاکھ۔''
بار بار دہرائی ہوئی کہانی میں پہلے والا غصہ اور جوش کمزور پڑتے پڑتے اب پچھتاوے اور کرب میں تبدیل ہو چکا تھا۔
''اُس کی بھی لکھو اور میری عرضی بھی لکھو۔ میرا بیٹا دس جماعت پاس کتنے برسوں سے بے روزگار پھر رہا ہے آخر ساری عمر سرکار کی خدمت کی ہے۔ چپڑاسی ریٹائر ہوا ہوں سرکار کا، کوئی معمولی بات نہیں۔''
ان ذرا ذرا سے لوگوں کے ذرا ذرا سے مسائل چیونٹی دانوں کی مانند اتنے بکھرے ہوئے تھے کہ ساجد کی انگلیاں سمیٹتے سمیٹتے رہ گئیں۔ آخر میں بشیر کھوکھے والے نے کہا۔
''ساجد پتر! تو اپنے لیے بھی عرضی لکھ۔ پاس تو تُو چودہ جماعت ہے لیکن لیاقت تیری اٹھائیس جماعتوں کے برابر ہے اور ہم سب کو یاد ہے کہ تو نے یہ چودہ جماعتیں کس جتن سے پاس کی ہیں۔ تجھے کرسی والی نوکری ملنی چاہیے۔''
اپنی عمر اور تعلیم کے مقابلے میں بہت زیادہ تفکر کرنے والا بہت پڑھنے بہت کڑھنے بہت سوچنے والا ساجد بہت سی برتریوں کے احساس میں ڈوبا رہا۔
سب نے اپنی اپنی عرضیاں کھیسوں میں سنبھال لیں، گویا یہ عرضیاں نہ ہوں اُن کے تمام مسائل کے حل کے پروانے ہوں۔
ساجد ان درخواستوں کے انجام کا سوچ کر بے تحاشا ہنسا لیکن یہ زہر خند لبوں تک نہ آیا۔ اندر

ہی اندر گہری کڑواہٹ بھر گیا اور یہ کڑواہٹ اُس وقت ساجد کی نس نس میں گھل رہی تھی۔ جب جلسہ گاہ میں وزیرِاعظم غریبوں کی کایا پلٹنے اور ملک کا نقشہ بدلنے کا واویلا مچا رہے تھے اور غریب بیچارے بسوں ویگنوں کے اڈوں اور سڑکوں پر کلبلاتے تھے۔ پوری ٹرانسپورٹ ساری سڑکوں اور پورے شہر کو وردیوں اور بوٹوں نے ہائی جیک کر رکھا تھا جن کے پستولوں کی نوکیں لوگوں کو اپنی کن پٹیوں پر محسوس ہوتی تھیں اور ڈنڈوں کی نوہیں پسلیوں میں گھسی جاتی تھیں۔ وزیرِاعظم کے ہر جملے کے آخر میں تالیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوتا جن کی مٹھیوں میں عرضیاں بھنچی تھیں جو تالیاں پیٹ پیٹ کر شل ہو چکے تھے اور جن کے اندر یہ احساس پختہ ہو رہا تھا کہ یہ عرضیاں نہیں ہیں، اُن کے مسائل کے حل کے پروانے ہیں۔ وزیرِاعظم کے دستخطوں والے اور وزارتِ عظمیٰ کی پکی مہر والے حکم نامے۔ اب عرضیاں اکٹھی کی جا رہی تھیں۔ ہزاروں ہاتھ بلند تھے۔ ہر ہاتھ میں عرضی تھی۔ ہر عرضی میں کچرے کے ڈھیر پر بھنبھناتے ہوئے مچھر اور مکھیوں ایسے بے شمار مسائل تھے۔ واحد ہاتھ ساجد کا تھا جو بلند نہ تھا۔ جس نے اپنی عرضی مٹھی میں بھینچ رکھی تھی اور جس کے اندر پھیلا ہوا زہر خند خاموش قہقہے لگاتا تھا لیکن اُس کے لبوں پر گہرا انقباض بند تالے کی طرح لگا تھا۔

جب بینروں، نعروں اور تالیوں کے جلوس میں جھنڈے والی گاڑیاں متحرک ہوئیں۔ تو سڑک کے دونوں اطراف بندوقوں، ڈنڈوں اور وردیوں کی خاردار باڑیں گڑ گئیں۔ جیسے سڑک نہ ہو بکتر بند گاڑی ہو جسے دیکھتے ہی عام آدمی کا پتہ پانی ہو جائے۔ مجمع میں دہشت رینگ رہی تھی جیسے فاتحین کا مسلح لشکر بیچوں بیچ گزر رہا ہو۔ فتح کے ڈونگرے برساتا ہوا اور مفتوحین کو آہنی بوٹوں تلے روندتا ہوا۔ اُس وقت ساجد آہنی بوٹ کی نوک سے تیر کی مانند چھٹا اور خاردار باڑ کو عقب سے چیرا اُس کے ہاتھ میں عرضی تھی عرضی والا ہاتھ وزیرِاعظم کی گاڑی کے بلٹ پروف شیشے کے ساتھ ساتھ رگڑ کھاتا تھا۔ اور جسم شاف کار کے ٹائر تلے گھسٹ رہا تھا۔ جیسے سڑک پر جھاڑو پھر رہا ہو۔

چسررز، چسررز کی آوازیں پوری سڑک پر ٹائروں کی لمبی لمبی لکیریں کھینچ گئیں جن پر مچھر مکھیوں کے زہر سے آلودہ خون پھسلتا تھا۔ جیسے کسی گاڑی کی ٹینکی لیک کر گئی ہو۔ ملک کی آدھی سے زیادہ محافظ فورسز اکیلے ساجد پر جھپٹیں۔ سڑک پر گھمسان کا رن پڑ گیا۔ مجمع یوں چھٹ گیا تھا کہ پل بھر کی دیر ہوئی تو اس جرم میں سارے ہی دھر لیے جائیں گے۔ اُس وقت کتنی بیلٹیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ چھوٹے بڑے بچ ہوا

میں اُڑنے لگے۔ کمانڈو ایکشن ہوا، پلک جھپکنے میں سڑک صاف تھی، گاڑیوں کا قافلہ زناٹے بھرتا ہوا گزر گیا لہو کا آخری قطرہ تک ٹائروں سے لپٹ گیا تارکول کی ریشمی سڑک شفاف آئینے کی مانند دمکتی تھی جیسے کبھی کسی کتے، بلی، مچھر، مکھی کے خون کی بوند بھی نہ چکھی ہو۔ کئی بلوں اور بیجوں والی وردی نے ہاتھ مار مار لہو کے قطرے اکڑی ہوئی کریزوں پر سے جھاڑے اور حکم صادر کیا۔

''اگر ون پرسینٹ بیہ بچ جائے تو اس کے خلاف دہشت گردی، غداری، نقصِ امن کی جتنی بھی دفعات ہیں اُن کے تحت مقدمات درج کر کے اس کا ریمانڈ لے لو۔

صحن میں ساجد کی چارپائی پڑنے کے بعد اطراف میں بس اتنی ہی جگہ بچ رہی تھی کہ اُس کی پانچوں بہنیں اور ماں کھڑی ہو کر سینہ کوبی کر سکیں جو ساجد کی ڈگری اور سندیں...... سینے سے بھینچتیں اور غش کھا کر ساجد کی میت پر اوندھا جاتیں، جن کی بتیسیاں کھول کھول عورتیں پانی کے قطرے ٹپکاتیں، باہر گندگی کے ڈھیر کے عقب میں مانگویں صف بچھا مرد سر جھکائے بیٹھے تھے، جیسے منتظر ہوں کہ ابھی ساجد گلی میں بہتی گندگی جوتوں سے لپیٹے آئے گا اور نوکری کے اشتہار پڑھنے لگے گا۔ جب بشیر کھو کھے والے نے صفِ ماتم کی سوگوار خاموشی کی زبان پہلی بار کھولی۔

''ساجد مر گیا اگر زندہ بھی رہتا تو سمجھو پھر بھی مر ہی گیا تھا۔''

واپڈا کے لائن مین نے سامعین کے لیے اس اُلجھی گتھی کو سلجھایا۔

''وزیر اعظم کی گاڑی سے ٹکرانا کوئی کم بڑا جرم نہیں ہے۔''

''وزیر اعظم کی گاڑی کہاں، ایک جیسی بیسیوؤں ہوتی ہیں قافلے میں، تاکہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ وزیر اعظم کس والی میں ہے۔''

کسی نوجوان نے سَر پر اُلٹی رکھی ٹوپی کو جھٹکے سے اُتارا اور پھر اُلٹا ہی سَر پر دَھر لیا شاید وہ ساجد کا دوست تھا، جس نے اُس کے ساتھ ہی بی۔اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔

''لیکن قافلے کے رستے میں آنا بھی کوئی کم بڑا جرم نہ تھا، ساجد نے بڑی غلطی کی چچ چچ......''

صف کے آخری کنارے سے بنالب ہلے سینے کے مخرج سے تاسف اُبھرا۔

''ساجد نے کیا غلطی کی کروانے والے نے کروائی، وقت جو آ گیا تھا، بہانہ بن گیا، یہ نہ بنتا تو کوئی اور سہی سانس تو مُک ہی چکے تھے۔''

بستی کے سارے مکانوں سے لمبی اور سارے خوابوں سے تابناک گاڑی کے پیچھے دوڑتی ڈھول نے تقدیر کا فلسفہ بیان کرنے والے کا مُنہ بھر دیا اور اُس وقت سارے بند مُنہ پٹ سے کھل گئے جب ایک مشہور لیڈر ناک پر رومال رکھے گندگی کے ڈھیر سے بچ کر نکلے اور اکڑی ہوئی اُنگلیوں والی ہتھیلیاں بناخم دیئے فاتحہ خوانی کے لیے اُٹھادیں اور مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہی اکڑی ہوئی گردن سے تقریر اُبلنے لگی، جیسے ایم۔این۔اے کے جملہ عناصر ترکیبی کو نقطہ کھولاؤ میں لاکر بہادیا گیا ہو۔

''بھائیو! ساجد کا قتل ناقابلِ معافی جرم ہے، ساجد کی شہادت ہم سے کچھ تقاضا کرتی ہے، تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے قاتلوں کو ....''

سڑک پر گھورتے گاڑیوں کے ایک کانوائے سے اُچھلتی ڈھول لیڈر صاحب کے کھرکھراتے لباس کی کریزوں پر چڑھ بیٹھی اور پھر جھڑنے لگی، بوٹوں اور وردیوں والے گاڑیوں میں بیٹھے بولتے تھے۔

''سامعین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ایک دہشت گرد تنظیم کے چند ارکان شہر میں داخل ہو چکے ہیں، وزیراعظم کو قتل کرنے کی ناکام کوشش میں ایک خطرناک دہشت گرد مارا گیا، جس کے ساتھیوں کی تلاش جاری ہے۔ کسی دہشت گرد کو پناہ دینا یا اُس کی مدد کرنا سنگین جرم ہے جیسے ہی کسی مشتبہ شخص کو دیکھیں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فوراً مطلع کریں۔''

گاڑیوں کے پیچھے اُڑتی منوں ٹنوں ڈھول میں لتھڑی ہوئی دہشت ساری بستی میں سنسناتی رہ گئی۔ بشیر کھوکھے والا، واپڈا کا لائن مین اور اُن کے اُٹھتے ہی دیگر سوگواران بھی کھڑے ہو گئے جیسے دہشت گردوں کو روکنے کے لیے اپنے گھروں کے دروازے فی الفور بند کر لینا چاہتے ہوں لیکن لیڈر صاحب کی گرج دار آواز نے اُنہیں کندھوں سے پکڑ کر پھر بٹھادیا۔

''بھائیو! گورنمنٹ آپ کے غم و غصہ سے بوکھلا کر اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرنے پر اُتر آئی ہے، ایک تو ہمارا بچہ ضائع ہوا، دوسرا لواحقین کو ہراساں کیا جارہا ہے لیکن ہم ایسی مذموم کوششیں کامیاب نہ ہونے دیں گے، ہم ان گیدڑ بھبھکیوں سے ڈرنے والے نہیں۔''

مجمع کے عقب سے نعرہ بلند ہوا۔

''ساجد کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔''

''ظالمو جواب دو خون کا حساب دو۔''

بے قابو نوجوان یکبارگی اندر داخل ہوئے اور ساجد کی میت کندھوں پر لا دلی، ساجد کی ماں پٹ سے نل کی ہتھی پر گری اور منہ ناک سے خون کا فوارہ چھٹ گیا اور بہنیں پیٹتی ہوئی میت برداروں کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

''سرکار! معاف کر دو اس کملے کی غلطی معاف کر دو۔''

لیڈر صاحب کے چہرے کے مسام یوں پھیلے جیسے اندر کہیں سکڑے پھیپھڑوں میں ہوا سی بھری ہو، بڑھ کر لڑکیوں کے سروں پر چادریں ڈالیں۔

''بہنو بیٹیو! ہم ساجد کی شہادت کا بدلہ لیں گے۔ ہم آپ کو ریلیف دلوائیں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔''

مجمع چلایا۔ ''ساجد کی شہادت رائیگاں نہیں جائے گی۔''

جنازہ بردار جلوس شہر کی سڑکوں پر فلک شگاف نعروں کے جلو میں رواں ہوا، جس میں آدھی تعداد فوٹو گرافروں اور نامہ نگاروں کی تھی۔ تصویریں اُتر رہی تھیں۔ رپورٹیں بن رہی تھیں۔ بیرونی خبر رساں ایجنسیز کے نامہ نگار ساجد کے لواحقین سے انٹرویوز کرنا چاہتے تھے۔ ساجد کی المناک موت نے دلوں کو ایسا گداز کر دیا تھا کہ جلوس میں موجود ہر اجنبی خود کو اُس کا قریبی قرار دیتا تھا اور ان کے مترجم کا فریضہ لیڈر صاحب اُدا کر رہے تھے۔

پولیس کی بھاری نفری نے جلوس کو ایک چوک میں آگے بڑھنے سے روک دیا اور مجمع بپھر گیا۔ پولیس پر سنگ باری کرنے والے جلوس کے وسط سے نکلے تھے۔ دکانوں اور گاڑیوں کو آگ لگانے والے شاید جلوس کا حصہ تھے یا وہیں کہیں سے ساتھ ملے تھے۔ دُھواں، بارود، آگ کی سنہری لپٹوں اور نعروں کی گھن گرج میں کچھ واضح نہ تھا۔ پولیس کو آنسو گیس کے ہمراہ گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ دُھند اور دُھوئیں سے اَٹا منظر جب واضح ہوا تو جلتی ہوئی دکانوں اور گاڑیوں کے پس منظر میں سڑک پر برسے پتھروں، گولیوں کے خالی خول، آنسو گیس کے شیل، بارود کی بُو اور ٹائروں کی راکھ کے بیچ ساجد کی چارپائی کے قریب دولڑ کے اَوندھے مُنہ پڑے تھے۔ جلوس منتشر ہو چکا تھا اور لیڈر صاحب گرفتار کر لیے گئے تھے۔

فلاحی تنظیم کی گاڑیاں جب لاشوں کو اُٹھانے آئیں تو شہر کی سرکردہ این جی اوز اور اخبار نویسوں کا جلوس ہمراہ تھا۔ اگلے چند روز کے اخبارات کسی جنگی محاذ کا نقشہ پیش کرتے تھے۔

جلی ہوئی گاڑیاں، بھڑکتی ہوئی دکانیں، مشتعل ہجوم کی سنگ باری، لاشیں اور جنازے اور ان کے لواحقین کے انٹرویوز، گولیاں اور لاٹھیاں، معطلیاں اور تقرریاں اور سب سے اُوپر لیڈران کے بیانات جو نظر بندی کی حالت میں بھی مسلسل سامنے آ رہے تھے۔ کھوکھے پر بیٹھے لائن مین نے چائے کی لمبی سرکی لی۔

''کچھ نہیں کچھ نہیں تو دو لاکھ تو کہیں گئے ہی نہیں معاوضے کے۔''

کھوکھے کے اِرد گرد بیٹھے مرد جیسے تاش کے پتے پھینٹنے لگے۔

''آج کے اخبار میں ہی دیکھو لیڈر صاحب کا بیان۔''

کوئی نوجوان با آواز بلند خبریں پڑھنے لگا۔

''ساجد جیسے نوجوانوں کے قتل کے جرم میں حکومت مستعفی ہو جائے۔ لیڈر کا مطالبہ۔''

''جو حکومت عوام کے جان و مال کی حفاظت نہ کر سکے اُسے اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ سیاسی پارٹی کا بیان۔''

''قتل کے تینوں کیس ہائی کورٹ میں دائر کر دیئے گئے (وکلاء اور این جی اوز) مقتولین کے ورثا کی مالی معاونت کی جائے گی۔ این جی اوز۔''

کھوکھے کے اَندر یا شاید باہر سے نعرہ بلند ہوا۔

''ساجد کا خُون رائیگاں نہ جائے گا۔''

اور گندے نالے سے ہوکر بازگشت کچرے کے ڈھیروں میں دراڑیں ڈالنے لگی۔

ساجد کی بہنوں کے کانوں میں یہ نعرے شہنائی کی گونج بن پڑتے تھے اور ساجد کی ماں کو لگتا یہ نعرے نہیں دراصل وہ نوٹ ہیں جو اُس کی بیٹیوں کی ڈولیوں پر کھڑکھڑ برستے ہیں اور اخبارات میں چھپنے والی خبریں شادی کے وہ پیغامات ہیں جو مختلف شہزادے اُنہیں بھجوا رہے ہیں۔

حکومت کی طرف سے ہلاک شدگان کے لواحقین کے لیے ایک ایک لاکھ روپے معاوضہ دینے کا اعلان کیا گیا تھا لیکن لیڈر صاحب نے قیمتی جانوں کے عوض ایسے حقیر معاوضے کو شرمناک قرار دیتے

ہوئے مسترد کر دیا تھا اور شہداء ریلیف فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا تھا جس میں عوام سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل شائع کی جا رہی تھی۔ لیڈر صاحب کی پارٹی شہیدوں کی تصویروں اور انقلابی نعروں والے بینرز شہر بھر میں لگا رہی تھی اور ایک جلسے کا اہتمام کیا جا رہا تھا جس میں لیڈر صاحب نے ٹیلی فونک خطاب کرنا تھا اور ساجد کی ماں کو بھی سٹیج پر بٹھایا جانا تھا۔ ساجد کی ماں کا عجوبہ دیکھنے اور اپنی اپنی عرضیاں جمع کروانے کے لیے بستی کی عورتوں کا مجمع ساجد کے گھر لگا رہنے لگا۔ پوری بستی جذبات اور اضطراب کے بخار میں چولہے پر چڑھی کیتلی کی مانند کھول رہی تھی، کھوکھے کی رونقیں بڑھ گئی تھیں۔ اخبار کی طلب چھینا جھپٹی میں بدل چکی تھی کہ اچانک اگلے روز کے اخبارات بالکل چُپ ہو گئے۔ اشتہارات تک سب نے پڑھ ڈالے لیکن کسی خبر کا کوئی سرا نہ ملا، البتہ اخبارات کے پہلے صفحات پر لیڈر صاحب کی رنگین تصویریں چھپی تھیں۔ جو وزارتِ انصاف کا حلف اُٹھا رہے تھے اور اُسی شام ہونے والی ایک تقریب میں این جی او کے اُس نئے فلاحی پروجیکٹ کے افتتاح کا فیتہ کاٹ رہے تھے جس کے لیے ایک بڑا قطعہ اراضی حکومت نے عطیے کے طور پر دیا تھا۔

مزید کسی خبر کے لگانے کو شاید اخبارات کے پاس جگہ ہی نہ بچی تھی کیونکہ اشتہارات اتنے بڑھ گئے تھے کہ خبریں گھٹ گئی تھیں۔

وہ

آنکھ کے نیچے رخسار کی ہڈی سے ذرا ہٹ کے ایک انچ جگہ ادھڑ کے رہ گئی۔ بھوکا گدھ کھلی ہوئی دودھاری چونچ سے جلد سمیت گوشت کی بوٹی نوچ کر لے اُڑا۔ دوتپتی ہوئی سلاخیں ہڈی کو داغتی کبھی نہ مٹنے والا گہرا گہرا نشان چھوڑ گئیں۔

بوسہ تو میرے گال پر مختلف ہونٹوں سے کئی بار ثبت ہوا۔ مثلاً نانی، دادی، اماں اکثر میرا منہ چوم لیتیں۔ دوسری رشتے دار عورتیں آتیں یا ہم اُن کی طرف جاتے تو بھی رسماً سارے بچوں کے گالوں، پیشانی پر بوسے ثبت ہوتے۔ اڑوس پڑوس کی خواتین بھی یہی عمل دہراتیں لیکن یہ بوسہ نہ تو کسی اپنے کا تھا اور نہ ہی کسی غیر کا یہ تو ''کنجری'' کا بوسہ تھا۔ اماں، چچیوں، مامیوں، پھوپھیوں سب کے بوسے باسی کف سے کلی کر وا اور غائب آنکھوں میں آئی گدی، منہ پر چھینٹے مارو غائب نہ کوئی اچنبھا نہ کوئی سنسنی لیکن اُس کا بوسہ، تیزاب کا چھینٹا، چمڑی اُدھیڑ لینے والا، سلاخیں تپا تپا کر گودا ہوا پکا نشان۔

اس رات جب وہ ماموں غفار کی بغل سے نکل کر ٹھمک ٹھمک سامنے آئی تھی تو صحن میں موجود عورتوں کی زبر زبر بولتی کوئی دس زبانیں اپنے ہی دانتوں تلے آ کر کچا چا گئیں۔ جیسے کسی اچھی خاصی صاف ستھری فلم کا کوئی انتہائی شرمناک سین کٹتے کٹتے بھی چل جائے۔

اُس نے بڑھ کر سب کو یوں بھینچ بھینچ کر گلے لگایا، جیسے مدتوں کی بچھڑی ملی ہو اور سب بچوں کے گالوں پر چٹاخ پٹاخ بوسے دیئے۔ جن میں، میں بھی شامل تھا لیکن بچپن کی اُس حد پر، جب دیکھنے

والے تو بچہ سمجھتے ہیں لیکن وہ بچہ اُندر ہی اُندر قیامت خیز حد تک بڑا ہو چکا ہوتا ہے۔ جدید سائنس کا کوئی انتہائی جدید آلہ جیسے، جو فضا میں معلق یا نصب ہو اور جس میں برق، ہَوا، روشنی اور بے شمار نا معلوم لہریں ہم آمیز ہوتی ہوں، دم بہ دم چھٹتی اور ہر ہر لہر کے دوش پر غیر مرئی پیغامات موصول اور صادر ہوتے ہوں۔

ساری عورتیں غسل خانوں کو بھاگیں۔ پاک ہونے، نجس لباس بدلنے جنہیں اُس نے جبراً مس کیا تھا۔

ایک میں تھا کہ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور جتنا باہر کو تھا۔ اتنا ہی اُندر کی سمت بڑھ گیا اور اندر و باہر کی سمتیں ملا کر اتنی دیو قامت ہو گئیں کہ مجھے جنبش کرنا مشکل ہو گیا، جیسے چالیس کلو اُٹھانے والے باربردار پر ایک سو چالیس کلو لاد دیا گیا ہو۔ گھر کی عورتیں جب نہا دھو کر، کلمہ پھونک پھانک، لوٹیں تو اوڑھنیوں اور چہروں کی اُوٹ لے بیٹھیں۔ جیسے وہ اکیلی نہ آئی ہو بلکہ سینکڑوں تماش بینوں کے جلو میں، مجرا کرتی گھر میں داخل ہو گئی ہو اور اُن سب کے پردے ٹوٹ گئے ہوں۔

میں ابھی وہیں کھڑا تھا اور ایک سو چالیس کلو وزن سے میری کپکپاتی ہوئی ٹانگیں دوہری ہو کر نیچے ہی نیچے کہیں دلدلی زمین میں دھنس رہی تھیں۔

تبھی مامی صغریٰ نے چپت لگائی۔

''کیا بٹ بٹ دیکھ رہا ہے کبھی عورت نہیں دیکھی کیا؟ جا، جا کر وضو کر کے نماز پڑھ۔

لیکن میں گال پر سے ہاتھ اُٹھاتا تو وضو کرتا۔ جو سنسنا رہا تھا جیسے اُس پر چپت زناٹے دار تھپڑ پڑا ہو۔ دھواں چھوڑتا ہولناک انجن، کنپٹی پر سے سن سن کرتا ہوا گزر گیا۔

اُس کی وضع قطع اگرچہ عورتوں جیسی ہی تھی۔ پر اگر کسی عورت کی گردن کے اُوپر آنکھیں اور ناک ہو ہی نہ اور وہ بس ہونٹوں سے ہی شروع ہو جاتی ہو، تو پھر وہ عورت تو نہ ہوئی نا کچھ اور ہو سکتی ہے مثلاً ''کنجری''

شاید اسی لیے بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا کہ گھر کی عورتوں اور مجھ جیسے لڑکوں کو اُس سے پردہ واجب ہے۔ غالباً مذہب میں ایسا ہی حکم آیا تھا یا شاید کسی بزرگ نے ایسا فرمایا تھا۔

اُس دن سے اڑوس پڑوس کی عورتیں چادروں میں لپٹی، پلوؤں کی اوٹ لیے جوق در جوق آنے لگیں۔ جیسے ہمارے گھر لگی ایرانی سرکس لگی ہو۔ جسے دیکھنے کو تو وہ بے تاب ہوں لیکن خود کو چھپا کر

اور گھر کی عورتیں سہمی سہمی سمٹی سمٹی یوں پھرنے لگیں جیسے سرکس کے رسوں کا آڑھا ترچھا جال اُن کے سروں پر تنا ہو اور جہاں شیر ہاتھی کھلے بندوں گھومتے ہوں۔

رہتی تو وہ ہمارے گھر میں تھی لیکن اپنے گھر کی یاد اکثر اُسے گدگدا دیتی۔ جب وہ سرِ عام ماموں غفار کے گلے سے جھول جاتی یا چپکا مار کر گود میں چڑھ بیٹھتی یا کانوں کی لویں کٹکٹا ڈالتی۔

اُس وقت گھر کی عورتیں ایک دوسری میں کھسر پھسر کرتی وضو کرنے کو دوڑتیں۔ حتیٰ کہ ماموں غفار کی بیوی نمبر چار مامی صغریٰ جو میری سگی مامی تھی وہ بھی اس شرمناک منظر کی تاب نہ لا پاتیں اور درود شریف کے ورد کرتی جائے نماز پر جا بیٹھتیں۔ مصلوں پر بیٹھی ساری عورتیں ایک دوسری کی اوٹ میں زبانیں دانتوں تلے دبا کر ایک دوسری کے کان میں بدبداتیں۔

''ہوئی جو وہ ''

جیسے اُن کی زبانیں اُس کے نام سے آلودہ ہو گئیں تو پھر آیت کریمہ کا ورد بھی اُنہیں پاک نہ کر سکے گا۔

اور میں اُس وقت گال پر ہاتھ رکھ رکھ دیکھا کرتا۔ جس پر بوسے کا زخم ابھی تازہ تھا اور رستا تھا لیکن ہتھیلی پر کوئی مواد نہ جمتا تھا۔ گم چھوڑ اسا، اُسے آئے ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ عورتیں انگلیوں کی پوروں پر حساب لگانے لگیں اور سب نے متفقہ فیصلہ دے دیا کہ اُس کا ''یہ'' پیچھے کا ہے۔

لیکن کیا کیا جائے کہ ماموں غفار پچھلے بیس برس سے چار شریف زادیاں بحیثیت بیوی کے تبدیل کر چکا تھا لیکن لاولد ہی جا رہا تھا۔ پچھلے پانچ برس کی کوشش بسیار کے باوجود کوئی عورت مامی نمبر پانچ بننے پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ ماموں غفار اور میری خالائیں گھر کی کشادگی، گاڑی کی طوالت اور کاروبار کی وسعت کو کسی قصیدہ گو شاعر کی سی مبالغہ آمیزی سے بیان کرتی رہتیں۔ مامی نمبر چار دنیا جہان کے حکیموں کی کڑوی دوائیاں نگلتے اور تعویذ گنڈے پیتے، باندھتے اپنی حیثیت و مقام سے اتنی اُوب چکی تھی کہ شاید اندر سے خود وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ کوئی دوسری آئے اُس کی جگہ پر کڑوی کسیلی دوائیاں پھانکنے کے لیے اور تعویذ گنڈے اوڑھنے پہننے کے لیے اور چودہ کروڑ مشورے سننے کے لیے۔ لیکن اُس نے نہ تو پھکیاں پھانکیں نہ معجون نگلے نہ ہی تعویذ گھولے، تیر نشانے پر ٹھک سے لگا اور اُس نے یہ خوشخبری سنا دی کہ ماموں غفار باپ بننے والا ہے۔

یہ خبر ایسی تھی کہ اس کے سیاق وسباق کے بارے میں غور اُس کی سرشاری ختم ہونے کے بعد ہی

کیا جا سکتا تھا اور پھر دو چار انگلیوں کا حساب آگے پیچھے ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

خاندان میں اُس کی حیثیت خاصی مستحکم ہو چلی تھی اور بچے اب اُسے رشتوں سے پکارنے لگے تھے۔مثلاً چھوٹی ممانی، چھوٹی چاچی وغیرہ۔منہ پر ہی سہی پیچھے کنڈ تو وہ اُسی نام سے پکاری جاتی تھی جو وہ تھی۔

لیکن میں تو اُس کے سامنے بھی اُسے کبھی کسی رشتے کی کمان میں نہ کس سکا کئی بار ماموں غفار نے ٹوکا بھی۔ یہ کیا وہ......وہ......لگا رکھی ہے۔چھوٹی مامی کہا کرو۔

مجھے منہ بھر کے ہنسی آجاتی۔ بھلا ''وہ'' مامی کیسے ہو سکتی ہے۔''وہ'' کسی رشتے کی گٹھڑی میں کیونکر بندھ سکتی ہے اُس وقت میرے گال کا زخم سنسناتا تھا اور مسلسل رستا تھا۔اگرچہ کئی بار اُس نے مجھ سے گاچی، (ملتانی مٹی) پان یا نسوار وغیرہ منگوائے۔ سکے میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کئی بار اُس کی انگلیاں میری ہتھیلی سے مس بھی ہوئیں۔ ہر بار جسم کے روم روم نے تنتنا کر پکارا ''کنجری'' یہ لمس کسی ممانی وغیرہ کا ہو ہی نہیں سکتا تھا، جب وجود ہی منکر ہو تو دماغ اُسے کسی رشتے کے عمل کیمیائی سے کیسے گزار سکتا ہے۔

جس رفتار سے اُس کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا۔گھر میں اُسی رفتار سے اُس کی جگہ بھی بڑھتی جا رہی تھی بلکہ کبھی کبھی تو مجھے غلط فہمی سی پیدا ہونے لگتی کہ گھر کی دوسری عورتیں خصوصاً میری پھوپھیاں اُسے عورت کا درجہ دینے کے قریب قریب پہنچنے والی ہیں اور مجھے بھی سمجھاتی رہتیں کہ ''وہ'' دراصل پیدا تو عورت ہی ہوئی تھی لیکن بعد میں ''وہ'' بن گئی۔

کوڑ مغز عورتیں۔ بھلا ''وہ'' تو ''وہ'' ہے۔ چاہے وہ ماموں غفار سے نکاحی ہی کیوں نہ جائے لیکن پیدائش والی بات تھوڑی پریشانی پیدا کرنے والی تھی۔

اور جب اُس نے اپنے عورت سے ''وہ'' بننے کی دردناک کہانی سسکیوں اور ہچکیوں کی تال پر سنائی تو گھر کی ساری عورتیں ہونٹوں کے کناروں اور ناک کی پھنگوں پر لرزتے آنسوؤں کو ہچکیاں بھر بھر حلق میں اُنڈیل رہی تھیں اور پہلا دوسرا کلمہ پڑھ پڑھ اُس پر پھونکیں مار رہی تھیں اور وہ شیشہ ہاتھ میں پکڑے آنسوؤں کے دھبوں کو غازے کی تہہ میں تھپتھپانے لگی تھی اور پھولے ہونٹوں کو لال انگارہ بنا ڈالا تھا۔

اس رقت انگیز فضا میں بھی میری نظریں انہی لال انگارہ، سلاخوں پہ گڑھی تھیں، جن کے نشان میرے گال پر گہرے گہرے اُتر چکے تھے۔

یوں بھی میں تو ہر وقت نگاہیں جھکائے رکھتا تھا۔ بچہ تو تھا ہی، مجھے ایسی ویسی باتوں کا کیا پتہ۔

میری جھکی جھکی نظروں میں تو بس قصائی کی دُکان کا منظر لہراتا رہتا تھا۔ وہی تھار تھار کرتے گوشت کا ڈھیر، جس کی تازہ تازہ کھال اُتر چکی ہو۔ لال لال خون سے لبریز شریانوں سے بھاپ اُٹھتی ہو اور ہر ہر مسام دھواں چھوڑتا ہو میری نیچی نظریں اس سے اُوپر کبھی نہ دیکھ سکیں کہ اُس کی ناک اُونچی ہے کہ چپٹی، آنکھیں کھلی ہیں کہ چندھی، پیشانی کشادہ ہے کہ کوتاہ۔ بس ''ہونٹ'' جہاں سے وہ شروع ہوتی تھی۔ گرم سلاخیں، نشان کندہ کرنے والی، جیسے پرانے زمانے میں غلاموں کے جسموں پر مالک کا نام ونشان گود دیا جاتا تھا اور آج کل درختوں کے تنوں، جانوروں کے جسموں اور پتھروں پر لوگ اپنا نام پتہ یا ان کے نمبر یا قسم وغیرہ کھود دیتے ہیں پہچان کے لیے، اسی طرح میرے گال پر اُس نے اپنا نام اور پہچان یا پھر نمبر وغیرہ چھوڑ دیا تھا، اُس رات گھر میں برپا گھٹے گھٹے بے ہنگم سے شور سے میری آنکھ بتدریج کھلی۔

دیواروں پر سائے لہراتے تھے۔ جیسے ڈھیر سی لکڑیوں کے گٹھے سے دھواں گھٹ کے نکلتا ہوا بند سوراخوں والی چمنی میں گھومتا ہو۔ گھٹے ہوئے دھوئیں میں سے سرسر شعلہ لپکا۔

''وہ مرگئی ہے۔''

میں یکبارگی ننگے پاؤں پورے قد سے اُٹھا اور پھر جوتا پہن کر اُسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چچیاں، ممانیاں، پھوپھیاں ایک دوسرے کے گلے لگ لگ پھپھک پھپھک کرتی تھیں۔ جیسے سمجھ نہ پاتی ہوں کہ آخر کس کے گلے لگ کر روئیں اور کس سے اظہارِ افسوس کریں اور پھر اُس کی چارپائی کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ جیسے اُس کی تعزیت اُسی سے کی جانی چاہیے۔

''بیچاری نہ ماں نہ بہن، جو پنی سے لگ میت سجائے۔''

ممانی صغریٰ کے اس بین پر دھواں دھار چمنی کے سوراخ کاربن کے زور سے یکبارگی کھلے۔

''ہوتا بھی کون''

''کسی کلیجے کی بوٹی تو تھی نا یہ۔ لہو کی تانگ تو کرموں جلی کو پڑتی ہوگی۔ کوئی اپنا نہ پرایا شوہدی کو کیسی موت آئی۔''

ہر ایک باری باری بین اُٹھاتی جا رہی تھی۔ جیسے دردناک لے والے ٹپوں کی باری دے رہی ہوں۔

اور میں جوتے پہنے چارپائی پر پاؤں لٹکائے نیچی نظریں اُٹھائے انہیں اپنی اپنی باری دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ''وہ'' مرگئی کیا ''وہ'' کو موت بھی آسکتی ہے۔ ایسا تو نہ کبھی سنا نہ پڑھا۔ کیا کسی بزرگ

نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مر بھی سکتی ہے۔'' ممانی صغریٰ نے پکار کر کہا۔'' فیروز! آ چھوٹی ممانی کا چہرہ دیکھ لے۔ پھر یہ چہرہ کہاں دیکھا جائے گا۔''' ' چہرہ'' اُس سے تو پردہ واجب تھا۔ بزرگوں کا یہی خیال تھا اور خود میرا اپنا یہ خیال تھا کہ جس طرح ''وہ'' کا چہرہ نہیں ہوتا اسی طرح ''وہ'' کو موت بھی نہیں آتی۔ میں نے عورتوں کے دائرے میں بچھی چارپائی کی اور نظر کی۔

سفید چادر میں چھپا اُس کا جسم سکڑ چکا تھا۔ جیسے ایک ہی دھلائی میں ڈھیلا ڈھالا کپڑا اشرنک ہو کر ناکافی ہو جائے۔ پتہ نہیں گدھ نوچ لے گئے کہ کتے بھنبھوڑ گئے۔ قصائی کی دکان پر لٹکتی گوشت کی پنڈ مٹھی بھر ہڈیوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ تبھی ماموں غفار صحن میں داخل ہوئے۔ بین کرتی ہوئی ساری عورتیں اُن کی جانب لپکیں۔ جیسے اب سمجھ آئی ہو کہ اصل میں تعزیت کس کے پاس کرنی چاہیے۔ بینوں کی باری پھر شروع ہوئی۔

'' تجھے مبارک باد دیں کہ افسوس کریں۔''

'' تجھے صاحب اولاد کر کے خود مر گئی۔''

''بیٹی ہوئی ہے بالکل تجھ پر گئی ہے۔''

ممانی صغریٰ کے کلیجے سے چمٹا، تولیے میں لپٹا، بوٹ سا کسی نے ماموں غفار کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ ماموں غفار کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے وہ بے تحاشا چیخنے لگی۔ جیسے پُرسا دے رہی ہو۔ اُس کے چیخنے پر عورتیں کھل کر برسیں۔

'' خون کا رشتہ ہے، روتی ہے۔ یہی تو ایک رشتہ ہے بیچاری کا رونے والا، رو لے ماں کو، جی بھر کے رو لے، پھر ساری حیاتی یاد کر کے روتی رہے گی۔''

ماموں غفار نے وہ چیختا ہوا بوٹ میری گود میں ڈال دیا۔ شاید میری نشست زیادہ باسہولت تھی۔ میں جو چارپائی پر جوتا پہنے پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ وہ بری طرح چلا رہی تھی۔ اُس کے دونوں ہونٹ کھلے تھے۔ پورا چہرہ ہونٹوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میری نیچی نظریں ہونٹوں میں ترازو ہو گئیں۔

ہُو بہو وہی۔ وہی تپتی ہوئی دو سلاخیں۔ چمڑی اُدھیڑ لینے والی۔ نشان کندہ کر ڈالنے والی۔

وہ......وہ...... پیدائشی ''وہ''..... ہُو بہو ''وہ''......

''کنجری''

درخواستیں

دونوں نے اپنے اپنے بچوں کے تصاویری البم بریف کیسوں میں سے نکالے، بالشت بالشت بھر، سر اُبھارے حرف راشد کے لبوں پر پھدکنے لگے، کچھ دیر انہیں زیرِ زباں دباتا اور ناصر کو بیانیہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، لیکن ناصر اپنے البم میں پلکوں پلکوں دھنسا تھا مخل ہونے کے خیال سے راشد نے اپنے بے قرار لفظ دانتوں تلے دبا لیے۔ دفتر سے سیدھا گھر جانے والا گھر بستی شوہر شاید اپنی خواب گاہ میں محبوب بیوی کی قربت میں پوری دنیا کو طلاق دے چکا تھا۔ راشد کی نظروں کی درز ماری سے گڑبڑا گیا، جیسے کسی شریر بچے نے انتہائی نامناسب وقت پر دھڑ دھڑ دروازہ پیٹ ڈالا ہو، ہڑبڑا کر خود کو سمیٹا، بیوی کے پہلو سے لگے بیٹے کی تصویر پر پوُ رنگا کو خود کو سنبھالا دیا۔

''یہ میرے بیٹے کی پانچویں سالگرہ کی تصویر ہے''

راشد نے ہاتھ برابر گردن سامنے بڑھا کر دیکھا۔

''ہاں عمیر کی نا اور ساتھ میں یہ تمہاری بڑی بیٹی زری اور یہ چھوٹی نومی ماشاءاللہ بہت ہی پیارے بچے ہیں۔ پندرہ نومبر کو سالگرہ ہوتی ہے نا، عمیر کی..... کل ہی فون پر تم سے تحفے کا مطالبہ کر رہا تھا۔''

اپنے متعلقات کا ذکر اور وہ بھی توصیفی ذکر جیسے وجود کے گدلے حوض میں ٹیوب ویل سا کھل

جائے۔اس آبِ حیات میں ڈبکی لگانے کی اب راشد کی باری تھی۔دانتوں میں پکڑی ہنسی اور ہاتھ میں پکڑے البم کو ذرا ڈھیلا چھوڑا۔

''ہاں یہ تمہاری بڑی بیٹی فائزہ کلاس فور میں فسٹ آنے پر انعام لے رہی ہے اور ساتھ میں اُس کی بیسٹ فرینڈ عمارہ،سیکنڈ آنے پر اپنا انعام وصول کر رہی ہے۔''

راشد کے لبوں پر کلبلاتے حرف قطاریں بنانے لگے۔

''یہ کوکو ہے اپنی پہلی سالگرہ پر......ساتھ میں کوکو کی ماما......''

جیسے ماما نے پیچھے سے آ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے ہوں۔وہ لمس کی مہک کو بوجھنے اور مہکنے لگا۔لفظ بے آواز ہو گئے۔کیتلی میں پانی کھول گیا تھا۔راشد نے اٹھ کر دو کپ چائے بنائی۔ایک کپ گرہستی کے بخار میں پھنکتے Home Sick راشد کے قریب رکھا،دوسرے سے چسکی لے کر ہانڈی میں چمچہ ہلایا،جسے راشد نے بھون کر دم پر لگا رکھا تھا۔چولہا بند کیا،دونوں کمرہ لاک کر کے باہر نکلے۔قریبی تنور سے چار روٹیاں خریدیں،دودھ کا پیکٹ اور کچھ پھل لیے۔ناصر نے پیسے دینے چاہے تو راشد نے بڑھ کر ادائیگی کی کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ آج واپسی پر گوشت اور گھی وغیرہ ناصر لے کر آیا تھا۔دونوں میں کچھ طے نہ تھا۔اس کے باوجود ایسے میکانکی انداز سے حساب کتاب درست رہتا کہ کہیں کچھ غلط فہمی نہ ہوتی۔انسان کے اندر بھی ناپ تول کا اک اشاری نظام قائم ہے،جو دیانت کے ترازو پر ٹکا ہے،جس کا توازن اُس وقت گڑبڑاتا ہے،جب مفاد یا خوف کے باٹ کم یا زیادہ ہونے لگتے ہیں۔

چاروں کھونٹ سمندر شہر پھیلا تھا۔وسیع،بے کنار شور کریں مارتا لہریں اُڑاتا۔بحری بیڑوں کو غرقاب کر دینے والی گہرائی لئے،لائٹ ہاؤس کی روشنیوں سے کہیں دور بھٹکا دینے والی وسعتیں اور انسانی بستیوں کے گھونٹ بھرتی آدم خور لہروں کی تندی سمیٹے ہوئے۔

سمندر کنارے بسے شہر بھی سمندر کے اوصاف سمیٹ لیا کرتے ہیں۔شوکتی اخلاقی دھوئیں کے جھاگ اُڑاتی گاڑیوں کے لہر در لہر سلسلے بے کنار چکنی سڑکوں سے ٹکراتے اور بہتے،پتہ نہیں کن بے خبر اور بے انتہا رستوں پر،شاید برمودہ تکون کے اسرار میں کہیں دفن ہونے کے لیے۔اس ذخار سمندر میں یہ دو اجنبی قطرے بھلا کیوں انڈیل دیئے گئے تھے،جن کی تاثیر،ترکیب،بُو باس،کچھ بھی تو اس کھارے سمندری پانی سے میل نہ کھاتا تھا۔سمندر میں مل سب سمندر ہو جاتا ہے لیکن پانی کا اپنا خمیر رنگ ذائقہ

شناخت سب قطرے کی مٹھی میں بند۔سمندر کے پیٹ میں سیپی بن جاتا ہے۔وسعتیں اور گہرائیاں اور بھیڑ کی تنہائیاں دہشتیں اور اسرار پیدا کر دیتی ہیں۔سمندر کے پُرسکون چلن میں بھی اللہ جانے کیا کچھ سمٹا ہو۔جنگل، چٹانیں، آئس برگ، مخلوقات کی ہزار ہا اقسام۔دونوں سہمے سہمے،اپنے وجود کی گٹھڑی میں بندھے ہوئے۔کتنی زیادتی تھی اُن دونوں کے ساتھ کہ اُنہیں اُن کی مانوس زمینوں سے اکھیڑ کر اس سمندری جنگل میں پھینک دیا گیا۔کیا پنجاب میں اُن کے لیے کوئی سیٹ نہ بچی تھی۔یہ مشترکہ دکھ دونوں کے بیچ دوستی اور یگانگت کی اکائی بن گیا تھا۔دونوں ایک سے حالات یا ایک سی زیادتی کا شکار ہو کر ایک دوسرے کے قریب ایسے آ گئے جیسے طوفان کی زد میں آئی بستی کے بچے کھچے آفت زدگان ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر رو، دیتے ہیں اور ایک کی بقا دوسرے کا سامان وجود ہوتا ہے۔ایک دوسرے کے ہمدرد، قریبی، مخلص، دوست، انسانیت و آدمیت کا فطری رشتہ اپنی تمام تر اصلیت اور خلوص کے ساتھ مشترکہ خوف اور مشترکہ مفاد سے مشروط ہو جاتا ہے۔اس سمندر شہر کی کیمسٹری بھی عجب ہے جو اس میں رچ بس گیا تو پھر سانس میں گھلی مہک کی طرح الگ ہونا مشکل ہو گیا، کہا جاتا ہے اس شہر کی لڑکیاں کہیں باہر بیاہی چلی جائیں تو شوہر کو اکھیڑ کر یہیں آ بستی ہیں یا پھر طلاق لے لیتی ہیں لیکن وہ تو آئے ہی اس شہر میں اُس وقت تھے جب اُن کی جڑیں اپنی زمین میں دُور دُور تک پھیل چکی تھیں جن کی گاچی نکالنے کی کوشش کی جائے تو ٹوٹ جائے اور کہیں اور گاڑ دیں تو سُوکھ کر ایندھن بن جائے۔

ان اجنبی پودوں کو پیڑ بننے سے پہلے اگر اس مٹی میں لگا دیا جاتا تو پھر شاید حمیرا صدیقی کے گول گول ہونٹوں کی مسکان میں کوئی شگوفہ پھوٹتا، ٹائپسٹ رابعہ کے گھر سے آئے ٹفن کی گرماگرم بریانی کی دعوت کے ثمر کو چکھنے کی اشتہا مچلتی اور اس مٹی کی زرخیزی جڑ کٹے پودوں کو اپنی بُو باس بخش دیتی۔پر وہ دونوں تو اپنی جڑیں گلے میں ڈالے آئے تھے نامانوس مٹی اور پانی میں اُترے نہ بھیگے، کرنڈ کی طرح کہ دال گل کر بھس ہو جائے پر کرنڈ کی ریڑک نہیں جاتی۔

دونوں اکٹھے دفتر سے اُٹھتے، ایک سواری لیتے، ایک کمرے میں رہتے اور سارا فارغ وقت ٹرانسفر کے لیے درخواستیں لکھتے ہوئے گزارتے ناصر کی انگریزی اچھی تھی وہ دو درخواستیں ایک ساتھ لکھتا، ایک اپنی اور دوسری راشد کی، یا پہلے راشد کی اور بعد میں اپنی، دونوں کے مسائل تقریباً یکساں تھے۔کسی سے کچھ پوچھنے بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔یوں چھ ماہ میں کون سا ایسا مسئلہ، مشکل یا راز

تھا، جو اُنہوں نے ایک دوسرے کو نہ سونپ دیا ہو۔ ایک دوسرے کی چھایا میں بیٹھ کر اپنی اپنی من گٹھڑی کھول دیتے۔ کسی چوری، کسی عیاری، کسی خیانت کا کوئی دھڑکا نہ تھا۔ مشترکہ مفاد اور مشترکہ خوف اِک دُوجے سے بددیانتی نہیں کیا کرتے...... ابھی تک اُن کی درخواستیں بے نتیجہ ہی رہی تھیں۔ وہ زچ ہوتے اور فرسٹریشن کو اظہار دیتے۔

''یہاں سے کسی کو بھجوا کر تو دیکھیں نا، صوبائی خود مختاری کی تحریک نہ چلا دیں۔ پہیہ جام ہڑتال کروا دیں۔ آدھا شہر جلا کر نہ رکھ دیں، اس سلگتے ہوئے شہر کی تپش سے سہمے ڈرے وہ رات کے کھانے کے بعد باہر نکلتے، قدم قدم پر اجنبی رستوں کا کھٹکا، کمین گاہوں کا دھڑکا پتہ نہیں واپس کیسے جا سکیں گے اپنے قدموں پر یا تابوتوں میں بند، زرد نوکیلے دانت نکوسے، مکروہ چہرہ ننگی جارحیت، بڑے بڑے سٹورز کی کئی کئی منزلہ لفٹیں چڑھتی اُترتی، بے یقینی، خوف اور اشیاء سے منہ سَر لتھڑے ہوئے سٹورز...... اُن کی نظر صرف لیڈیز اور بچوں کے گارمنٹس پر ہی پڑتی، دونوں آپس میں مشورہ کرتے۔

''ٹراؤزر کا یہ سائز کوکو کو پورا ہو گا۔''

''فائزہ کے لیے یہ شرٹ ٹھیک رہے گی۔''

اگرچہ دونوں نے ایک دوسرے کے بچوں کو کبھی نہ دیکھا تھا لیکن اُن کے ناپ اور شخصیتیں ازبر تھیں، واپسی پر پی سی او سے اپنے اپنے گھر فون کرتے اور فون کی ساری تفصیلات اور جزئیات ایک دوسرے کو سناتے رہتے، چیونگم کی طرح چبائے جاؤ، مٹھاس پہلے ایک دو چباؤ میں ہی ختم، لیکن چباؤ کی مصروفیت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

عید قریب تھی، دونوں نے درخواستیں دے رکھی تھیں کہ عید کے ہفتے کے ساتھ اُنہیں ایک ایک ہفتے کی مزید چھٹی دی جائے کیونکہ اس عرصے میں وہ وزیر اور چیئرمین وغیرہ تک پہنچنے کے کئی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے کہ وہ واپس اپنے اپنے شہر یا کم از کم اپنے صوبے میں ہی لوٹ سکیں، راوی بحیرۂ عرب میں اُتر، اپنے وجود کی نفی نہ چاہتا تھا۔ وہ اپنے اپنے اسٹیشنوں پر کتنے اہم، ممتاز اور ضروری تھے۔ اس ہیڈ کوارٹر کے سمندر آفس میں تو بڑی بڑی مچھلیاں پڑی تھیں۔ اب ان گرانڈیل وہیل اور شارکوں کے سامنے ان راوی کے ٹھگوں کی کیا وقعت، چھوٹے شہروں کے دفاتر میں تو رانجھا یار چوڑا ہو ہو پھرتا ہے لیکن بڑے اسٹیشنوں پر تو ساری سہولیات، ساری رانجھیت، بڑے بڑے چندر ینک سمیٹ

کر گرین نمبر پلیٹ گاڑیوں میں ڈال لے جاتے ہیں اور رانجھا یار انیسویں گریڈ میں ہو کر بھی کلرک ہی رہ جاتا ہے اور دعا مانگتا پھرتا ہے۔

سجیاں ہو جاون گلیاں تے وچ رانجھا یار پھرے

عید کے فوراً بعد راشد ٹرانسفر ہو کر اپنے شہر میں آ گیا، جہاں اُس کی بیوی بھی نوکری کرتی تھی۔ ناصر نے اپنی ٹرانسفر کے لیے کوششیں تیز تر کر دیں، راشد ان کوششوں سے متعلق جان کر اپنے ماتحتوں کو جھاڑنے لگتا، ٹائپسٹ کی غلطیاں ناقابل برداشت ہو جاتیں، پی۔اے بلاوجہ بار بار کال ملانے لگتا، اور چائے کا کپ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جاتا۔

پنجاب میں اگرچہ ایک دو سیٹیں اور بھی خالی تھیں لیکن دور دراز، سب سے نمایاں اور اہم سیٹ راشد کے آفس میں ہی خالی تھی جس کے پر ہونے کے تصور سے راشد کے روم روم میں رعشہ سا طاری ہو جاتا اور شریانوں میں خون کے کلاٹس بنتے۔ راشد ڈیڑھ دو مہینے میں ہیڈ آفس کے ثمرات میں نکو تک ڈوب چکا تھا۔

بچے سرکاری گاڑی میں سکول جانے لگے۔ سبز نمبر پلیٹ گاڑی کا ٹھکا اور رعب ہی بڑا ہے، جس میں سے اُترتے ہوئے بندہ خود کو پاکستان کا حاکم سا سمجھنے لگتا ہے۔ بڑی بڑی مرسڈیز اور بی۔ایم ڈبلیو بھی اس سبز پلیٹ کے سامنے محکوم سی لگتی ہیں۔ بیگم کے عزیزوں رشتہ داروں سے ملنے ملانے کا سلسلہ بھی بڑھ گیا۔ کبھی ایک شہر کبھی دوسرے شہر سرکار کا پٹرول جلنے لگا۔ دفتر میں فالتو لگے ہوئے اے سی گھر میں شفٹ ہو گئے۔ اُس سال گرمی بھی ہمیشہ سے زیادہ پڑنے لگی، کیونکہ گھر اور دفتر کا میٹر ایک تھا۔ کمرے میں کوئی موجود ہوتا یا نہ ہوتا، پر اے سی بند نہ ہوا کرتا تاکہ باہر سے آئیں تو کمرہ ٹھنڈا ملے۔ دفتر کا نیا کمپیوٹر گھر میں شفٹ ہو گیا، بچے کمپیوٹر اور گاڑی دونوں پر ہاتھ سیدھا کرنے لگے۔ خود راشد سبزی گوشت پھل اور گراسری وغیرہ کے بھاؤ بھول گیا کیونکہ یہ ساری ڈیوٹی دفتر کے ایک سپرنٹنڈنٹ نے لے رکھی تھی۔ رشوت خوری کی گزوں لمبی شکایتوں کے باوجود جس کی تعیناتی راشد نے دفتر کی ایک اہم سیٹ پر کر دی تھی۔ صبح صبح گھر میں وافر سودا سلف پہنچ جاتا کئی دفعہ فون کر کے پوچھ بھی لیا جاتا کسی چیز کی ضرورت اور ضروریات تو بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ سرکاری گاڑی دن میں کئی کئی بار بازار کا چکر لگاتی، گھریلو مشینری کے خراب اور پھر ٹھیک یا تبدیل ہو جانے کا راشد کو پتہ ہی نہ چلتا، پردے قالین کب دُھلے یا تبدیل ہو

گئے۔ بچوں کی فیسیں اور بل کب جمع ہوئے۔ شاپنگ کس وقت ہوتی اور درزی اور دھوبی کو کپڑے کب دیئے جاتے اور کب واپس آتے۔ راشد کے علم میں کچھ نہ رہا تھا۔ وہ تو بس ریوالونگ چیئرز پر بیٹھ کر فائلوں کے پیٹ چاک کرتا، اُنہیں ضرورت کے مطابق بھرتا اور رفو کرتا رہتا، جن میں سے انڈے بچے نکال اور کھو کھے چھلکے ڈال، مورے بنا دیئے جاتے، اب بند پیٹ کی اندرونی کہانی کون جانے۔ شہر میں شاید زیادہ شادیاں ہونے لگیں اور زیادہ بچے پیدا ہونے لگے تھے کہ ہر وقت مٹھائی کے ڈبے اور پھلوں کی ٹوکریاں اور تحائف کے پیکٹ گھر میں رُلنے لگے۔ بچوں کو میکڈونلڈ، کے۔ ایف۔ سی اور پیزا ہٹ کے ذائقے اچھے لگنے لگے۔ پہلے تو بس کسی بچے کے فسٹ آنے یا سالگرہ پر ہی وہ ان ہاتھی دانت سے بنے قیمتی کھانوں کو چکھ سکتے تھے۔ پھر بھلا ٹیسٹ کیسے ڈویلپ ہوتا، وہ فوڈ جنہیں وہ اُونچی دکان پھیکا پکوان کہہ کے تھوتھو کرتے تھے۔ اُس کے نئے نئے فلیور اور معیاری Ingredients بھی معلوم ہوئے۔ اب منہ بنانے کی بجائے بچے یمی یمی کے نعرے لگاتے۔

راشد کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ دفتر کا ایک چپڑاسی بہت اچھا کک ہے۔ سوپر، چپڑاسی کی چھپی صلاحیتوں کو بیگم نے کھوج نکالا تھا۔ یہ بھی انہی شاہی سیٹوں کی کرامت ہے کہ درجہ چہارم کے ان ملازمین کو جس فرض کی ادائیگی کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے۔ وہ اُس کے لیے کبھی مناسب نہیں ٹھہرتے۔ اُن کی نئی نئی صلاحیتیں صاحبوں کی کوٹھیوں میں تخلیق کی جاتی ہیں۔ کک کے ہوتے ہوئے بھی ہوٹلنگ بڑھ گئی تھی۔ بل دینے کا وقت آتا تو ویٹر مؤدبانہ عرض کرتا اُس ٹیبل پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ ادائیگی کر گئے ہیں۔ بچے چیختے ''کس ٹیبل پر کس ٹیبل پر'' تو راشد بے نیازانہ ہاتھ فضا میں لہراتا'' چلو کل فون آ جائے گا جس نے بھی Payment کی ہوگی۔'' کسی پارک میں جاتے تو پیچھے پیچھے بوتلیں آئس کریم چلی آتی۔'' یہ کس نے بھیجا ہے۔ چلو کل فون آ جائے گا، فائل کے ساتھ'' راشد بچوں کو کھانے کا اشارہ کرتا۔ ''ہم رزق سے کتنا ہی بچنے کی کوشش کریں اس سیٹ کے مقدر کے رزق کو ہاتھ پَیر لگے ہیں۔ خود بخود چل کے پیچھے چلا آتا ہے۔''

بیگم کو مقامی لون وائل چبھنے لگی تھی۔ بدن کی جلد زیادہ ہی حساس ہوگئی تھی۔ گل احمد اور الکرم کی لونیں ہی کچھ سکون دے پاتیں۔

بچوں کے جسموں کی ساخت بھی یورپین بچوں جیسی ہوتی جا رہی تھی۔ صحیح فٹنگ صرف امپورٹڈ

ڈریسز میں ہی ملتی یا پھر Chen One جیسے سٹورز میں کبھی کوئی چیز پسند آ جاتی۔

راشد سرکاری سہولیات کی ہیروئن کا پوری طرح Addict ہو چکا تو ناصر کا تقرر بھی اُسی کے آفس میں کر دیا گیا، چونکہ ناصر راشد سے سنیارٹی میں ایک آدھ نمبر اوپر تھا۔ راشد کو لگا اُس کا ٹرانسفر آرڈر نہیں ہوا بلکہ آفس کی گاڑی، سرکاری رہائش، ٹیلی فون اور امتیازی اختیارات اور سہولیات سب اسی پروانے میں لپیٹ اُس کے منہ پر مارے گئے ہیں جس میں سرکاری اختیارات کی مدھ بھری معشوقہ اب ناصر کے نام لکھ دی گئی ہے۔ آخر ناصر اُس کا دوست ہے کسی دوسرے افسر کی نسبت اُس کے لیے بہتر ہو گا، لیکن سرکاری اختیارات میں کسی دوسرے کو شیئر کروانا ایسے ہی ہے جیسے اپنی معشوق کو بانٹنا، زن، زر، زمین کی کھلی اور اجڈ رقابت کی دہشت گردیاں سرکاری اختیارات کی پالش رقابت کے خفیہ اور انٹلیکچول مشنوں کے سامنے منہ چھپاتی پھرتی ہیں جیسے القاعدہ اور صدام وغیرہ کی کھوکھلے ڈھول سی بھونڈی دہشت گردی، افغانستان اور عراق میں امریکی پالش مشنوں کے سامنے پتھر کے دور کا بے ساختہ......ہتھیار معلوم ہوتے ہیں۔

راشد ناصر کو لینے ایئر پورٹ گیا، تو گلے ملتے ہوئے دونوں کو لگا کہ اندر سے، روح سے اور لہو سے اُمڈتی وہ دوستی والی حرارت تھرماس کے موٹے شیشے میں بند ہو گئی ہے اور دونوں کے بیچ ایک انچ موٹی دھات والی کوئی سطح آ ٹھہری ہے اور وہ دراصل اُسی کو بھینچ رہے ہیں۔ راشد کے دل سے ناصر کو گھر ٹھہرانے والا خیال بھک سے بھاپ کی طرح اُڑ گیا اور ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی ریسٹ ہاؤس کی سمت موڑ لے۔

رستے میں ناصر آفس کے بجٹ، سٹاف کی تعداد، کام کی نوعیت سے متعلق مسلسل سوال کرتا رہا اور راشد کو لگا کہ اُس کا دوست وہیں کہیں ساحلوں کی ریت میں گم ہو گیا ہے اور ریت کی ساری ٹھنڈک، ساری بھربھری ریت اس اجنبی باس کے مزاج میں بھر گئی ہے، جو کسی Dismiss Order کی طرح اُس پر لاگو کر دیا گیا تھا۔

ریسٹ ہاؤس پہنچ کر ناصر نے کہا۔

''راشد صاحب گاڑی یہیں چھوڑ جایئے مجھے شاید کہیں جانے کی ضرورت پڑ جائے آپ رکشہ پر گھر چلے جائیں۔''

راشد کو لگا اگر کوئی دوسرا افسر ہوتا تو شاید یوں اُس کی تذلیل نہ کرتا۔ ایکیول رینک ہوتے ہوئے بس ذرا سا سنیارٹی کا فرق...... شاید اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے کھلی کتاب ہیں اور پرکھ کے لیے مطلوبہ انتظار کی زحمت اُٹھانے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ ''مجھے چھوڑ کر گاڑی آپ کے پاس واپس آ جائے گی۔''

یہ کہتے ہوئے راشد کی زبان پر آئی پہلی بات واپس حلق میں پلٹ گئی کہ کل لنچ اکٹھے کریں گے۔ یوں بھی نئے صاحب کی آمد کی خبر کے ساتھ لنچ کی کئی کالیں دفتر کی میز پر اور ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں منتظر پڑی تھیں اور راشد کے گھر سودا سلف پہنچانے والا اسپرنٹنڈنٹ پہلے ہی سب رابطے سمیٹ ریسٹ ہاؤس میں موجود تھا، جس نے ڈرائیور کے ہاتھ سے چابی اُچک کر فی الفور نئے صاحب کے حوالے کر دی۔

وہ خود بخود ایک دوسرے کو آپ، سر اور جناب سے پکارنے لگے تھے اور کوکو، فائزہ، زری، نومی سب نام یادداشتوں سے محو ہو گئے تھے۔ ناصر سے تو دوسرے شہر میں مقیم زری، نومی، عمیرا اور عائشہ کے ذکر کی فرصت بھی دفتری امتیازات کی مصروفیت نے نگل لی تھی۔ یہ بیوی، بچے بھی شاید آفت زدگی کی امداد جیسے ہی ہوتے ہیں۔ کسی زلزلے، طوفان اور سیلاب جیسی ناگہانی حالت میں جن کی ضرورت Life Save دوائی جیسی ہو جاتی ہے، لیکن اختیارات اور اہمیت کی مصروفیت ان کی افادیت کم کر دیتی ہے، جیسے بحالی کے دَور میں خیراتی خیموں اور کمبلوں کی طرح فالتو۔

راشد کو جیسے آفس کا مین کمرہ، کلیدی اختیارات، گاڑی، سرکاری رہائش ہی نہ چھوڑنے پڑے ہوں۔ بلکہ اُس کا ایک ایک بچہ چُن چُن کر بردہ فروش نے اُچک لیا ہو، جن کی جدائی کے گھاؤ میں قاتل کی شبیہہ بار بار اُبھرتی، وہ انگلیاں مروڑتا پٹاخے نکالتا۔ چہرے کے مسل پھڑ پھڑاتے، حلق سوکھتا، پانی منگوانے کے لیے دس دفعہ بیل دیتا، تب کہیں اُونگھتا ہوا کوئی چپڑاسی دروازے سے خود کو گھسیٹتا ہوا جھانکتا۔ کہاں ابھی بیل کا حلق پورا کھلتا بھی نہ تھا کہ چار چار چاق و چوبند چپڑاسی ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔ آنے والا ہر سائل اس کے سوٹ سے میچنگ ٹائی، بوٹوں کی چمکدار پالش اور کوکو کی توتلی باتوں کو دہرا دہرا کر سامنے پڑی فائل میں قطرہ قطرہ بہے چلا جاتا۔ کہاں اب کہ آنکھیں لپیٹ کر گزر جاتے کہ کہیں نظریں چار نہ ہو جائیں اور سلام کرنے کا وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ سرکاری اختیارات کی ہیروئن کی عدم

دستیابی سے راشد کا جسم ٹوٹتا، سر چکراتا، چال کی لڑکھڑاہٹ دوسروں کے لیے تضحیک کا سامان پیدا کرتی۔ جہاز، جہاز کے آوازے اُس نے خود کئی بار سُنے۔ یہ سب وہی تھے، جونیئر آفیسرز، کلرک، چپڑاسی جو اُس کے عہدے کی تختی کے سامنے سلیوٹ مار کر اندر داخل ہوتے، جب تک وہ ہنستا رہتا، مصنوعی بتیسیوں کی نمائش لگی رہتی۔ جب وہ چپ ہوتا تو باچھیں بھینچ لیتے۔ جب وہ ڈانٹتا تو یس سر 'Ok' سر کے سوا آواز نہ آتی۔ یہ سرکاری سیٹ بھی بڑی ہرجائی اور بے وفا ہے۔ ادھر ٹرانسفر آرڈر ٹائپ ہوا، ادھر کک کی نانی فوت ہوگئی۔ ڈرائیور کو اپنے گاؤں سے پیغام آ گیا۔ سویپر کا بیٹا بیمار ہوگیا۔ مالی خود بیمار پڑ گیا۔ ابھی تو ہرجائی سیٹ پہ نیا افسر پہنچا بھی نہیں ہوتا کہ سارے متعلقین پرانے کی مٹھی سے را طوطے کی طرح اُڈاری مار نئے کے راستے کے پیڑوں پر جا چہچہاتے ہیں اور میاں مٹھو چوری کھانی ہے، کا ورد شروع کردیتے ہیں۔

راشد اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا، جیسے میلے میں بھٹکا ہوا بچہ، اینٹی ڈیپریشن گولیوں کے پھکے مارتا۔ گھر سے آنے والے بیوی بچوں کے فون کسی اُجڑی ہوئی آفت زدہ بستی کی رپورٹ پیش کرتے، کک بڑے صاحب کے لانوں کو پانی لگانے والا مالی بن چکا تھا۔ سویپر بڑے صاحب کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں شفٹ ہوکر چوکیداری کے عہدے پر ترقی پا گیا تھا۔ وہی کوٹھی جہاں دونوں Split Unit لگے رہ گئے تھے، جس کے بڑے بڑے لانوں کی یادیں بچوں کے دلوں کے گھاؤ بن گئے تھے، پرانے گھر کا اے سی اور ایئر کولر خراب ہوئے پڑے تھے جنہیں ٹھیک کروانے کے لیے لے جانے والا کوئی نہ تھا، پرانی سوزوکی کار کی بیٹری فیل ہوگئی تھی اور کھڑے کھڑے گاڑی کو زنگ لگ گیا تھا۔

راشد سوکھی ساکھی خط و کتابت اور ریسرچ ورک جیسے بے عمل فرائض کو پینڈنگ کرتے ہوئے سوچتا اُنہیں بستے بستے گھر سے اُجاڑ کر افغانی پناہ گزینوں کی سی زندگی دینے والا یہ ناصر ہے جو سرکاری اختیارات اور ان کے ذریعے پیدا کی گئی ناجائز سہولیات پر کیسے اتراتا پھرتا ہے۔ گاڑی سرکاری کاموں کے لیے ہوتی ہے۔ نہ کہ گھر کی ڈیوٹیوں کے لیے، بجلی، ٹیلی فون، ملازم سب کا ناجائز استعمال کس دیدہ دلیری سے ہو رہا ہے۔ اے۔سی، فریج، طلائی سیٹ، بند لفافے کتنی صفائی سے گھر پہنچتے ہیں اور کتنی مہارت سے فائلوں کے پیٹ سیاہی سے بھرتے اور سونے کے انڈے نکال لیے جاتے ہیں۔

بجٹ کا بیشتر حصہ کھایا جا چکا ہے۔ گاڑی، برف، کونلوں، انٹرٹینمنٹ کی مد کا کتنا روپیہ راشد

نے چھوڑا تھا۔ سب برابر ہو گیا۔ راشد اُن دِنوں قوم کے غم میں دن رات گھلنے والا محب وطن انسان بن چکا تھا۔ ملک کے وسائل لوٹنے والوں کے خلاف لیکچر دیتا، اور اسلام میں اُن کی سزاؤں کے فتوے وغیرہ کوٹ کرتا، الراشی والمرتشی والی آیت زبانی یاد کر چکا تھا، بلکہ فریم کروا کے دفتر کی سامنے دیوار پر آویزاں کر رکھی تھی۔ جہاں آتے جاتے کی نظر بخوبی پڑتی تھی۔ فون پر اپنے ہمدردوں کو ناصر کی غلط کاریوں کی رپورٹ قرآنی حوالے دے دے کر بیان کرتا اور اپنے اعلیٰ کردار اور اپنے دور کی اعلیٰ کارکردگیوں کی مثالیں پیش کرتا۔

دفتر کے عبداللہ بن ابی جیسے کردار ایک کے کمرے سے نکل کر دوسرے کے کمرے میں جاتے اور ایک دوسرے کے عزائم اور کارگزاریوں کی رپورٹ دونوں کو متواتر دیتے رہتے۔ دونوں کے درمیان بات چیت خود بخود ختم ہو چکی تھی۔ دفتری امور لکھت پڑھت کے ذریعے ہی انجام پذیر ہوتے۔ کبھی کبھار جب فائل پر لکھا ہوا آتا Discuss with me. تو راشد کو طوعاً کرہاً جانا پڑتا، ناصر بہت کم اُسے بیٹھنے کو کہتا، عموماً وہ کھڑے کھڑے ہی انسٹریکشن لے کر واپس آ جاتا اور ناصر کے مزاج کے فریزر میں جم جاتا۔ ناصر کو اُس کی ہر بات مشورہ معلوم ہوتی اور راشد کو آرڈر، راشد کو ناصر کا رویہ تحکمانہ معلوم ہوتا اور ناصر کو گستاخانہ، دونوں کے مزاج کی تبدیلی نے ذاتی مفاد، ذاتی خوف کی اُلٹتی ہوئی بساط میں ساری مشترکہ فراخی، یکساں جذبے، ساری دوستی، لپیٹ دیئے تھے، جس نے دونوں کو ایک نئی درخواست لکھنے پر مجبور کر دیا، لیکن اس بار دونوں کے موضوع الگ الگ تھے۔ ناصر نے اپنی خوبصورت انگریزی میں ایک درخواست لکھی، جس میں ہیڈ کوارٹر کو مطلع کیا گیا تھا کہ راشد Irresponsible, non-Cooperative and corrupt افسر ہے۔ لہٰذا اس آفس کو اس کی ضرورت نہیں رہی، بہتر ہوگا کہ اسے واپس ہیڈ کوارٹر بلا لیا جائے۔

راشد کی انگریزی اگرچہ ناصر جیسی اچھی نہ تھی لیکن جو اُس نے درخواست لکھی وہ بڑی زوردار تھی، جس میں ناصر کے Illegal کاموں کے Documentry ثبوت منسلک تھے اور لکھا تھا۔

''کہ اس دفتر کو بچانے کے لیے ناصر جیسے کرپٹ افسر کو ٹرانسفر کیا جانا از حد ضروری ہے۔ بہتر ہو گا کہ اسے واپس ہیڈ آفس میں بلا لیا جائے۔'' دونوں کی درخواستیں بیک وقت ہیڈ کوارٹر میں پہنچی تھیں، جہاں پہلے ہی اُن کی فائلیں درخواستوں سے بھری پڑی تھیں لیکن Same سبجیکٹ والی......

سلیپنگ بیوٹی

لمبی پھیلی بانہوں والی منتظر کھڑی سیڑھی کے کشادہ سینے میں وہ چھپ گیا، یا شاید اوندھے مُنہ گر گیا۔

جیسے دُشمن اور خوف دونوں نے مل کر کالا وہ ڈالا ہو یا پھر دونوں تعاقب میں ہوں۔ پر وہ دوڑتے دوڑتے ہار گیا ہو۔

عقب میں ڈائننگ ٹیبل پر رات کا کھانا سجا تھا، ڈائننگ سیٹ کی برگنڈی پالش جیسے صحت مند لُہو کی لش لش کرتی آب ہو، جس میں بلکورے لیتی سنہری ڈائس والی براق جاپانی کراکری، جن کے نفیس نقوش والے چہرے موٹے موٹے آنسوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ انیق کا جی چاہا، ہر برتن کے دائیں بائیں ہاتھ لگے ہونے چاہئیں تھے، جن سے ڈھانپ کر وہ اپنا یہ بسورتا ہوا چہرہ چھپا سکیں جیسے ماما کی آنکھوں میں اُبلتی سُرخی میں پڑے سنہرے ڈائس سے آنسو جنہیں ماما نے رگڑتے ہوئے ہتھیلیوں سے چھپایا تھا۔ شاید آنکھ میں کُچھ پڑ گیا تھا۔ کُچھ کڑوی دوائی کا ذائقہ سا حلق میں اُتر رہا تھا۔

''آؤ بچو کھانا کھالو۔''

یہ بھی کوئی بات ہے بھلا، نیوز بلٹن دیکھتے وقت بھی روؤ۔ چلو ہیرو ہیروئن کی ٹریجڈی پر تو رونے کا جواز بنتا ہے لیکن یہ خبریں بھی آج کل کسی ٹریجک فلم کے اینڈ سے کم نہیں ہیں جنہوں نے ماما کی

آنکھوں میں کڑوی دوائی سی ڈال دی جس کا ذائقہ حلق میں گھلتا رہتا تھا۔ انیق کے پیچھے کوئی درندہ سا لگا دیا جس سے کسی صوفے، بیڈ، کرسی کی چھت محفوظ نہ رہی اور پاپا کی آنکھیں عینک کے محدب شیشوں سے باہر نکل کر کہیں بھاگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

انیق نے مرغے کی ٹانگ کے بھرویں حصے کو دانت سے کاٹا، ریشے بے ترتیب ہو کر ٹوٹے، ہڈی کی جڑ میں لہو کے قطرے پک کر جم گئے تھے۔ بالکل ویسے جیسے اُن سب کی آنکھوں میں کُچھ برگنڈی سا پھیلتا رہتا تھا۔ نیوز بلٹن کے وقت...... جیسے آنکھیں نہ ہوں چوک میں لگے اشارے کی جلتی بجھتی لال بتیاں ہوں۔ لہو، ظلم، آنسو، خوشی، شرم، غصہ سب کی رنگت لال ہی کیوں ہوتی ہے۔ کبھی خطرے کی علامتیں...... ''انیق کھانا کھاؤ۔''

پاپا نے نیوز ویک اور عینک دونوں کے اُوپر سے ایک ہی زاویے میں باہر کو اُبلتی آنکھیں اُٹھائیں...... محدب شیشوں سے پلکوں کی باڑ ٹکرائی۔ برگنڈی میز کے لال ریتلے سیراب کا غبار انیق کے چہرے اور آنکھوں میں لہرایا۔

''پاپا! ایسا ہی کچھ بہہ رہا تھا نا اُس لڑکے کے گال سے جو ابھی ٹی وی پر دیکھا تھا۔

اس خوفناک حد تک مضحک خیز تشبیہ پر دونوں ماما پاپا نے ہنسنے کی کوشش کی لیکن ہنسی سینے کے مخرج سے نکلنے کی بجائے مسوڑھوں کی جڑ میں گھڑ گھڑائی جس میں کچھ نمکین سا گندھا تھا۔ تھوڑی زیادتی سے مسوڑھے سُوج کر پھول گئے تھے۔ انیق نے گال میں اُنگلی چبھوئی۔ اس خیال سے کہ یہ گوشت کو پھاڑتی ہوئی پار نکل جائے گی۔ پر اُنگلی پھولے پھولے گال میں دھنس کر ٹھہر گئی۔ اُس کا گال تو بالکل سلامت تھا۔ پر یہ درد کیسا تھا جو دِنوں بعد تک محسوس ہوتا رہا۔ بارود اور دُھوئیں میں لپٹا لُہو اور بوٹیوں کا قیمہ سا ٹپکتا ہوا جیسے بیلنے کے مُنہ میں آیا آٹے کا پیڑا سوئیوں کے لچھے بن بن باہر نکلتا ہے۔ لال فوڈ کلر میں رنگ کر...... ٹی وی اسکرین لال تھی۔ ماما کی آنکھیں لال تھیں۔ پاپا کے مسوڑھے سُوج کر لال ہو گئے تھے اور اُس کے اپنے گال سے ٹپکتا سوئیوں کا لچھا بھی لال تھا۔ ماما نے ٹانگ کی بوٹی اُس کی پلیٹ میں ریزہ ریزہ کر دی جس کی اندرونی سطح پر کچھ برگنڈی سا جما تھا۔ ''پریوں، جنوں، شہزادوں اور نیک صفت بزرگوں کی شبیہیں کیوں گم ہو گئی ہیں۔ ہمارے بچوں کے خوابوں سے۔''

سوال کا جواب سوال کی صورت میں ہی آیا تھا۔ جب جواب سوال نما ہو جائیں۔ تو آگاہی اور

رہنمائی کی آسودگی گم ہو جاتی ہے اور پھر ذہن اور چہرے ویران ہونے لگتے ہیں۔ ٹی وی سکرین پر دکھائے جانے والے اس شہر میں شاید پتھر ہی اُگتے ہیں۔ دھواں، آگ، بارود، گولیاں اور لاشیں وصول کرنے والوں کے ہاتھوں میں بس پتھر ہی کیوں ہوتے ہیں؟ پھر کو ٹچن مارک...... شائد یہ پتھر کے عہد کے لوگ ہیں پھر سوال نما جواب جو تشنگی اور کسک دیتے ہیں اور تشنگی اور کسک بغاوت اور انتقام...... یہ تشنگی اور کسک صحرائی ریت کی طرح انیق کے دل و دماغ میں اُس وقت بھی اُڑتی رہی تھی۔ جب اُسے سوال کرنا نہیں آتا تھا۔ اس وقت بھی سوالوں کا ایک منظر نامہ اس کے ذہن و نظر میں ترتیب پا تا رہا تھا، دھواں اور بارود، لہو اور اعضا، توڑ پھوڑ اور پتھر آخر کیوں؟ سب سوالیہ مناظر، اس نسل کے دماغوں کی کھیتیاں انہی سوالیہ مناظر سے سیراب ہوتی ہیں۔ دماغ کی کوٹچن شیٹ پر لکھے ہوئے سوالنامے جن کے سارے جواب سوال نما ہیں۔

ایک بار جب ماما کے ساتھ ایک دکان دار مول تول پر جھگڑ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں فوری یہ خیال آیا تھا۔ وہ پتھر مار مار کر اُسے لہولہان کر دے اور اُس کی دکان کے شیشے توڑ ڈالے لیکن وہاں اردگرد کوئی پتھر موجود ہی نہ تھا۔ ایک آدھ نظر پڑا بھی لیکن وہ زمین میں اس طرح دھنسا ہوا تھا کہ کوشش کے باوجود اُسے اکھیڑ نہ سکا۔ اُس سوال کا سوال نما جواب اُسے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ دراصل یہ پتھر اُن کے اپنے ہی گھروں کے ٹکڑے ہیں جنہیں بلڈوزروں کے حیوانی جبڑے چیر پھاڑ کر اُگلتے نگلتے رہتے ہیں اور ان ٹکڑوں کے چھینے بچوں کے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں اور وہ اپنے گھروں کے ٹکڑوں سے ہی اردگرد پھیلی حملہ آور اشیاء کے نشانے لیتے رہتے ہیں جیسے کبھی کبھار مسجد کے باہر شیرینی بٹتی ہے تو بالکل ایسے ہی کھانوں اور بوندی کے چھینٹے بچوں کے ہاتھ جھپٹ لیتے ہیں۔ جہاں جس چیز کی بہتات ہوگی بچے انہی سے کھیلیں گے نا۔

نہ بولنے نہ سمجھنے والے دور میں خارجی مناظر پتہ نہیں دودھ کی بوتل میں گھل کر نسوں، رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سال کا بچہ اپنے باپ کے قتل کا چشم دید گواہ ہوتا ہے اور قاتلوں کی شبیہ ہر کھلونے میں ابھر جاتی ہے۔ بالکل ان پتھروں کی طرح جن پر اُن سالم اور خوبصورت گھروں کی شبیہیں کندہ ہوتی ہیں جن کا وہ کبھی حصہ رہے تھے اور اُن کی بھی جنہوں نے انہیں توڑ کر پتھر چور بنایا تھا۔ ان بے گھروں اور پناہ گزینوں کی یادداشتیں جڑوں والے پھوڑے جیسی کیوں ہوتی ہیں جن

کے رساؤ کی بساند برسوں ماحول کو متعفن کرتی رہتی ہے؟ پھر سوالیہ نشان...... جن کے اثرات اور نتائج صدیوں کو اور نسلوں کو اپنی غذا کی صورت ہڑپ کر جاتے ہیں۔ پھر سوال نما جواب...... اور جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو ذہن ونظر کی بساط پر پتھراؤ بہت تھا۔

''یہ لڑکے پتھر کیوں مارتے ہیں؟''

سوال بڑا جینوئن تھا کسی کھلونے کی طلب کسی مٹھائی ٹافی کی خواہش پتھروں نے کیوں سمیٹ لی ہے۔ ماما نے ٹی، وی سکرین کے پتھریلے مناظر پر سے لال ڈیلے گھمائے جن میں خطرے کی بتیاں جلتی بجھتی تھیں۔ برگنڈی پالش والے ڈائننگ ٹیبل پر لشکتی کراکری کے ڈاتس پُرآب تھے جن کی سطح پر اُنگلی رگڑی جائے تو کسر رکی آواز تا دیر فضا میں گھومتی ہے۔

''اس لیے کہ وہ انہیں گولیاں مارتے ہیں۔''

تو پھر یہ بھی انہیں گولیاں ہی ماریں نا، گولیوں سے تو خُون نکلتا ہے۔ پتھروں سے تو بس ڈنٹ ہی پڑتے ہیں وہ بھی ٹینکوں پر......

''لیکن اُن کے پاس گولیاں نہیں ہیں۔''

آنسوؤں کے نمک کی کھردر حلق میں رڑکتی رہ گئی۔ ''تو پھر وہ انہیں پتھر ہی ماریں نا۔ گولیاں کیوں مارتے ہیں، یہ تو Unjustice ہے ناماما۔''

''پر Justice تو وہی ہے جسے طاقت اظہار دے دے......'' پھر سوال نما جواب...... جن سے سوالوں کی تحریکیں پھوٹتی ہیں۔ تحریک بھی تو سوال ہی ہوتی ہے جو جواب کی تلاش میں رہتی ہے۔

''تو پھر وہ انہیں پتھر نہ مارا کریں نا......''

ہاں یہ غلطی ہے ان کی انہیں پتھر نہیں مارنے چاہئیں۔

ماما نے سنہرے ڈاتس والی کراکری برگنڈی میز پر سجائی۔ کچن سے بریانی اور کبابوں کی مہک اُٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں بھر آئی تھی۔ چاولوں کے پیچھ میں کھلنے اور گوشت کے بھن بھن سکڑنے کی مہک کو انیق نے نتھنوں میں بھرا۔

''ماما یہ ڈنر کے وقت کیوں مارتے ہیں انہیں، کھانا بھی نہیں کھانے دیتے۔ یہ دیکھیں دیکھیں اب تو وہ پتھر بھی نہیں مار رہے، پھر بھی وہ انہیں گولیاں مار رہے ہیں۔ دیکھیں پوزیشن لیے بیٹھے ہیں

ٹینکوں میں، مشین گنوں پر جن سے گولے گولیاں ..... شیرینی کی طرح بٹ رہے ہیں بچوں کے درمیان جیسے کھانوں کے چھٹے ..... بھاگ جاؤ مار ڈالیں گے تمہیں، بھاگو، تیز بھاگو چھپ جاؤ......''

انیق اُچھل کر سیڑھی پہ چڑھا یا شاید پناہ کے لیے دوڑا، زینے پہ اوندھا یا شاید چھپا، گھٹنے ٹکرا کر چھلے ..... سر ریلینگ میں پھنسا اور حلق آنسوؤں کے تھور سے سُوج گیا۔

''بھاگو بھاگو .....'' آواز اور چہرہ دونوں لہولہو تھے۔ گردن نسوں کا گچھا، جس میں سے پسینہ اور لہو پھوٹتا اور رستا تھا۔

وہ بھاگے بھی تھے لیکن آہنی نالیوں کی نسبت کم سپیڈ میں۔ آگے آگے بھاگنے کے باوجود وہ بہت پیچھے رہ گئے۔ ڈنر کے اوقات میں گوشت کی جلتی ہوئی مہک انیق نے صاف محسوس کی۔ ماما کی آنکھ میں پھر کچھ پڑ گیا تھا۔ شاید وہ گرد جو پتھروں والے شہر میں بچ رہی عمارتوں کو روڑے اور پتھر بناتے وقت اُڑ رہی تھی اور یہ روڑے اور پتھر گلیوں بازاروں میں پھیلے بچوں کے ہاتھوں میں تھے جنہیں وہ غلیلوں میں پھنسا کر گولے کی طرح چلا کر پھینکتے تھے تو اُن کی اپنی ہی آنکھیں گرد سے اٹ جاتی تھیں جہاں جس چیز کی بہتات ہوگی آخر تو بچے اُنہی سے کھیلیں گے نا۔

انیق سیڑھی سے اُترا، میز سے ٹکرا کر گرا اُٹھا اور اردگرد بکھرے جوتے کھلونے کشن کتابیں اُٹھا اُٹھا، ٹی وی سکرین پر پٹخنے لگا۔ ایسے جیسے غلیلوں میں پھنسے گولے گرتے ہیں۔ اُس کے گالوں اور آنکھوں کی رنگت بالکل اُس سیال جیسی تھی جو بارود کے دھوئیں میں سے پچکاریاں مارتا ہوا بہتا تھا۔

''نہیں مانتا نہیں کچھ نہیں مانتا ..... کسی کو نہیں مانتا ..... مَیں نہیں مانتا......''

وہ سکرین تک جاتا ٹھوکر مارتا صوفے پر جمپ کرتا کشن اُٹھاتا نشانہ لیتا..... یہ عمل بار بار دُہراتے ہوئے اور مقابلے کی تسکین سے دوچار ہوتے ہوئے اُس پر ایک اور سوال نما جواب کُھلا بھاگنے اور چھپنے والے پیچھے مُڑ کر پتھر مارنے والوں کی نسبت جلدی کیوں مارے جاتے ہیں۔

شہر کے سب سے مہنگے انگلش میڈیم سکول کی ہیڈ مسٹرس ایسے بوکھلائی ہوئی تھیں جیسے دُنیا کی سب سے بلند، عظیم اور مقدس عمارت کے ٹوٹنے پر دُنیا میں بھونچال آیا تھا جس کے پس منظر میں بچوں کے ہاتھوں میں پکڑے اُن کے گھروں کے ٹکڑے ایٹم بم معلوم ہونے لگے تھے۔ ذہن کی مخصوص کیفیت کے ساتھ اشیاء کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے۔

''پتھر کہاں کہاں لگے غفار صاحب!''

''میڈم! دو کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے، آپ کی گاڑی کے بونٹ میں ڈنٹ پڑا اور مسٹر یاسر کا سر......''

پتھر مارنے والے لڑکوں کے پچکے ہوئے زرد گالوں میں ہوا سی بھری، اور حلق میں اٹکے ہوئے پتھروں میں دراڑ آئی۔

What you have done?

ہیڈ مسٹرس کی آنکھوں میں تنی سزا کی آہنی نالیاں حلق میں غرائیں۔

''ہم تو اُن ٹینکوں کو مار رہے تھے جو ہمیں کرش کرنے کو بڑھ رہے تھے۔''

پچکے ہوئے زرد گال لال اور پیلی جلد والے سیب کی طرح پھول گئے جب ٹینکوں کے آگے آگے بھاگنے والے سینہ پھیلا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو پھر موت کی طلب میں زندگی کی نوید چہرے پر جو رنگ چھوڑتی ہے بالکل ویسا رنگ۔

''Which Tanks''

ہیڈ مسٹرس کے چہرے پر میک اپ کی سوفٹ تہوں میں آنکھوں کے گرد اور پیشانی کے وسط میں خندقیں سی کھد گئیں۔

ٹینک ٹینک''What Tanks''

لڑکوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جواب کھوجا۔

''ٹینک ٹینک میم Just a game''

اب گالوں کے سیب کا وہ حصہ سامنے تھا جہاں زرد اور لال رنگ باہم جذب ہوتے تھے۔

''From where did you learned it.''

فاؤنڈیشن کے بنکروں میں بارود سا پھٹا۔

''From T.V News bulletin''

سینئر سٹاف کے سینوں میں برستے پتھراؤ میں کرکری ہوئی۔ ''What a Joke!''

''کیا نیوز بلٹن گیمز سکھاتے ہیں۔''

ہیڈ مسٹرس نے پی ٹی ٹیچر مسٹر غفار سے جواب طلبی کی جیسے نیوز بلیٹن انچارج بھی وہی ہوں۔

"Just For Change میم بس ذائقے کی تبدیلی کے لیے۔"

آج دُنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ کبڈی اور کرکٹ ہاکی تک آپ محدود نہیں رکھ سکتے نئی جنریشن کو میڈیا واچنگ کر رہا ہے۔ انفارمیشن دے رہا ہے۔ فریش اینڈ ماڈرن انفارمیشن

Games are also in the way of Progress

سوشل اور کلچرل تبدیلیاں کھیلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کھیل ہمارے Attitude اور سائیکی کا اظہار ہوتے ہیں۔ مسٹر غفار نے جیسے بریکنگ نیوز کی تفصیلات نشر کیں۔

"کیا ہمارا کلچر بچوں کو وائلنس سکھا رہا ہے۔"

ہیڈ مسٹرس کے دماغ میں انکوائری رپورٹ ترتیب پا رہی تھی۔

"ہم نہیں سکھا رہے میم میڈیا اور پاور، نیا کلچر اور نئے رجحانات بنا رہے ہیں۔ ویلیوز آر بی چینج"

"بہرحال آپ بچوں کو روایتی کھیل سکھائیں۔"

"O.K میم لیکن میڈیا از ٹیچر۔"

"مسٹر غفار۔"

"یس میم۔"

وہ آفس سے باہر نکلے۔ سب کی زبان پر ایک ہی جملہ یکبارگی آیا۔

"یار رات نیوز ویک میں دیکھا"

"Touch Wood" سب نے یکبارگی کہا۔

"وٹ تھرل، وٹ آ ایکشن۔ وٹ آ سول۔"

"لڑکا نہیں بم دس بارہ فائر مار دیئے ان میں وہ بھی تھا جس نے اس بچے کے گال میں گولی ماری جس کا درد"

انیق نے اپنا گال سہلایا۔ "وہ بھی جنہوں نے بلڈوزروں سے گھروں اور بازاروں کو پتھر روڑے بنا کر بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے پکڑا دیئے اور کھیلنے کے نئے طریقے سکھا دیئے اور وہ

بھی......اور وہ بھی......اور وہ بھی......''

لڑکے جمپ کر کے پھولوں کی کیاریوں میں کود دے۔ مُنہ سے نکلتے حرف اور عمل سب پر یکساں وارد ہوئے جیسے سب کا کنٹرول سسٹم کسی ایک ہاتھ میں کسی ایک بٹن سے جڑا ہے جو پورے سسٹم کو آن آف کر رہا ہے۔ وہ سب گُلابوں کی ڈھیری کے گرد دائرہ بنا کر چُپ کھڑے ہو گئے۔ خاموشی جس میں الہامی حرفوں کی تقدیس ٹپکتی محسوس ہوا کرتی ہے۔ سیاہ، سلیٹی، براؤن آنکھوں سے چھنتی چمک ایک ہی رنگ میں رنگ گئی تھی۔ کچھ برگنڈی سا، کچھ سنہرا سا آتش بازی کے انار جیسا اور جب بچوں کی آنکھوں کے مختلف شیڈز کسی ایک شیڈ میں کھرل ہو جائیں تو پھر کھیلنے کا اندازہ بھی سب کا ایک ہو جاتا ہے۔ اگلے روز وہ سب پھر ہیڈ مسٹرس کے کمرے میں طلب کیے گئے تھے۔ پھول توڑنے کے جرم میں......

''تم جیسے Brilliant سٹوڈنٹ جو فسٹ آتے ہیں۔ پوزیشنیں لیتے ہیں۔ ہر ہرا یکٹوٹی میں

I was proud of you.''

''But now.... why you do this...... اسپیشلی یُو انیق یُو۔''

میم کے حرف بھی ایسے ہی ٹوٹے پھوٹے تھے جیسے عمارتیں، بازار، گھر، دفتر خوفناک دھماکوں سے ٹوٹتے اور خاندان، افراد، مستقبل کے سارے نظام، سب پتھر روڑے بنتے ہیں اور جن کی زد میں آئی آئندہ نسلیں پتھر عہد میں بسر کرتی ہیں۔

''میم پھولوں نے تو بکھر ہی جانا ہے۔ آج نہیں تو کل مگر اب وہ جس مقصد کے لیے استعمال ہوئے۔ They become ever last.'' انیق کے مُنہ سے نکلتے حرف جیسے سارے بچوں کے دانتوں تلے چیونگم کی طرح Chew ہو رہے تھے۔ مَین کنٹرول والا سسٹم آن تھا جس کا بٹن ایک تھا۔ ہیڈ مسٹرس کو لگا بم بنی گاڑی سیدھی آفس کی بیرونی دیوار سے ٹکرائی ہے۔ وہ اُنھیں باریک ہیل چیرز سے پھسلی، سنبھلیں......

''یہ...... یہ...... سب...... کیا...... ساتویں کلاس کے بچے......'' بچوں کے ہاتھوں میں تو کھلونے تھے جوان گھڑت پتھر تھے۔

''میڈیا...... میم میڈیا بنا رہا ہے...... انہیں......''

پی ٹی میچر غفار نے گلوب پر اُنگلی گولائی میں پھیری۔ جہاں سارے براعظم گلے مل رہے تھے۔

اُنگلی کی گھسٹ نے پوری دُنیا کا چکر پورا کر لیا۔

''میڈیا بنا رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے۔''

''میم بنانے اور بگاڑنے میں سوچ کا ہی تو فرق ہے جو ہمارے ہاں بناؤ ہے وہ اور کہیں بگاڑ ہے۔میڈیا میم...... پالیسی ساز...... تھنک ٹینکس...... جہاں جیسا کلچر اور ماحول بنانا چاہیں بنالیں۔''

''تمہارے خیال میں خودکشی جائز ہے۔''

''But it is something more then Suicide.''

لڑکوں کی آنکھوں کی مشترکہ چمک عنابی تھی جس کا تار دلوں میں دھڑکتی اور کلائی میں چلتی نبض سے بندھا تھا۔

''But it is useless''

ہیڈ مسٹرس کے لفظوں کے اندر سے بھاپ سی اُٹھی جیسے تھرماس کا ڈھکنا کھلے اور فوراً بند کر دیا جائے لیکن فضا میں بخارات تیرتے رہ جائیں۔''نسل در نسل کسی غذا کی کمی یا موروثی بیماری آئندہ نسلوں کو بیمار اور اپاہج پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح نسل در نسل کی غذا بنے یہ موت مناظر ایک عجیب Deficiency پیدا کر گئے ہیں۔اس نسل میں کہ موت کا خوف دلوں سے اُٹھ گیا ہے اور مرنے کا کریز (Craze) ہو گیا ہے۔یہ ایک خطرناک اور جنونی بیماری ہے جو وباء کی شکل میں پھیل رہی ہے۔''

مسٹر غفار نے سائیکالوجی کی مس روبینہ کے فلسفے کو اپنی زبان دی۔

''لیکن یہ تو غالب بہت پہلے کہہ گئے:

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں''

سٹاف ممبران نے اس اُردو میڈیم شعر کی اس خطرناک حد تک کی جانے والی فضول تشریح کو مکمل نظر انداز کیا اور ہیڈ مسٹرس نے سٹپٹا کر کہا۔

''مسٹر غفار آپ بچوں کو روایتی کھیلوں کی سمت گائیڈ نہیں کر سکتے۔کیا ضروری ہے کہ وہ چوہے بلی والا کھیل کھیلیں Games should be positive کیونکہ کھیلوں کا ٹرینڈ زندگی کے ٹرینڈ کو متاثر کرتا ہے۔''

ہیڈ مسٹرس نے مسٹر غفار کو تنبیہ کے ساتھ میٹنگ ختم کی لیکن اگلی ہنگامی پیرینٹس ٹیچر میٹنگ میں

یہ مسئلہ پھر زیرِ بحث تھا۔ بچوں کے کھیلوں کے رجحانات کیوں تبدیل ہو گئے ہیں۔ والدین چیخ رہے تھے۔

جس سکول کا پورا نصاب یورپ سے بن کر آتا ہے۔ جہاں انگریزی کے علاوہ کوئی دوسری زبان بولنے پر سزا دی جاتی ہے۔ وہاں بچے...... مجاہد They are playing like۔

Is this a مدرسہ

''سکول نہیں میڈیا...... میڈیا بنا رہا ہے یہ سب کھیلیں۔'' لیکن اتنی ڈھیر سی آوازوں میں مسٹر غفار کی آواز حلق میں گھگھیا کر رہ گئی جیسے U.N.O میں تھرڈ ورلڈ کی آواز، جیسے پنچائیت میں کسی کمی کمین کا مؤقف جو کبھی جانبر نہیں ہو پاتا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ پسماندہ اقوام کے بچے زیادہ کیوں جاننے لگتے ہیں۔ ترقی یافتہ اقوام کے بچے کھاتے پیتے کھیلتے پڑھتے موج مستی کرتے ہیں۔ جبکہ پسماندہ اقوام کے بچوں کا ذہنی بچپنا ایک دھماکے، ایک قحط کی مار ہے۔ اچھلے کہیں کے Depth ہی نہیں نہ کردار میں نہ ذہن میں اور پھر اس حادثاتی پختگی میں کبھی ارتقا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اسی فیز آف مائینڈ میں سڑتے رہتے ہیں۔ پیلی آموں کی طرح جنہیں قبل از وقت پکا لیا جاتا ہے اور جب اُن کے ہم عمر ٹپکے خوشبوئیں مہکاتے درختوں سے جھڑتے ہیں تو یہ گل سڑ کے بُو مار رہے ہوتے ہیں۔ بچوں کے ذہن پر غفلت کا پردہ پڑا رہنا ضروری ہے۔ قبل از وقت جان لینا اُنہیں کرخت اور سائیکک بنا دیتا ہے۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک فرسٹیڈ نسل پیدا کر رہے ہیں۔ حالات کے تلخ ادراک نے ان کی ذہنی سطح کو Damage کر دیا ہے۔''

پرنسپل نے اپنی بات جاری رکھی جس میں تھرڈ ورلڈ کی جھنجھناہٹ سی اُبھری۔

''جب توڑ پھوڑ کا پتھراؤ دماغوں پر ہو گا لہُو دھماکے بصارت کا لقمہ ہوں گے تو پھر...... ہم روئیں بھی نہ۔''

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس اُردو میڈیم خیال کو پھر کسی نے اہمیت نہ دی۔

''مسئلہ یہ ہے کہ بچوں کی فرسٹیشن دُور کی جائے جس کے لیے Healthy activities کا ہوتے رہنا ضروری ہے۔ ہم بچوں کو جو بیک گراؤنڈ دیں گے بچے اُسی کے مطابق گیمز کھیلیں گے۔ ہمارے گراؤنڈ اب ایسے سیدھے پلین اور روایتی نہیں رہے کہ بچے ہاکی اور کرکٹ کھیلیں۔''

ہیڈ مسٹرس نے مس روبینہ کو پُر امید نظروں سے دیکھا۔

''مس روبینہ آپ آئیڈیا دیجئے۔''

مس روبینہ نے جدید انگریزی زبان اور جدید تر لہجے میں آواز کو حلق کے سب سے قریبی مخرج سے نکالا جیسے زبان کے پردوں تلے چھپے حرف دبے پاؤں باری باری باہر نکلتے ہوں کہ کہیں کوئی چیل، کوا جھپٹا نہ مار جائے۔

''جب تک بچوں کے دماغوں میں خوابوں اور تخیلات کی جگہ نہیں بنے گی، اُس وقت تک ذہنی پراگندگی جاری رہے گی۔ ابنارمل ذہن کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اُسے خواب دکھائی دینے بند ہو جاتے ہیں۔ ہمارے عہد کے بچوں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں۔ وہ ناموافق حالات پر صبر اور تدبر کی بجائے احتجاج کرتے ہیں۔ پُرتشدد احتجاج کیونکہ وہ کلر بلائنڈ ہو گئے ہیں۔ تصویر کا صرف تاریک رُخ انہیں نظر آتا ہے۔ نرم اور سبک جذبات کو غصے اور ہیجان نے لپیٹ لیا ہے۔ گویا ہمیں یہ بات مان کر آگے بڑھنا ہے کہ بچے ذہنی طور پر صحت مند نہیں رہے اور ذہنی صحت مندی کے لیے Creative activities کا ہونا ضروری ہے۔''

خرگوشنی کے بچوں جیسے کچے کچے پھدکتے لفظوں کے پیچھے جیسے مسٹر غفار نے بل ڈاگ چھوڑ دیا۔

''گویا آپ سائیکالوجی کی زبان بول رہی ہیں۔ مشہور فلسفوں کو اپنے لفظوں میں بیان کر رہی ہیں لیکن ''

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔ عمل جتنا شدید ہوگا ردِ عمل بھی..... ماحول کا پُرسکون ہونا اور مستقبل کا محفوظ ہونا بھی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔''

اُردو میڈیم فلسفے کو ہیڈ مسٹرس نے عقب سے چیرا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں بچوں کے Attitude کو Positive بنانا ہے۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی جا رہی ہے جس کی ہیڈ مس روبینہ ہوں گی یہ کمیٹی ہر ہفتے Healthy Creative Activities تیار کرے گی اور سٹیج کیا کرے گی۔ جنہیں بچے دیکھیں گے اور ان کے اندر پازیٹو اور سوفٹ جذبات پیدا ہوں گے۔ مایوسیت اور نتیجتاً تشدد کم ہوگا۔''

پہلے ہفتے کھیل، سلیپنگ بیوٹی، سٹیج پر کھیلا جا رہا تھا۔ والدین اور عمائدین شہر موجود تھے۔ جھلملاتی روشنیوں اور آرائشی جھنڈیوں میں اچھی پریوں نے مبارک باد کا رقص پیش کیا تھا۔ سفید لمبے فراکوں پر لگی گلابی فرل گھومتی تو جیسے خُوشی کے شرارے سے چھٹتے ہوں۔ سٹیج پر سارے رنگ ہلکے اور کھلتے ہوئے استعمال کیے گئے تھے۔ حد یہ کہ سرخ رنگ کے گلاب تک استعمال کرنے سے اجتناب کیا گیا تھا۔ گلابی اور سفید پھول منتخب کیے گئے تھے جو ٹھنڈک سکون اور خوشی کا احساس دیتے تھے۔

لباسوں اور سیٹ کی سجاوٹ میں سفید گلابی اور سلیٹی رنگوں کا امتزاج سکون، خوشی اور شانتی کا تاثر اُبھار رہا تھا۔

Witch کی جانب سے دیئے گئے سزا کے اعلان اور تکلے کے لگنے کا سین اگرچہ کئی ماؤں کو اشکبار کر گیا تھا۔ خصوصاً جو بچی شہزادی بنی تھی اُس کی ماما کی آنکھیں اینق کی ماما کی آنکھوں جیسی برگنڈی سی ہوگئی تھیں لیکن اس وقت خُوشی کے آنسو ستاروں کی مانند جھلملا گئے جب شہزادے نے کِس کر کے شہزادی کو برسوں کی لمبی نیند سے جگا دیا۔ تالیاں رِدھم سے پٹ رہی تھیں۔ برسوں کے سوئے پسے رومانی اور تخیلاتی جذبات اُبھارنے میں مس روبینہ کامیاب رہی تھی جن کی مہک سے ہال بھرا تھا اور جن کے ساز سے گونج رہا تھا اور جن کی موجودگی ذہنی صحت کے لیے ضروری تھی۔ سٹیج پر سجے مصنوعی محل کے اندر شادی کا جشن برپا تھا۔ مبارک بادی کا آخری رقص پریاں پیش کر رہی تھیں۔ تالیوں کی تھاپ تیز تھی۔ ذہنی صحت توانا اور پُرسکون تھی کہ یکبارگی ٹینکوں، بلڈوزروں اور بمبار طیاروں کی چنگھاڑوں نے ساری صدائیں سہا دیں مناظر لرزنے لگے۔ حلق کرخت ہوگئے۔

''No.... No.... not at all.''

ہیڈ مسٹرس اُٹھ کر بھاگی لیکن سٹیج پر ہونے والی گولا باری نے اُس کا رخ واپس پھیر دیا۔ مس روبینہ مائیک ہاتھ میں لیے انگریزی میں چیخی لیکن اب لفظ اُس کی زبان کے پَروں تلے سے نہیں بلکہ سینے پر برستی سنگ باری میں دبی ہوئی چیخ بن کر نکل رہے تھے۔

''یہ اینڈ طے نہیں تھا۔ ڈرامے کا ہیپی اینڈ تھا یہ سازش ہے۔ یہ مس پلاننگ ہے۔''

سٹیج پر بنا سلیپنگ بیوٹی کے محل کا مصنوعی سیٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ اچھی پریوں کے سفید فراک بھی لال تھے جن کی گلابی فرل برگنڈی ہوگئی تھی۔ شہزادی پھر گہری نیند سو چکی تھی جس کے سینے پر

Witch کا پیر تھا جو چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔

God is the one.

Earth is the one.

Ruler is the one.

I am the one.

I am the power.

اور محل کے ٹکڑے بچوں کے ہاتھوں میں تھے جو Witch کے چاروں طرف برس رہے تھے۔

سیر گاہ

اس سیر گاہ کا مزاج بھی عجیب ہے۔ ہر لحظہ کچھ نیا اور انوکھا، تجسس اور مزے سے لبریز التھزا، جیسے کوئی مداری، جادوگری یا پھر بازی گری جیسا تماشہ، روم روم جھنجھنا دینے والا پینگ کا لمبا ہولارا، جس کی واپسی دل اور بدن میں کچھ اُٹھک بیٹھک سی چھوڑ جاتی ہے۔ ساون کی روئیدگی جیسی تفریحی انواع و اقسام، بس ایک ہی سڑک پر سب یکجا ہے۔ مارگلہ ہلز میں بہتی بل کھاتی موڑ کاٹتی یہ مری مال روڈ ہے۔ دنیا کی ہر اچھی گاڑی اور ہر نیا ماڈل جسے ملتا دلتا ہوا گزرتا ہے، جن میں بیٹھے ہوؤں کے ملبوسات کی تراش خراش، جل کی تاب میں لہراتے بالوں کے جدید اسٹائل، رے بین کی باریک کمانیوں والی عینک کے رنگین شیشوں تلے مسکراتے پُرکشش نقوش اور دولت و اسٹیٹس کے گھمنڈ کی صحت مندی... اچھا لباس، اچھی گاڑی اور بھری جیب کیسا حُسن اور وقار بھر دیتے ہیں بندے میں... گویا دولت حُسن آفریں اور وقار افزاء جادو بھی ہے۔

مال روڈ پر لگے اس تماشے کو فیشن شو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پیچو کی ملیاں سے اُٹھ کر آنے والی لڑکی بھی ملتانی کڑھائی والی سیاہ چادر اُتار کر سنڈریلا کی مانند کچھ وقت کے لیے اپنی جون بدل لیتی ہے۔ ذرا سی چولی کے اطراف سنگِ مرمر کی پلیٹ سے پیٹ کی چکناہٹ اور گہرے گریبان سے بھی کچھ کچھ جھانک جاتا ہے۔ کیٹ واک کرتی ہوئیں ساری ہی کیٹ ونس لیٹ... گاڑیوں کی شفاف ونڈسکرین

اور عینکوں کے رنگین شیشوں پر Dunhill کے مرغولے پھیلاتے ہوئے سارے ہی نام کروز۔تھوک کے حساب سے یہاں ملتے ہیں۔ پاکستان کو مفلس اور رجعت پسند کہنے والوں کو زبانی تحریری صفائیاں پیش کرنے کی بجائے ایک وزٹ یہاں کا کروانا بہت ضروری ہے پھر ہوش میں آنے سے پہلے پہلے پوچھا جائے۔''اب کے بول۔''

پر ان کا کیا کیا جائے جو رجعت و افلاس اور پائمالی حقوق کے بینرز بن کر ساتھ ساتھ لہراتے ہیں۔فراٹے بھرتی گاڑیوں کے ٹائروں سے چھٹتی بھاپ کا پیچھا کرتے ہوئے، ہوٹل میں کمرہ دلانے کی تگ و دو میں، دھواں اور راکھ نگلتے ہوئے، پھول، جھنبیریاں، سیب، ملوک بیچتے ہوئے، راکٹ بنی گاڑیوں کے ٹائروں کی زد سے بچتے ہوئے، بے فکری اور لاپرواہی میں گندے ہاؤ ہو کرتے تماشائیوں سے چپکے ہوئے۔میل سے اٹے، جلے جھلسے گندے ہاتھوں میں چھلیاں، چائے کے تھرماس اور انڈوں کی ٹوکریاں اُٹھائے پیچھے بھاگتے ہوئے۔لوگ اپنی گندگیاں زیرِ زمین دفن کر دیتے ہیں۔ہم اچھال کر باہر سڑکوں پہ پھیلا دیتے ہیں اور وہ بھی اس حسینۂ عالم سڑک، مَری روڈ پر...... بدذوقی اور بدسلیقگی کی بھی حد ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے مرحبا چوک کے شیڈ والے بینچوں کے متضاد، پھولوں سے لدے اور دیودار کے باوقار درختوں سے ڈھکے، قدرت کے ڈیکوریشن پیس بنے، معطر پہاڑوں کے ساتھ گندگی سے نکونک بھرا ٹینک پڑا رہتا ہے جس کی سڑاند، کافی کے کپوں، آئس کریم کی کونوں، سلش کے گلاسوں، فرنچ فرائز اور برگروں کے لفافوں میں رچ جاتی ہے اور P.C بھوربن کی ڈائننگ ٹیبلوں سے اُٹھ کر آنے والوں کے حلق میں سپیشل سوپ کے گھونٹ پلٹتے رہتے ہیں، اسی طرح اس فیشن شو میں ان فقیروں، مظلوموں، فاقہ زدہ، بھک منگوں کا ورائٹی پروگرام ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ویسے مال روڈ کے اس فیشن شو کو ورائٹی ڈریس شو بھی کہا جا سکتا ہے۔مصنوعی داڑھیاں اور وگیں لگائے ہوئے۔ایک قسم کا لباس اور جوتے پہنے ہوئے لڑکے لڑکیوں کے گروہ، سفید شلواریں، سیاہ قمیصیں، سفید چپلیں، لال پیلی کنی والی لنگیوں پر لمبے جھلاتے ہوئے کُرتے، ہاتھوں میں گھنگریاں بندھے گھوٹنے پکڑے، گوجرانوالہ کے پہلوان کا سوانگ رچائے ہوئے، مُنہ سے بکرے بلاتے، ہپ ہپ کرتے، جب یہاں سے گزرتے ہیں تو فسانۂ آزاد کے لکھنؤ کے میلوں، ٹھیلوں اور چہلم کی یادیں تازہ کر جاتے ہیں۔رنگ و روپ بھلے بدلا ہو لیکن ننگی بچی انسانی فطرت ہر دور میں یکساں ہے۔سارے لکھنوی بانکے کچھ نیا کچھ انوکھا کر دکھانے یا دیکھنے کے خواہاں، لال، پیلے،

ہرے، نیلے رنگے ہوئے بال، مضحک خیز حد تک منفرد تراش کے لباس، سیٹیاں، باجے، مرلیاں بجاتے، جی۔ پی۔ او چوک سے مرحبا چوک، مرحبا چوک سے الپائن بیکری انسانی سَروں کے اس اُمڈتے ہوئے سیلاب کے لیے ہی کسی نے شاید کہا ہے۔ تھالی پھینکو تو سَر ہی سَر جائے اور اس بھیڑ کو اوڑھے ہوئے جلوت کی انتہا خلوت ہو جاتی ہے۔ آپا دھاپی تنہا کر دیتی ہے۔ بھیڑ کی اس تنہائی میں Love Birds چھپے جا چونچیں لڑاتے ہوئے Love Birds جنہیں دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ کم بخت انہیں بھی نہیں بخشتے، گندے، غلیظ ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے پتیوں کے بنے ہیر کیچ پکڑے ہوئے پلوشن فری شہر میں نرے پلوشن۔ بہتیرا اگنور کرو، پر، ڈسٹ بن چپک ہی جائے تو تھوکے بنا چارہ نہیں رہتا اور تھوکنے کا عمل تو غراہٹ سے ملتا جلتا ہی ہے پر انہیں کیا۔ ڈھیٹ کہیں کے، تھرڈ ورلڈ کے نمائندے بھوک، دھتکار اور خوشامد سے استوار کیے ہوئے، اتھلے کہیں کے، یہاں بھی انجوائے نہیں کرنے دیتے جہاں کی پوری فضا میں بس ایک ہی نشہ گھلا ہے۔ مزا، مزا اور بس مزا......

دراصل یہ ایک میلہ ہے جو جون کے وسط سے چودہ اگست تک ملکۂ کوہسار کے دامن میں واقع اس وادیٔ گل رنگ کے مال روڈ پر بجتا ہے اور اپنی ساری میلیائی مستی میں تماشائیوں کو شرابور کر دیتا ہے۔ یوں کہ وہ دوسروں کے تماشائی ہیں اور خود دوسروں کے لیے تماشہ، موسموں کی سختیوں کے مارے ہوئے لوگ، ساس نندوں کی پابندیوں سے گھبرائے ہوئے میاں بیوی بچوں سمیت، کالجوں کے بے فکرے گروہ اور ٹرپس، بھیڑ کی چادر میں چھپ کر اک دوجے میں سما جانے کی تمنا میں بے تاب نئے نئے شادی شدہ جوڑے، مَری بلز کے بیچوں بیچ ناگن کے لہریئے بناتی اور اندھے موڑوں پر ٹھمک ٹھمک بجتی بجاتی، آنچل سمیٹتی پھسلاتی، مکھڑا دکھاتی چھپاتی، ملکۂ شاہراہ پر، مہینوں یہ جشن برپا رہتا ہے۔ قدم قدم پر کیفے ٹیریا، چائے خانے، پکوانوں سے مہکتے رستوران، گاہکوں اور تماشائیوں سے چھلکتے اُمڈتے، حظ اور ترنگ کا لازمی جزو کھانا پینا، کوئی کھوکھا، کوئی چائے خانہ بچ نہیں پاتا، ہر ہر موڑ پر کسی نئی گلی کا سائن بورڈ اور سجی بھری دکانوں پر، پھر وہی گھومتا ہوا تھرڈ ورلڈ کا نمائندہ۔ بوتلیں، چپس، بسکٹ بیچتے ہوئے۔ ہموار قطعوں پر بچھی کرسیوں پر بیٹھے ہوؤں کو کڑاہی گوشت اور نان پیش کرتا ہوا، گھاٹی در گھاٹی نیچے اُترتے رستوں پر، اونچی چڑھتی چوٹیوں پر، تنی چھتریوں تلے بیٹھے ہوؤں کو سَروکرتے ہوئے اور ٹپ کے سکوں کے لیے ترسی ہوئی کشکول نگاہیں پھیلائے ہوئے۔ اسٹیٹ بینک کے مہامنہ بھرے خزانوں کی تضحیک کرتا ہوا، کلنک کا ٹیکہ۔

کتنے نشیب وفراز میں وہ بندر کی سی مہارت سے بھاگتا ہے اور کبھی تھکتا نہیں، یہی نشیب وفراز اُترتے چڑھتے بس کچھ سالوں میں اس کی کمر جھک جاتی ہے، کندھے مُڑ جاتے ہیں اور چڑھائی چڑھتے ہوئے کب سانکل آیا کرتا ہے اور بلندی پر آکسیجن کی کمی سانسوں کو ناہموار کر دیتی ہے اور ملکۂ شاہراہ کے چہرے پر بدنما داغوں کی مانند پھیلے یہ کبڑے بوڑھے چھلیاں بھونتے اور دھواں نکلتے، شفاف آکسیجن کو آلودہ کرتے، کھانستے ہوئے جا جا ملتے ہیں۔ بھلا اس دمے کے مریض کا یہاں کیا کام، جہاں لوگ جمع پونجی خرچ کر کے خوبصورتیاں اور صحت افزائیاں خریدنے کو آتے ہیں۔ جہاں حُسن خود کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہاں یہ بدصورتیاں بھلا کیوں مُنہ مارتی ہیں۔

میلوں بلند کہساروں پر گنجان پھیلے، کیل اور دیودار کے تار تار چتوں والے بالکل سیدھے اور سینکڑوں فٹ بلند درخت، دراصل وہ انٹینے ہیں جو یہاں کی خوبصورتی اور صحت افزائی کے منصوبوں کی ہدایات براہِ راست قدرت سے وصول کرتے ہیں اور پھر چٹانوں کی درازوں سے پھوٹتے پودوں کی ہریالی کو پہنچاتے ہیں۔ پتھروں کے سینوں میں بنے پیالوں میں انڈیلتی آبشاریں، شفاف معدنی پانی کے گھونٹ بھرتی اُگلتی، میلوں کا سفر منٹوں میں طے کرتیں جن کا منبع کہیں قدرت کے قرب سے ہی پھوٹتا ہے۔ تبھی تو اس کی ثنا ئی کا پیغام ان خوش رنگ پھولوں تک پہنچاتی ہیں جو چٹانوں کے پتھریلے بدن، رنگ و بو سے ڈھک دیتے ہیں، اودے اودے، پیلے پیلے، نیلے نیلے پریوں کے قطعے سجے ہیں۔ زردانوں کی واشنا، دیودار اور کیل کی مہک، الپائن کے پتوں کی موسیقی، چھم چھم اُترتے برفیلے پانی اور چٹانوں کے شق سینوں سے پھوٹتے چشموں کا اسرار، ہریالی کی چلمن میں چھپا ہوا۔ ''حُسن بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھئے'' جیسے تازہ تازہ دلبو کے ٹن اور کنستر سارے پہاڑی سلسلوں پر جابجا دھرے ہوں۔ جہاں پرحاٹنگ کرتے، گرتے سنبھلتے جیسے انہی کی ذرہیں لگوانے جاتے ہیں اور فضا میں تازہ پھلوں کا رس بھرا ہے۔ ذرا منہ کھول کے سانس کھینچو تازگئی جاں، روح تک سیراب کر دے جس میں شراب طہور کا نشہ گھلا ہو۔ مدہوش سیل انساں بہتا چلا جاتا ہے۔ کشمیر پوائنٹ سے پنڈی پوائنٹ، پنڈی پوائنٹ سے زیرو پوائنٹ۔ جس کا مرکز مرحبا چوک سے جی پی او چوک ہے جہاں رنگین مزاجوں کے انبوہ رواں ہیں۔ کھاتے پیتے، موج مستی کرتے، فقرے اُچھالتے۔ یہاں مزا اور بے فکری اپنی انتہا میں جا کر مجسم ہو جاتے ہیں۔ بزبان خود کہتے ہوئے، آؤ مجھ کو مجسم صورت میں ملاحظہ کرو۔

ہمراہ وہ بھی بھاگتا ہے۔ انبوہ کی شکل میں جو تعداد میں بے شمار سہی لیکن مُنہ مہاندرا، مزاج،
رویہ بالکل یکساں ہے۔ اسی لیے ایک کردار بن جاتا ہے۔ بھنے ہوئے دانے اور چھلیاں بیچتا ہوا،
گاڑیوں کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا، جھاگ کے بلبلے اُڑا، بچوں کو متوجہ کرتا ہوا، ریڑھیاں کھینچتا ہوا، جن پر
اُسی کے ہم عمر بچے، سامان، بوڑھے اور موٹے گنجائش سے کہیں زیادہ بھرے ہوتے ہیں اور جب وہ
فواروں والے بینچوں کے قریب کی چڑھائی چڑھتا ہے تو جی پی او چوک میں دس پندرہ روپے مزدوری
کے پکڑتے ہوئے اس کا سانس پسلیوں کی دھونکنی میں شاں شاں آوازیں چھوڑتا ہے جو سرعت سے سفر
طے کرتا ہوا دمے کے مرض سے گلے ملنے کو بھاگ رہا ہے۔

گھوڑوں کی باگ پکڑے کشمیر پوائنٹ سے گرینڈ ہائینس ہوٹل تک گھوڑے کی رفتار کے ساتھ
بھاگتے ہوئے پسینے کی دھکنی میں ہونکتے ہوئے، ڈانٹ بھی کھاتا ہے کہ طے تو اُس نے مال روڈ تک کا
40 روپے کیا تھا اب اُس کی اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ مال روڈ گھوڑوں کے لیے بند ہے اور مزید
برآں یہ بھی مال روڈ ہی تو ہے، لیکن سیاحوں یا تماشائیوں کے لیے تو مال روڈ بس مرحبا چوک سے جی پی او
چوک تک ہی ہے جہاں انسانی سَروں کا گنجان جنگل اُگ آیا ہے اور مُنہ زور سیلاب صبح دس بجے سے
رات تین چار بجے تک مار کرتا، کنارے توڑتا، بند پھوڑتا ہوا بہتا ہے۔ مال روڈ نکونک، کنوکن انسانی بہاؤ
سے چھلکتی ہے۔ بے قابو موجیں اطراف میں واقع دکانوں، ہوٹلوں، ریستورانوں کو بھی لپیٹ لیتی ہیں۔
الپائن بیکری سے ریڈ ہمالین، لنغاث، عثمانیہ، مرحبا، سیسل ریستورنٹوں کے ڈائننگ ہال بھر چکنے کے بعد
یہ موجیں مارتے سیلاب ہنڈی کرافٹس، شالوں، سوٹوں کی دوگنی چڑھتی قیمتیں ادا کرتے اور ریستورانوں
میں میزیں خالی ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ مال روڈ کی سمت شیشے کے قریب ٹیبل مل جانے والا قابلِ
رشک ہوتا ہے اور جو پیسے گن کر جیب میں ڈالتے ہیں وہ نیچے اُتر جاتے ہیں اور لکی کبانہ، الصبا، المائدہ
اور لاہور ریسٹورنٹ کے ٹیبل خالی ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہاں وہ پھر موجود ہوتا ہے۔ کندھے پہ
جھاڑن ڈالے، میزیں صاف کرتا، جھوٹے برتن اُٹھاتا، دھوتا، ایک ایک چھلانگ میں چھ چھ سیڑھیاں
چڑھتا، اُترتا اور کھانوں کی ٹریں لا لا کر سجاتا ہوا اور ٹپ کے لیے کشکول نگاہیں پھیلاتا ہوا......
مرحبا چوک سے ریڈ اونین تک کے حصے میں بنے بینچوں پر بیٹھے ہوئے دنیا کے خوش قسمت ترین
انسان معلوم ہوتے ہیں جن کے قریب سے تھکی ہوئی ٹانگیں اور چڑھائی اُترائی کی پھونکیں چھوڑتی

عورتیں اور بچے، بوڑھے اور موٹے جب گزرتے ہیں تو بیٹھے ہوؤں کو اکھاڑ کر خود بیٹھنے کی خواہش مزاجوں میں تندی بھر دیتی ہے جوان چھوئوں پر جھکڑ کی طرح جھلتی ہے۔ جوان بیٹھے ہوؤں کے گرد بھی تتلیوں کی مانند منڈلاتے ہیں جن کے سرخ گالوں میں آگ دہکتی ہے اور غلیظ کپڑوں پر میل کی تہیں مال روڈ کی روشنیاں اجال دیتی ہیں جن کی چمڑا اُدھڑی ہتھیلیوں میں چائے کے تھرماس، لنڈے کے پیوند لگے سویٹروں والے بازوؤں میں لٹکتی اُبلے ہوئے انڈوں والی ٹوکریاں، گھسے ہوئے کالروں میں پھنسی رسی میں بندھے سینے پہ لٹکتے چھابڑے جن میں سجے ہوئے ٹافی، چیونگم، چپس اور بانسوں پہ لہراتے ہوئے غبارے، برصغیر کے اس دہی کے مُنہ پر کالک ملتے ہوئے۔

بھوک چہروں پہ لیے چاند سے پیارے بچے
بیچتے پھرتے ہیں گلیوں میں غبارے بچے

پتہ نہیں کسی کو ان سے کیوں ہمدردی ہوئی تھی۔ جنہیں ملکی وقار کا کچھ احساس ہی نہیں۔ خود غرض کہیں کے۔ جبکہ وطن شہادت مانگتا ہے۔ بھوکے پیٹوں کی، گرسنہ آنکھوں کی، چیتھڑا بدنوں کی......، چلیں کہانی کی سہولت کے لیے ان کو ایک نام دے دیتے ہیں۔ بے شک ان کے وجود ان کی کہانی الگ الگ سہی لیکن بنیادی کردار چونکہ ایک ہے۔ اس لیے ایک ہی نام سے گزارا ہو جائے گا۔ یوں بھی کھانے کی تھوڑ، چھتر کی تھوڑ، تو پھر تناسب و توازن کے اصول کے مطابق نام کی تھوڑ بھی تو ضروری ہے......

یہ عبداللہ خان ہے۔ عمر سات آٹھ یا پھر نو دس برس، افغانستان سے بھاگتے ہوئے باپ کی ٹانگیں اور دو بڑے بھائی اُن آدم خور امریکیوں نے ناشتے کے طور پر ہڑپ کر لیے جن کا لنچ عراق میں ڈیو تھا۔ ماں، چار بہنیں اور ادھورا باپ ادھر کسی کھولی میں رہتے ہیں جہاں گھوڑے باندھے جاتے ہیں جن میں بھرے مچھر اُن کے گلابی گالوں پر ہمیشہ لال سہرے کے چھینٹے اُڑاتے رہتے ہیں جس بہن کی آنکھوں کے پانی سے امریکی پیاس بجھی تھی۔ وہ عبداللہ خان کو انڈے اُبال کر ٹوکری میں، سجا دیتی ہے۔ اُسی ٹوکری میں جسے اُس نے کھجور کے پتوں سے اُس وقت بنایا تھا جب اُس کی آنکھوں کا شربت مٹھاس چھوڑتا تھا جس میں ارغوانی شراب کی آمیزش تھی اور جس کی چاٹ امریکیوں کو لگ چکی ہے۔

عبداللہ پانچ روپے کا انڈا بیچتا ہے۔ تبھی تو ہر ایک سے کہتا ہے'' صاحب! باجی! انڈے لے لو...... ہم بھی اس جنگل میں سال بھر آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ آپ جو دے جاتے ہیں وہی تو باقی پورا

سال کھاتے ہیں۔" وہی صدیوں پرانی گھسی پٹی کہانی، جوان دیودار اور کیل کے انٹینا بنے درازقد پیڑوں نے لاکھوں بار سُنی ہے جن کی عمروں کی تختیوں پر لکھا ہے۔ 1500 سو سال، 2100 سو سال، 3000 ہزار سال جو یہاں خوبصورتیاں سینچنے کے منصوبے کی پلاننگ براہِ راست قدرت سے حاصل کرتے ہیں۔نجانے اِس بدصورتی کی شکایت کبھی کرتے ہوں گے یا نہیں، یا وہ بھی میلے کے ان خوش مزاجوں اور بے فِکروں کی مانند ان کے وجود کے عادی ہو چکے ہیں۔

عبداللہ خان فارسی، پشتو اور اُردو روانی سے بولتا ہے۔ فارسی اُس کی مادری زبان ہے۔ پشتو اُس نے اپنے ان ساتھیوں سے سیکھی ہے جن کے اجتماعی کردار کا وہ حصہ ہے اور اُردو وہ ہم لوگوں سے بولتا ہے۔ اگر کوئی فارنر نظر آ جائے تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اپنا مُدعا بیان کر لیتا ہے اور گائیڈ کے فرائض سرانجام دینے کی بھی پیشکش کرتا ہے، جہاں جنگلی حیات کے تحفظ کا بورڈ لگا ہے جس کے اوپر چھوٹے چھوٹے بلبوں کو جوڑ کر ڈائنوسار اور ہرنوں کی شبیہیں بنائی گئی ہیں جن کے ساتھ ریسکیو ون فائیو کا دفتر ہے۔ وہاں سے جب وہ دو موٹوں اور چار بچوں کو ریڑھی میں لاد کے یہاں کی چڑھائی چڑھتا ہے تو اُس کے گالوں کے اناروں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں اور لنڈے کے پیوند لگے بوٹوں سے نکلتے پسینے کے قطرے مال روڈ پر رواں انسانی سیل بلاخیز کے تلوؤں تلے خشک ہو جاتے ہیں۔ مرحبا ہوٹل سے مخالف ہاتھ بنے فواروں تک بچھے سفید پینٹ والے اور سرخ پتھر والے بینچوں پر بیٹھے Love Birds بھیڑ اوڑھے چونچیں لڑا رہے ہیں۔ عبداللہ خان اُنہیں مزید گرمانے کو انڈے فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نرم گرم پَروں کی گرمائش میں یہ آواز کسی روڑے کی مانند حلق میں اٹکتی ہے۔ لڑکا جان چھڑانے کو اُسے پانچ روپیہ دینا چاہتا ہے لیکن انڈا لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اُسے چھیلنے اور کھانے کی فرصت نہیں ہے۔ اُس کے پاس۔

عبداللہ خان کے گالوں کے انار قندھاری ہو جاتے ہیں۔

"نہ صاحب! بھیک نہیں لیتا۔ اپنی محنت کا کما کر کھاتا ہے۔"

عبداللہ خان ریڑھی پر دو موٹیاں اور پانچ صندوق لادے ریسکیو ون فائیو کے سامنے کی چڑھائی چڑھ جاتا ہے تو اُس کی سانس کی پھنکار اور لنڈے کے پیوند لگے بوٹوں کی گھسٹ Love Birds کی چونچوں کی پکڑ ڈھیلی کر دیتی ہے۔ ہر اک مال دس روپے میں گھسے بچوں کو بلبلے فروخت

کرنے کی کوشش میں وہ والدین سے ڈانٹ کھاتا ہے۔ چیونگم چپس کا چھابڑا گلے سے لٹکائے۔ چائے کے وزنی تھرماس اُٹھائے۔ اُس انسانی چادر کے مخمل میں پیوند کی طرح جابجا لگا ہوا جو مال روڈ پر چکراتی رہتی ہے۔ ایک ہی سڑک کا طواف سات بار نہیں بار بار ..... اتنا حُسن، اتنی جوانی، اتنی دولت، اتنی فراوانی، اتنی بے فکری، اتنی ترنگ شائد کسی اور سیرگاہ کو اتنی انتہائیں میسر نہیں ہیں جس کا کلائمکس چودہ اگست ہوتا ہے جب آتش بازی کے سارے انار یکبارگی پھٹ جاتے ہیں۔

پھر میلہ ٹوٹ جاتا ہے اب مال روڈ ایسے اُداس ہے جیسے کسی قریبی کی موت کا ماتم کرتا ہو جیسے نوجوان بے فکروں سے چھلکتی درس گاہ میں تعطیلات کا اچانک اعلان ہو جائے، جیسے حج کا موسم گزر جائے۔ انارکلی میں کرفیو لگ جائے۔ ایرانی قالین اور کشمیری شالیں، سواتی گلے، سندھی، براہوی، بلوچی ہنڈی کرافٹس سب کہیں مُنہ بند کارٹونوں میں چھپ گئے ہیں۔ سپرے کی پھوار کی طرح سارے میں بکھر جانے والے چائے خانے اور سیزنل ریستوران تالہ بند ہیں۔ چائے کے تھرماس خشک پڑے ہیں اور چیونگم ٹافی کے چھابڑے اوندھے مُنہ .....

پتہ نہیں عبداللہ خان پر کیا گزری ہوگی۔ اُس نے کھانے کو آٹا اور برف پگھلانے کو لکڑیاں جمع کرلی ہوں گی یا ..... لیکن اب تو وہ ٹھنڈے پڑے تندوروں کے گھوروں میں، زنجیروں سے بندھی لب بستہ ریڑھیوں میں، سوگوار چہروں والے ہوٹلوں کے چھجوں تلے۔ بوٹوں اور کپڑوں کی لیریں، گرہیں دے دے جوڑتا ہے۔ اُس سمیت ہر شئے کے چہرے کے چوکھٹے پر ایک ہی تصویر آویزاں ہے۔ انتظار کی بے زاری، اُمید کی ہوشیاری جو مال روڈ کے داخلے کی سمت مُنہ لٹکائے راہ دیکھتی ہے۔ کسی بھولے بھٹکے کے آنے کا .....

مارگلہ ہلز کی اونچی چوٹیوں پر تن کے کھڑے دیودار اور کیل کے پیڑوں کے کندھے جھک گئے ہیں جیسے وہ بھی گردنیں جھکا مال روڈ کی سنسانی میں کسی کو تلاش کرتے ہوں۔ مُنہ بسورتی آبشاروں کے چہرے، خشک آنسوؤں سے لتھڑے ہیں۔ چشمے پُرنم ہیں۔ لیکن کنارۂ چشم سوکھ گئے ہیں، الپائن کے پتوں کے جھڑاؤ میں ہجر موسم کے گیت کی لے ہے۔ ترب کھڑب۔ مسلسل اور سوگوار، جو راہ دیکھتا ہے کسی آنے والے کی جو اُس کے جھڑے ہوئے پتوں کے بدن تلوؤں تلے سہلا ڈالے۔

بلی ٹریکو، ہائیکرز کے لمس کے فراق میں بدن کسمساتے ہیں جن پر جھکے کندھوں اور خمیدہ کمروں

والے پہاڑیئے اوپر چوٹیوں پر لکڑیاں کاٹنے جاتے ہیں اور دیودار کی گیلیوں کو برف سے ڈھکی چٹانوں سے لڑھکا ساتھ ساتھ پھسلتے ہوئے نیچے لاتے ہیں۔ ہر سوگوار منظر کے پس منظر میں عبداللہ خان اُداس بیٹھا ہے۔ برف کے کومل بدن، بےلمس ہیں جن ہاتھوں کی گرمی نے اُسے پگھلانا ہے۔ وہ میدانوں کی خشکیوں میں بےحس کاروباری فائلوں میں بند ہو گئے ہیں۔

قدرت کو شاید اپنی صناعی کی اُداسی زیادہ دیر اچھی نہیں لگی، خوب سا پیار ٹپکایا، چوم چوم کر ساری چوٹیاں اور گھاٹیاں چاندی سی چمکا دیں۔ سارے کیل، دیودار، کالا کاٹ اور اکھنڈ کے اونچے پیر سفید بھالو بن گئے۔ پیار کی رِکن من خوب برسی، عشق مشک کی خبر میدانوں کو لگی۔ تماشہ کرنے قافلے چلے آئے۔

میلہ پھر سجا ہے۔ مَری روڈ پر جدید ماڈلز کی گاڑیاں، ہیٹلز کی قطاروں کی طرح رینگ رہی ہیں جن کی ونڈ اسکرین اور چھتیں برف کی پھو سے سفید سمور ہو گئی ہیں۔ سڑک کے دونوں اطراف بلڈوزرز نے برف کے پہاڑی سلسلے بنا دیئے ہیں جن کے پیچھے ریستوران اور چائے خانے چاندی کے ورق میں لپٹ گئے ہیں۔

چمکیلی دھوپ میں جگمگاتے بلور کی قاشیں بنے کیل اور دیودار کے بڑے انٹینوں کی قطاروں کے بیچوں بیچ براق چاندنی بچھی ہے۔ چٹانوں کی ڈھلانیں، پہاڑوں کی چوٹیاں جیسے اسکیٹنگ کا میدان بن گئے جہاں تماشائیوں کا اژدھام ہے۔ عبداللہ خان بھی یہیں سرگرم ہے جو ہر نئے آنے والوں کو دس دس فٹ برف سے ڈھکے سلائیڈ بنے برفیلے پہاڑوں پر سے پھسلنے کی ترغیب دے رہا ہے، جس کے ہاتھ پیروں کی اوپر لی جلد برف نے جلا کر اکھیڑ دی ہے۔ نیچے لال ننگی بوٹی سی نظر آتی ہے۔ بچے اور نوجوان موٹے اور موٹیاں سلائیڈ لیتے ہیں۔ عبداللہ انہیں اوپر چڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود سلائیڈ لے کر طریقہ سکھاتا ہے اور پھر نیچے آنے والوں کو سنبھالتا بھی ہے۔ پچاس فٹ کی بلندی والی اس سلائیڈ سے لڑھکنے کے بعد لوگ قہقہے لگاتے، برف پہ لوٹیں مارتے بھر بھری برف میں گھٹنوں گھٹنوں دھنستے، پھسلتے، گرتے، برف کے گولے بنا بنا کر اپنے ساتھیوں پر پھینکتے تو جیسے اُن پر رشین ڈاگز جیسی سفید فر اُگ آئی ہو۔ اس ڈھلان کے نیچے پھر ایک ڈھلان ہے جو تقریباً سو فٹ لمبی سلائیڈ بن گئی ہے جس کے کورے بدن کو بس عبداللہ خان نے ہی مس کیا ہے، جو اُس پر سے پھسل پھسل کر، وزٹرز کو راغب کر رہا ہے کہ اب اس سلائیڈ پر سے وہ پھسلیں کیونکہ اوپر والی سلائیڈ سینکڑوں قدموں تلے رندھ رندھ کر گندی اور خراب ہو گئی ہے۔

انسانوں کی لتاڑ نے بھربھری برف سخت سنگِ مرمری کر دی ہے۔ اب پیر گھٹنوں گھٹنوں اندر دھنسنے کی بجائے پھسلتے ہیں۔ جگہ جگہ موٹے موٹیاں، بچے بچیاں، لمبے پڑ رہے ہیں۔ شیشہ بنی سلائیڈ سے اگر ہاتھ پَیر ٹکرا جائے تو رگڑیں بن جاتی ہیں۔ عبداللہ نے نچلی سلائیڈ سے لڑھک کر پھر دکھایا کہ نچلی سلائیڈ قطعاً خطرناک نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں یہ سلوپ (Slope) ختم ہوتا ہے۔ وہاں چھ سات فٹ کی ڈھلان کے بعد پھر ایک کھائی شروع ہوتی ہے جو دیودار کے ٹنڈ منڈ تنوں سے ڈھکی ہے۔ نگاہ کے اگلے پڑاؤ کے بعد پھر ایک کھائی شروع ہوتی ہے جہاں بتدریج برف کم اور سنگلاخ چٹانیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور نگاہ کی پہنچ مسدود، جس پر نگاہ ڈالتے ہی پھسلنے والے بے فکروں کے حوصلے برف ہو جم جاتے ہیں اور تماشائیوں کی نگاہیں آسمان پر ٹھہر جاتی ہیں جہاں سے دو دن ہوئے پھونہ گری تھی کہ وہ پرانی برف کی گندگی اور سختی کو ڈھانپ کر تازگی اور نرمی پیدا کر دے اور تماشائیوں اور بے فکروں کے تماشے اور ہلے گلے کا سامان ہو جائے جس کے لیے انہوں نے سینکڑوں میل کا سفر طے کیا ہے۔

عبداللہ اس خطرناک سلائیڈ سے بیسوؤں بار پھسل چکا ہے۔ وہ اب بھی کسی بچے کو ترغیب دینے کو پھر پھسل رہا ہے کہ اچانک ایک لڑکا اپنے انتہائی موٹے دوست کو دھکا دیتا ہوا گتھم گتھا نیچے پھسلا اور سلائیڈ کے درمیان میں عبداللہ خان سے اس زور سے ٹکرایا کہ عبداللہ ایک ڈھلان سے لڑھکتا دوسری، دوسری سے تیسری اور پھر پتہ نہیں کس سنگلاخ گھاٹی کی کس درز میں، کس دیودار کی کھکھل میں، کس چشمے کی خشک آنکھ میں، کس آبشار کی بھربھری برف بھرے پیالے میں جا اٹکا۔

تماشائی صفت مجمع ڈھلانوں پر اُمڈ آیا۔ پر نگاہ کی پہنچ میں مطلوبہ تماشہ نہ تھا۔ البتہ اوپر چوٹیوں پر آسمان کی آنکھ کے آنسو جم گئے تھے اور جینگ فیکٹری سے اُڑتے پھٹی کے برادوں کی مانند ہر سُو بکھرنے لگے تھے۔ برف کی شیشہ بنی تہوں پر مزید بھربھری تہیں جمنے لگی تھیں۔ ٹوپیوں، کوٹوں پر سمور کی فر بن گئی تھی۔ تماشائی قدرت کی اس مہربانی اور فراخدلی پر دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ پھسلتے، گرتے چیختے، برف کے گولے بنا بنا اِک دوجے کو مارتے۔ میلے کے تماشائی خود تماشہ ہو گئے تھے۔ نیچے کہیں قطرہ قطرہ بہتا ہوا لہو دیودار کی کرنڈ شاخوں پر جم کر برف ہو گیا تھا اور پانچ پانچ روپے کے دو بوسیدہ نوٹوں کو چھو کے سفید ذرے ڈھانپ چکے تھے۔ اس کاغذ اور لہو کا بھی عجب مزاج ہے۔ پانی سے مل کر پانی اور برف سے مل کر برف ہو جاتا ہے۔

مکروہ

بات معمولی اور غیر واضح تھی۔ ڈاکٹر عدیلہ عاصم کو اس معمولی سوچ کے ابہام پر لگا ہوا اپنا پورا اسٹیٹس، سارا بھروسہ اور اعتماد بے توقیری کے تلاؤ میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کے از حد مصروف اور قیمتی وقت میں سے کوئی ایسا لمحہ نکلتا بھی نہ تھا کہ خالصتاً مڈل کلاس ہاؤس وائف جیسی سوچ کی عیاشی کر سکے، لیکن اُسے اپنی مشاہداتی جانچ اور چھٹی ساتویں حس کی شدید بیداری پر بھی ایسا ہی بھروسہ تھا جیسا اس بات کی حماقت پر۔

ڈاکٹر عاصم کی اسسٹنٹ ڈاکٹر ربیکا کا فون آتا ہے۔ تو ڈاکٹر عاصم کے قہقہے کے آخری سرے سے نئے قہقہے کا سرا جڑتا چلا جاتا ہے اور جوابی قہقہوں کا تار مکڑی کا جالا سا بن عدیلہ کے ذہن کو لپیٹتا چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ثمینہ کا رشتہ ایک بار پھر ٹوٹ گیا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اُس کی نائٹ ڈیوٹی ڈاکٹر عاصم کے ہمراہ ہوتی ہے۔ مس وِکٹر کی ڈیوٹی جب کسی اور ڈاکٹر کے ساتھ لگتی ہے۔ تو نئے اوقاتِ کار اُسے کبھی سُوٹ نہیں کرتے وہ آنسوؤں اور آہوں کی تال پر اپنے مسائل سنا سنا ڈیوٹی تبدیل کروا لیتی ہے لیکن یہ تو ہسپتال کے معمولات ہیں اور پچھلے پندرہ برس سے ایسے ہی ہیں۔ پہلے تو اُسے کبھی ان معمولات سے کسی جارحیت کا خطرہ محسوس نہ ہوا۔ نہ مقابلے کی حالت میں خود کو پایا نہ ہار جانے کا دھڑکا لگا لیکن وقت بہت کچھ تبدیل بھی تو کر دیتا ہے۔ اب دو سال پرانی قمیص بھی نیچے ڈھلکنے اور جسم کو سمیٹنے کی

بجائے دائیں بائیں جیسے پَر پھیلائے اکڑ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اُس کی ڈریسنگ کا آئینہ ڈھندلا کر اپنی ہیئت تبدیل کر گیا ہے۔ اب وہ سامنے سے گزرتی ہے تو جسم کے سارے اعضا نشیب کی سمت سَر جھکائے اُداس لگتے ہیں۔ گردن کی رگیں نسیں، ہنسلی اور جبڑوں کی ڈھال ڈالتی ہوئی ہڈیاں اب گوشت کے سوئمنگ پول میں تیرتی ڈوبتی محسوس ہوتی ہیں۔ عجب بات ہے کہ جسم کی ہر دَور کی تبدیلی سارے ماحول، سارے تعلقات، ساری سوچوں حد یہ کہ سارے معمولات کو بھی تبدیل کر دیتی ہے۔ بچپن سے جوانی، جوانی سے اُدھیڑ عمری اور پھر بڑھاپا سارا نظامِ زندگی جیسے انہی تبدیلیوں سے ترتیب پاتا ہے۔ شاید اس کے اعصاب کی پکڑ ڈھیلی ہو رہی ہے کہ معمولات بھی غیر معمولی معلوم ہونے لگے ہیں۔

مثلاً آج جب وہ چند سال پُرانی قمیص کو کھینچ تان پُورا کرتی ڈریسنگ سے باہر نکلی تو پندرہ سالہ نوکرانی ریما کی نگاہیں ڈاکٹر عاصم کے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ پڑھنا نہ جانتی تھی لیکن کہانی کی دلچسپی اُسے ماحول سے یکسر الگ کر چکی تھی۔ دلچسپ واقعات کے تارے بندھی وہ فی الفور انجام تک پہنچنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر عاصم کی مسکان کی آخری پرت جبڑوں کی نوکوں پر، ہونٹوں کی سکیڑ میں اور آنکھوں کے باریک کوؤں پر سمٹ رہی تھی جیسے ڈاکٹر ربیکا کی کال والے ریسیور کے پیچھے ہونٹوں کا خم، نتھنوں کا اُبھار ایک غیر محسوس تبدیلی سے دوچار ہوتا ہے اور چہرے کی ننھی منی نسوں کا فشارِ خون جلد کو نئی نئی تازہ تازہ اور چکیلی سی بنا دیا کرتا ہے۔

یہ حقیر سا غیر واضح مشاہدہ عدیلہ کی آنکھوں میں ایسے بھر گیا جیسے کنویں کی تہ سے ہو کر آنے والا لبالب بوکا۔

''آپ نہیں جا رہے آج؟''

آنکھ کا لبالب بوکا ذرا سا چھلکا،

''انتظار کر رہا ہوں اگر کوئی آپریشن ہوا تو ہوسپٹل سے کال آ جائے گی''، ڈاکٹر عاصم نے سرسر کرتا ریشمی صفحہ پلٹا۔ موبائل فون بجا، عدیلہ نے فون کے سُرخ سبز ہندسوں کو دیکھا جیسے یہ کسی وقوعے کے چشم دید گواہ ہوں۔

دونوں کو ایک دوسرے کے معمولات کا ایسا علم تھا کہ کچھ پوچھنے بتانے کی ضرورت ہی کبھی نہ پڑی تھی۔ آج اُس کی یادداشت پر دُھند سی لہرائی۔ وہ کلینک جا رہی تھی جبکہ یہ آرام سے گھر میں......

جنزل......ڈاکٹر ربیکا......فون......اور......

ریما جوتے صاف کر کے اُس کے پاؤں کے قریب رکھ چکی تھی اور اُس کا بیگ اور استری شدہ اُورآل بیڈ کے کنارے پر پڑا سب کچھ کو اپنے حال پر چھوڑ کر اُسے باہر نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ کچھ بھی معمول کے خلاف نہ تھا۔

پورچ میں گاڑیاں انتہائی بے ترتیب تھیں، یادداشت پہ چھایا غبار دماغ کو چڑھنے لگا، جوتوں کی کھڑ کھڑ جو باہر سے ہی اُس کی آمد کا اعلان کر دیتی۔ مارے غصے کے جیسے تلووں نے پی لی ایڑیوں تلے کچھ پیستی ہوئی پلٹی۔ نکلتے وقت وہ دروازے کے پٹ اُلٹے مار گئی تھی۔ یہ حرکت اس کی نفاست پسند طبیعت سے کیسے سرزد ہوئی وہ حیران رہ گئی۔ اُلٹے بند ہوئے دروازے کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ یہ حرکت بھی اس کی اصول پسند طبیعت کے بالکل برعکس تھی۔ وہ مزید حیران ہوئی۔ ریما بچوں کے ساتھ بیٹھی ٹی وی پر وگرام دیکھ رہی تھی۔ عاصم بدستور کسی آرٹیکل میں گُم تھا۔ اُس کے چہرے پر آگاہی اور جانچ کا وہی ہالہ تھا جو بدصورت چہرے کو باوقار اور خوبصورت چہرے کو پھانسو بنا دیتا ہے۔ کسی بھی عورت کے دِل کے پُورے پُورے ناپ کا پھندہ۔ نتھنے ذرا سے سکڑے ہوئے جیسے اُن میں ہوا کا اخراج کم ہو۔ فراخ ماتھے پر تنی ڈیڑھ لکیر جو بات کرتے وقت باچھوں کے اطراف میں عموداً کھڑی ہو جاتی ہے اور مطالعہ کے وقت پیشانی کے ٹھیک درمیانی خم میں سیدھی سیدھی لیٹ جاتی ہے۔

''آپ نے اپنی گاڑی ایسی غلط پارک کی ہے کہ میری گاڑی نکل ہی نہیں سکتی۔''

بے ترتیب لپ اسٹک میں ہونٹ پھُولے تھے جیسے دو تین جگہ پر مکھیاں باریک ٹانگیں مار کر اُڑ گئی ہوں اور سانس ناک سے سیدھا حلق میں داخل ہو لفظوں کو چڑھ گیا تھا۔ ڈیڑھ میں سے آدھی لکیر ہونٹوں کے اطراف میں پھیل گئی۔ ڈاکٹر عاصم نے سائیڈ ٹیبل پر جنزل رکھا اور اُلٹے ہوئے پائنچوں تلے سلیپر پہنے پورچ تک آیا۔

عدیلہ کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ گاڑیوں کی ترتیب بالکل درست تھی، اور اُس کی گاڑی بڑی صفائی اور سہولت سے باہر نکل گئی۔ بلکہ عاصم نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"Are you allright"

اور پھر دروازہ اُس پر بند ہو گیا جس کے پیچھے موبائل فون، ہوسپٹل کال اور......

کلینک تک کی پچیس منٹ کی ڈرائیو کے دوران اُس کا شدت سے جی چاہا کہ وہ مان لے کہ اُس کی بصارت اور فکر کسی ایسی لاشعوری سوچ کے تابع ہو چکی ہے جو پہلے ہی کچھ نتائج اخذ کر چکی ہوتی ہے اور اُنہیں کسی بھی قسم کے حالات میں منطبق کیا جا سکتا ہے اور یہ مان لینے میں کتنا آرام، کتنی سہولت اور نجات تھی۔ ڈاکٹر ربیکا کی ڈیوٹی ڈاکٹر عاصم کے ساتھ ہے۔ وہ دونوں ایک ریٹائرنگ روم شیئر کرتے ہیں۔اس کی اور ڈاکٹر عباد کی ڈیوٹی بھی تو ایک ہی وارڈ میں ہے۔ وہ دونوں بھی چائے کے کپ پر مختلف معاملات ڈسکس کرتے ہیں یہ تو سوشل اور پروفیشنل ضرورت ہے۔

لیکن یہ ریما، اُس ضرورت کے تحت ...... اُسے ہنسی آ گئی۔ازحد دُبلی، پتلی، چپٹی، پچنسی سی، پیر تلے مسلی ہوئی نارنگی کی پھانک جیسے ڈاکٹر عاصم چھ فٹ کا صاف ستھرا، چمک دار، کامیاب سرجن جتنی نفاست اُس کے نشتر کے کٹ میں ہے ایسی ہی نفاست اُس کی شخصیت کی چھب میں بھی ہے جو ہر غسل کے بعد باڈی اسپرے ضرور چھڑکتا ہے جس کے سینے کے چمکدار گچھوں سے سیاہ بال کلون میں سنے چمکتے ہیں، پتلون کی دھار دودھاری کبھی نہیں ہوتی۔سفید قمیص کے کالر پر کبھی میلوٹی دھار نہیں بیٹھتی۔جس کے چمکتے ہوئے بونوں کے سینے میں کبھی شکن نہیں پڑتی اور یہ مضحک سوچ، جیسے حبیب بینک کی آٹھویں منزل کے ماتھے پر کسی گنوارن نے پاتھی چپکا دی ہو۔ وہ بیک مرر میں مسکرائی۔نقوش ذرا ذرا سُوجے ہوئے تھے جیسے ٹیوب میں ہوا زیادہ بھر گئی ہو۔اتنے برسوں میں ڈاکٹر ثمینہ کے چھٹانک بھر گوشت بھی تو کہیں نہیں چڑھا تھا۔شادی کرتی نہیں ہیں اور بچیاں بنی رہتی ہیں لیکن اصل مسئلہ تو یہ ہاؤس جاب والی لڑکیاں ہیں۔پڑھائی کے پہاڑ سے نکل کر تفریح کے موڈ میں ہوسپٹل میں داخل ہوتی ہیں اور ڈاکٹر عاصم ...... دس گھنٹے کی ڈیوٹی کے باوجود جس کی بغلوں اور بونوں سے کسی فنکس کی بُونہیں چھٹتی جو انگریزی، اُردو، پنجابی کے بیچ اٹکا اٹکا گفتگو کرتا اور مخاطب کو لاجواب کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ نئی نئی ڈاکٹر بنی لڑکیاں جو کھلے آپریشن پر قہقہے لگاتیں اور سیچنگ پر آہیں بھرتیں اور کنفیوژ ہوتی ہیں جن کے مبہم سوالوں کا تسلی بخش جواب ڈاکٹر عاصم کے پاس موجود ہے۔مریض کو پہلے ہی وزٹ میں اپنی تھیوری کے مطابق مطمئن کر دینے والا ڈاکٹر عاصم۔

لیکن یہ ریما سامنے بیٹھی ٹی وی کیوں دیکھ رہی تھی جبکہ ابھی کام پڑا تھا جس طرح چلتی گاڑی میں کچرا پھنس کر اُسے روک دے تو گاڑی گولی کے لائق لگتی ہے۔ڈاکٹر مریضوں کو انتظار کرتے دیکھ کر

چائے کی چسکیاں لیتا اور ہاؤس جاب والیوں سے گپیں ہانکتا بُرا لگتا ہے۔ اسی طرح یہ نوکرنیاں بھی بس کام کرتی بھلی لگتی ہیں۔ نہاتی دھوتی، سنگھار کرتی، ٹی وی دیکھتی ہوئی زہر لگتی ہیں جیسے اپنی سیٹ سے اُچک کر مالکن کی سیٹ پر آنے کی کوشش میں ہوں اور یہ ڈاکٹر ربیکا...... جس کے قہقہے ریسیور سے یوں چھلکتے ہیں جیسے دیگچے کے مُنہ سے اُبلتا ہوا پانی گرتا ہو جس کے نیچے آنچ بتدریج بڑھتی چلی جائے۔

''مریض کا ایک گڈنی ٹوٹل فیل ہے۔ آپریشن ہوگا، (قہقہہ) مریض کا اپینڈکس..... '' اندر پھٹ گیا ہے۔'' (دو قہقہے)...... ایسی نان سیریس لڑکی کی ڈیوٹی عاصم جیسے ذمہ دار ڈاکٹر نے اپنے ساتھ نجانے کیوں لگوا رکھی ہے۔

یہ شک اور اعتراض والی حقیری سی عادت بھی نجانے کہاں کہیں سوئی ہوئی تھی۔ جسے وقت نے نتھار دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کا ماحول اور تربیت پُوری عمر پر چھپی کیوں ہو جاتی ہے جیسے پتنگ چاہے چڑ مُڑ ہو جائے لیکن چھپی چڑ مڑاہٹ کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتی رہتی ہے۔

از حد مصروف روٹین اور تفریح کی کم یابی اُس کے ذہن کی چمک کو دھندلا کر ہیولوں میں تو تبدیل نہیں کر رہی۔ ساتھی لیڈی ڈاکٹروں کے ساتھ عاصم کا چہکنا معمول ہی تو ہے۔ شادی کے پندرہ سال بعد عدیلہ کے لیے بھی تو اُس کے لہجے کی چہکار میں کچھ ایسا فرق نہیں آیا لیکن یہ ڈاکٹر عاصم اُسے اتنا خوبصورت، اِتنا جوان، اتنا مشکوک، اتنا خطرناک پہلے تو کبھی معلوم نہ ہوا تھا۔ شادی کے فوراً بعد جب وہ دونوں سپیشلائزیشن کے لیے یورپ گئے تو اُسے لگتا یہاں کے بازاروں، پارکوں، ریستورنٹوں، کافی شاپس کی سب سے بڑی اور عام جنس پنڈلیاں اور رانیں ہیں جو زمین کی زرخیزی کی بنا پر ہر وقت اور ہر جگہ اُگ سکتی ہیں جیسے ساون کی بارش راتوں رات ٹس ٹس کرتی تازہ کھمبیوں کی پوری فصل اُگا دیتی ہے۔ خم اور قوس کے متعدد زاویے بناتی ہوئی پنڈلیاں اور رانیں اتنی چمکیلی، چکنی، لمبی سڈول کہ نگاہ شاداب فاصلوں کو طے کرتے کرتے نشیب و فراز میں ہی بھٹکتی رہ جائے۔ چہرے تک کم ہی پہنچ پائے۔ پھولی ہوئی سانسوں میں ہونکتا مسافر جا جا سانس لینے کو رُکتا رہے۔ وہ ٹھٹھک جاتی۔ ذرا ذرا بات کو اہمیت دینے اور دوسرے کے افعال پر بلاوجہ تبصرہ کرنے والی مڈل کلاس مشرقی ذہنیت غالب آ جاتی وہ عاصم کے ٹہوکا دیتی۔

''دیکھو دیکھو پنڈلیاں، اتنی دراز اتنی پھسلنی۔ اتنی رنگا رنگ چمپئی، گوری، نگی، کالی، چٹی، پیلی،

گندمی اور ہر رنگ کے کیسے کیسے شیڈ، اس قدر خوبصورت پنڈلیوں پر تو چہرے کا بس تکلف ہی ہے جو خُدا نے کر رکھا ہے۔

لیکن عاصم کا دماغ اُس روز ہونے والے ٹیسٹ کے سوالوں کے جوابوں کی کیسٹ میں تبدیل ہو چکا ہوتا جو بار بار بج رہی ہوتی اور جو بینائی کا زاویہ یکسر تبدیل کر دیتی، حتیٰ کہ ویک اینڈ پر بھی اُس کی نظر کھلی موری والی جین میں مقید بے ساخت مشرقی پنڈلیوں تک ہی رہ جاتی۔ شاید وہ کسی نئے تجربے میں صرف ہونے والے وقت اور ذہنی صلاحیتوں کو فاضل کرنے کا متحمل ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا تمام تر وقت اور صلاحیتیں آنے والے دنوں کی تعمیر کے لیے وقف تھیں جن کا وہ تاجدار ہونے والا تھا۔ یہ ریما تو کسی ران پر غلطی سے نکل آنے والی پھنسی یا تل یا بیٹھ کر اُڑ جانے والی مکھی جیسی بھی مشکل سے معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اُس کا نام بڑا فنی تھا۔ جھگیوں، گلیوں سے اُٹھ کر شہروں کی کچی بستیوں کے ایک ایک کوٹھری کے مکان میں بیس بیس افراد کے کنبے جب آباد ہوتے ہیں تو شہری سوغات کے طور پر بچوں کے فلمی نام ضرور مستعار لے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ربیکا کا انگریزی سوغات والا نام پتہ نہیں کس احساسِ محرومی کی نشانی ہے۔ یہ ناموں کی سائیکی بھی عجب ہے۔ رکھنے والے کس پس منظر کا شکار ہوتے ہیں اور رکھے جانے والوں پر ان ناموں کے اثرات کیا مرتب ہوتے ہیں، ڈاکٹر عائشہ کا نام تو ٹھیک ٹھاک پس منظر رکھتا ہے۔ پر وہ بھی قہقہوں کے آہنگ پر چائے پینے عاصم کے کمرے میں ہی آتی ہے لیکن یہ سب کچھ تو پہلے بھی ایسا ہی تھا۔ اُس نے بیک مرر میں دیکھا۔

چہرے کی بھری بھری پلیٹ میں دھبے دھبے سے نقوش جیسے سُوجن ہوئی ہو۔ کہیں اُسے کڈنی پرابلم تو نہیں ہو رہا۔ اُسے یوگا کرنا چاہیے اور آرام بھی اور تفریح بھی...... کلینک سے واپس آئی تو بچوں نے بتایا کہ پاپا کو اسی وقت فون آ گیا تھا اور وہ آپ کے پیچھے ہی نکل گئے تھے۔

''تم لوگوں نے کھانا کھایا۔''

اُس نے بیگ اور گاؤن کا بوجھ سائیڈ ٹیبل پر اُتارا اور سینڈل کا پھندہ پاؤں سے نکالنے لگی۔

''ہاں ماما! مَیں نے سالن مائیکرو ویو میں گرم کر لیا تھا اور ریما نے روٹی پکا دی تھی۔''

ریما اُس کی سینڈل اُٹھا کر چپل پاؤں کے قریب رکھتے ہوئے شرمائی جیسے روٹی پکا کر اُس نے کوئی بڑا شرمناک کام کیا ہو۔

''باجی آپ کے لیے کھانا لاؤں۔''

''نہیں مَیں نے وہیں کھالیا تھا۔''

''کیا کھایا تھا ماما۔''

دونوں بچے یکبارگی بُری طرح بھو کے ہو گئے۔

''ڈاکٹر حسن نے پارٹی دی تھی۔ اپنی منگنی کی خوشی میں۔''

''کیا کھایا ماما۔''

آمنہ کے چہرے پر ایسا خلا آیا جیسے پیٹ کے ٹنل میں سے بھوک سے لدی اشتہا کی گاڑی چھک چھک گزر گئی ہو۔

''ہمارے لیے کچھ نہیں لائیں۔''

''لائی ہوں جاؤ گاڑی سے نکال لو۔''

چپس بسکٹ آدھے نگلتے، آدھے گراتے ہوئے آمنہ نے چٹخارہ لیا۔

''ماما! اس اشعر کے بچے نے گلاس بھی توڑا مجھے گالی بھی دی اور ریما کے بال بھی کھسوٹے۔''

آمنہ نے دہل کر آنکھیں بند کیں۔

ماما یہ پنجابی بھی سیکھ گیا ہے۔ مجھے اس نے کہا۔ ''الو دی کن......''

''کتنے شرم کی بات ہے۔ ماما!! پنجابی۔ Even پنجابی Can you Imagine پنجابی۔''

شرم کے مارے سینے کمر اور کولہوں سے تین بل کھاتی ریما نے ٹوٹے ہوئے گلاس کے تین ٹکڑے اُسے دِکھائے۔

''یہ میرے Favourite کارٹون کیوں نہیں دیکھتی تھیں، فلم دیکھتی ہیں۔'' جُرم کے خوف سے اَندر ہی اَندر لرزتا ہوا مجرم جو بظاہر دلیر بن رہا تھا۔

''یہ ریما کی بچی کہتی ہے۔ فلم لگاؤ وہ بھی انڈین۔''

فلم کے نام نے ریما کے چیکے گالوں میں ہلکا سا اُبھار بھر دیا اور کوکے والا نتھنا ذرا سا سکڑا جس میں سے پانی کا قطرہ نکلا جیسے مُنہ کی بجائے ناک سے رال ٹپکی ہو یہ ان لڑکیوں کے ساتھ سب اُلٹ ہی

کیوں ہوتا ہے۔ آمنہ کے پیچھے کھڑی یہ ساڑھے چار فٹ کی لڑکی اگرچہ بالغ تھی لیکن دِکھنے میں نابالغ بچی معلوم ہوتی، اُس کا جسم اُس کے دماغ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں آگاہی کی وہ سنجیدگی تھی جو بتدریج نہیں مکمل شکل میں وارد ہوتی ہے جیسے سارا آموختہ یکبارگی اُنڈیل دیا جائے کہ آگاہی کے بوجھ سے آنکھیں دماغ سوچ سب شق ہو جائیں۔

بچے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ریما گدا اُٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں سونے جا رہی تھی۔ عدیلہ کی نگاہیں اُس کی ایڑیوں کی پیلی پیلی پھٹی ہوئی بیائیوں میں دھنس گئیں جن کے اُوپر ٹخنے کی سیاہ جلد چمکتی تھی جیسے جگالی کرتی بھینس کی دورنگی باچھیں۔ ''ریما تم بچوں کے کمرے میں سو جاؤ۔''

اُس نے سر پر رکھے لحاف کو ہاتھ سے سنبھالا دیا۔ ہاتھ کی پشت اور ہتھیلی کی رنگت یکساں تھی۔

''صاحب جی کے لیے دروازہ کھولنا ہوگا اے سی کی آواز میں تو پتہ ہی نہیں چلتا۔''

''تم سو جاؤ دروازہ میں کھول دوں گی۔''

پچھلے دو سال سے عاصم کے لیے دروازہ ریما ہی کھولتی تھی کہ عدیلہ کی نیند خراب نہ ہو۔

اُس نے کوکے والے نتھنے کو اُوپر سکیڑا جیسے سنک واپس حلق میں گرائی ہو۔

عاصم کے لیے دروازہ اُسے کھولنا چاہیے، کھانا گرم کر کے دینا چاہیے۔ کتنا ضروری خیال تھا جو پندرہ برس میں پہلی بار اُسے آیا۔ اُس نے آئینے میں جھانکا اُسے یوگا کرنا چاہیے اور تفریح بھی۔ یہ خیال بھی آج ہی آیا۔ لیکن دوسری بار۔

رات ڈیڑھ بجے آنے والی بیل پر جب عدیلہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے دروازہ کھولا تو ڈاکٹر عاصم نے غیر متوقع جھٹکا کھا کر سوال کیا۔

''تم ابھی جاگ رہی ہو۔ لڑکی گھر چلی گئی ہے کیا؟''

''نہیں گھر تو نہیں گئی پر بچی کی نیند خراب ہوتی ہے۔ سارا دِن کام بھی کرتی ہے۔ اب دروازہ میں خود کھولا کروں گی......''

مسکراہٹ کا آخری سرا ہونٹوں سے اُٹھ کر آنکھوں کے کناروں پر پھیل گیا۔

''لیکن اس طرح تمہاری صحت تباہ ہو جائے گی۔ سارا دِن کام اور پھر رات کا جاگنا'' ڈاکٹر عاصم کے کالر پر میل کی ہلکی لکیر سی چمکی، چھ گھنٹے کے آپریشن کے دوران کیسے کیسے نازک مرحلے نہ آئے

ہوں گے۔ کتنی بار پسینے کا میل سفید کالر نے پی لیا ہوگا۔

''کیا اس کی صحت تباہ نہ ہوگی۔'' آنکھوں کے کناروں پہ پھیلی مسکراہٹ اُٹھ کر ماتھے کی شکنوں کو ہموار کر گئی۔

''چلو کل سے مَیں چابی ساتھ ہی لے جایا کروں گا۔''

ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کالر کی اندرونی سطح پر میل کی لکیر کے نیچے دھبے سے نظر آئے یقیناً وہ تھکا ہوا تھا۔

عاصم کی یہی تو خوبی تھی۔ کیسا گھمبیر مسئلہ ہوتا حل ایسا آسان نکلتا کہ خیال گزرتا مسئلہ تو تھا ہی نہیں بس حل ہی نافذ کرنا باقی تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے...... کھانا۔''

ماتھے پہ رکھی مسکراہٹ پھر ہونٹوں کے کناروں پر اُتر آئی۔

''نہیں وہیں کھا لیا تھا۔''

''کیا کھایا۔''

معمول کے مطابق ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا استفسار اُن دونوں کے بیچ کبھی نہ ہوا تھا۔

''ڈاکٹر ثمینہ نے پارٹی دی تھی۔''

''کیوں؟''

''سکالرشپ ملا ہے۔ سپشلا ئزیشن کرنے جا رہی ہے۔''

شاور کے شور میں الفاظ باتھ روم میں بند ہو گئے۔ گویا چھ گھنٹے کے آپریشن کے دوران دو گھنٹے کی پارٹی اور آپریشن تھیٹر سے ملحقہ ریسٹ رُوم میں ڈاکٹر عاصم اور اسسٹنٹ ڈاکٹر ربیکا کا چائے کے کپ پر دو گھنٹے کا ریسٹ اُس نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر دو چار سڑوک بالوں میں مارے۔

''چلو ایک تو کم ہوئی۔''

مس وکٹر کی پنڈلیاں ویسی ہی فیٹ ہیں یا کچھ ڈائٹنگ کر لی ہے اس نے۔''

''مَیں نے کبھی خیال نہیں کیا۔''

ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھے کلون کا فوارہ سا چھٹا۔ باڈی اسپرے کی خوشبو اے سی کی ٹھنڈک میں رچ

گئی تھی۔

''ڈاکٹر ثمینہ اب بھی ویسا ہی باریک شرٹ پہنتی ہے جس کے اندر سے......'' وہ دوسرا تکیہ پیچھے جما کر بیٹھی جیسے لمبا عرصہ آسن جمانے کا ارادہ ہو۔ یوگا اس کے لیے کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

عاصم نے لمبی اُنگلیوں والا ہاتھ فضا میں لہرایا اور کلائی پر وقت دیکھا۔

ایسی اُنگلیاں مصوّر، شاعر یا پھر کسی سرجن کی ہی ہوسکتی ہیں۔

''اوہو دو بج گئے کل میرا لیکچر ہے فسٹ پریڈ میں......''

''ڈاکٹر زمین ہے تو خوبصورت لیکن پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ کم ہی ہے اور ڈاکٹر فرزانہ تو کسی صُورت ڈاکٹر لگتی ہی نہیں ہے اور ڈاکٹر ربیکا۔ وہ تو پُوری یورپین بننے کی کوشش میں ہے، سیکس کلچر کے لحاظ سے تو یہ ٹپری واس بھی پُورے یورپین ہی ہوتے ہیں۔''

''یار یہ آج تم کیسی (Frustrated) فرسٹڈ عورتوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔''

عاصم نے بیزاری سے جمائی لی اور سلیپنگ پلز دُودھ کے گلاس کے ساتھ نگلیں۔ اُس کا خیال تھا۔ سوتے میں بچے خوبصورت لگتے ہیں یا پھر نوجوان لڑکیاں بشرطیکہ مُنہ کھول کر نہ سوئیں، لیکن اُسے حیرت ہوئی تھی کہ عاصم سوتے میں جاگنے سے زیادہ اچھا لگتا جیسے سویا ہوا نہیں بلکہ سونے کی اداکاری کر رہا ہو، خوبصورت شوہر کی بیوی بھی بس سمجھو چاروں اور سے جھلتے جھکڑوں کی زد میں آئے تنکے کی طرح مار کھاتی ہے۔

شاخ پر مسکراتے پھول کو کوئی کب تک دیکھنے کا حوصلہ رکھتا ہے یا توڑ کر سجا لینا یا سُونگھ کر مسل دینا یا دیکھ کر گزر جانا۔ اُس نے اُکتاہٹ سے مُنہ پھیر لیا جو شخص سارا دن خوبصورت کلائیاں پکڑے، بھرے بھرے سینوں پر استھسکوپ لگا دھڑکنیں سنے، جوڑ جوڑ ہڈی ہڈی ٹٹولے اُسے کس انقباض کو رفع کرنا ہے کہ وہ ہاتھ پُونچھنے نیپکن سی بیوی......

وہ عدم توجہی کا شکار ہو کر انتقامی سی ہو رہی تھی کہ بلی سی آہٹ سے ریما اندر آئی اور جڑی ہوئی گھنی بھنوؤں تلے سیاہ جامن سے پپوٹوں کو عاصم پر گرا دیا۔ عدیلہ کی بٹ بٹ جاگتی آنکھیں سینڈوچ کی فیلنگ کی طرح دونوں تہوں کے بیچ جم گئیں۔

''باجی! صاب جی آ گئے، کھانا گرم کر کے لاؤں۔''

''نہیں جاؤ سو جاؤ تم۔''

باڈی اسپرے رچی اے سی کی ٹھنڈک نے خون کے دباؤ کو بالکل گرا دیا۔ انتقامی جذبے کی حرارت بے مائیگی کے یخ میں جم گئی۔

''ارے یہ بھی! ہے کیا اس کے پاس، کراہت اور ریما کے نام کے سوا، ہزار روپے کی ملازمہ کل ہی دفع کر دے گی اسے تو......''

سلیپنگ پلز کھا کر سفید چادر تان لی۔ صبح دیر سے اُٹھی بچے سکول جا چکے تھے۔ عاصم میڈیکل کالج اپنا فسٹ پریڈ لینے جو صبح آٹھ بجے تھا۔ ناشتے کی ٹرے اُس کے سامنے رکھتے ہوئے ریما اپنی فرض شناسی کی کہانی سنانے لگی۔

مالی گھاس کی کٹائی کر رہا تھا۔ چار روز نہ آنے پر وہ اُسے ڈانٹ چکی تھی۔ کپڑے دھونے والی کو کپڑے اکٹھے کر کے دے چکی تھی۔ برتن چمکا کر شیلفوں میں لگا چکی تھی اور اب جھاڑن پکڑے سارے گھر کی جھاڑ پونچھ کرنے والی تھی۔ ساتھ ساتھ ماسی کو کونوں کھدروں سے اچھی طرح صفائی کرنے کی ہدایات جاری کر رہی تھی۔ عدیلہ کو گیارہ بجے ہوسپٹل پہنچنا تھا۔ وہ نہا کر باہر نکلی تو اُس کے استری شدہ کپڑے ڈریسنگ میں لٹکے تھے۔ صاف کیے ہوئے جوتے بیڈ کے پاس اور بیگ بیڈ کے اُوپر رکھا تھا۔ عدیلہ کو اس ذرا سے وجود کی اہمیت کا شدت سے احساس ہوا۔ اُس نے سوچا اگر وہ چند روز کے لیے گھر سے دُور رہے تو گھر کے کسی نظام میں کوئی گڑ بڑ نہ ہوگی، اور اگر ریما چلی جائے تو پوری مشین پہلے ہی چکر میں گھڑ گھڑا کر رُک جائے گی، پھر ایسی یتیم لڑکیاں ملتی کہاں ہیں جن کے لواحقین سال دو سال کا ایڈوانس پکڑ مڑ کر نہیں دیکھتے۔ ماں باپ والیاں تو اِدھر کسی کوٹھی میں لگیں۔ اُدھر لاڈلی ہو گئیں۔ روز روز ملنے کے بہانے نت نئے تقاضے۔ دو روز کی چھٹی پر گئیں دس روز پلٹ کر خبر نہ لی۔ اُسے رات والی سوچ شدید ذہنی تھکن کا ردِ عمل معلوم ہوئی۔

اَنستھیزیا دینے کے بعد ڈاکٹر نعمان مریضہ کے ہوش میں آنے تک اُس کے کمرے میں بیٹھا رہا۔ دو تین بار دونوں نے چائے پی اور جیسے بڑے ضروری امور ڈسکس کرتے رہے۔ انتظار میں بیٹھی ہوئی چھوٹے بڑے پیٹوں والی عورتیں بار بار ٹائلٹ جاتیں اور پھر کمرے میں جھانکتیں اُسے ان کی اُلجھن اور بے صبری سے مزا آنے لگا اور اُس نے بیل دے کر چوتھی بار جوس لانے کو کہا اور اُس کے بعد چائے بھی۔

معمول کی نسبت دیر سے گھر پہنچی تو بچے ٹیوشن پڑھنے جا چکے تھے۔ عاصم واپس آ چکے تھے اور

کھانا کھا کر آرام کر رہے تھے لیکن وہ بھوکی تھی اور تھکی ہوئی بھی۔ عاصم پر نگاہ پڑتے ہی اُس کے اندر بھوک اور تھکاوٹ گنادہ سی ہوگئی۔ پتہ نہیں بھوک تیز تھی کہ تکان شدید تھی۔ تھکے ہوئے دماغ کا فوری ردعمل ناراضی اور غصے کا تھا جس کی وجہ واضح نہ تھی۔ رات سے ہی دِل پر بدہضمی کا بوجھ سا چڑھا تھا۔ حالانکہ وہ بڑی دیر ڈاکٹر نعمان کے ہمراہ چائے اور جُوس کے ساتھ اسے ڈائجسٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن بدہضمی شاید زیادہ تھی اس کی Digestion لیموں پانی نمک پیاز سے نہیں بلکہ بھرپور تے سے ہی ممکن تھی۔ عاصم کو مکمل طور پر نظرانداز کرتی اور ابکائی کو اندر ہی اندر اُنڈیلتی ڈریسنگ میں چلی گئی۔ معمول کے مطابق عاصم کے گھر ہونے کی صُورت میں وہ پُشت کر کے کھڑی ہوتی اور عاصم اخبار یا کسی آرٹیکل پر نظریں جمائے یا موبائل کان سے لگائے لگائے زِپ کھول دیتا۔ آج وہ بازو موڑ کر ہاتھ زِپ کے ہک تک پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی جب عاصم نے ڈریسنگ کا پردہ ہٹا کر زِپ کھول دی۔

''رات تمہیں مس وکٹر کی پنڈلیاں اور ڈاکٹر ثمینہ کا باریک شرٹ کیوں یاد آ رہا تھا...... اور ربیکا کا یورپین اسٹائل۔'' اُس نے جیسے نامکمل بات مکمل کر دی۔

وہ اپنے کناروں میں پوری طرح گھٹی بندھی رہی کہ ذرا سی ہلی نہیں کہ بہہ نکلی۔

''حبس بہت ہے کئی روز سے آندھی بارش نہیں آئی نا۔''

عدیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ سامنے آئینے میں عاصم کا عکس تھا۔

جیسے ندی کی تہ میں اُترا چاند سارے پانیوں کو اپنے محور پہ لے آتا ہے۔ چاند کی بھی عجب خصلت ہے۔ چلو بھر پانی میں بھی ڈوب جاتا ہے اور دریا سمندر سب ٹھنڈی میٹھی چاندنی کے گھونٹ بھر رگِ جاں تک سیراب ہو جاتے ہیں۔ عاصم جب بھی باہر سے آتا غُسل ضرور لیتا ہے، جس کی بغلوں، پَیروں کی انگلیوں، نتھنوں، سانسوں، کانوں کی کرکری ہڈی سب مہک چھوڑتے ہیں۔ سارے مسام مُنہ کھولے مشک دار اور گرم سانس لیتے ہیں جو صبح شام موزے اور بنیان تبدیل کرتا ہے جس کے وجود کی مہک ابھی بدن میں ہی رچی تھی۔ وقت نے اُڑا کر جسے ہمک میں تبدیل نہ کیا تھا، جس کا پیٹ پسلیوں کے اندر سمٹا تھا۔ ہڈیوں پہ منڈھا گوشت باہر کی سمت نہ پھسلا تھا۔ سَر پر بال ابھی پُورے تھے اور جل کی پالش میں چمکتے تھے۔ یہ سب کچھ کسی بھی عورت کی ناراضی کو ایک ہی معطر جھونکے میں سمیٹ لینے کو کافی تھا۔ عدیلہ دفاعی حصار باندھے پلٹی۔

''ہاں حبس ہے لیکن صرف ہمارے لیے کہ جن کی بارش اور آندھی کی سمت متعین ہے۔ بارش دکن سے آنی ہے تو نگاہ بس اُسی سمت لگی رہنی چاہیے آندھی پُورب سے چھٹتی ہے تو بس باقی سمتیں لاپتہ لیکن مرد تو ہر سمت سے سیراب ہو جاتا ہے۔ کُچھ نہ ہو تو گندے کیچڑ میں بھی ڈبکی لگا فریش ہو جاتا ہے۔

''چھی چھی یہ تم کُچھ کُچھ ان کلچرڈ سی نہیں ہو رہی ہو۔'' لیکن عدیلہ جی!'' چاند اور سُورج میں یہی تو فرق ہے۔ چاند ہر ندی نالے میں اُتر آتا ہے جبکہ سُورج سمندروں میں بھی نہیں بھیگتا، اپنے ہی زُعم میں کہ جو آئے جل کر خاکستر ہو جائے۔ سُورج کو جلانا آتا ہے۔ چاند کو بھیگنا اور بھگونا۔ بس یہی فرق ہے ہم میں تم میں۔ یہ عورت ڈاکٹر ہو، انجینئر ہو، فلاسفر ہو لیکن رہتی وہی فرسٹریٹڈ انڈر میٹرک کوتاہ نظر بیوی۔''

عورت کی خفگی کا دورانیہ بھی مرد کی نوعیت سے وابستہ ہے۔ بساند مارتے مسام اور سانسیں ڈکار اور چھینکیں، ست چڑ بیلے اعضاء کی کاہل حرکات جو مناتے مناتے نیند کے جھکولوں سے ہڑ بڑا کر جاگیں، خفگی سے ماننے تک کا سارا طے شُدہ دورانیہ الاسٹک کی طرح ہاتھ سے جھپٹ پھر پہلے کنارے پر پہنچ جاتا ہے لیکن مشکبار وجود کی چوکس حرکات پہلے ہی ہلے میں سب بہا لے جاتی ہیں جیسے چاند سارے ندی نالوں میں بھیگتا ہے اور بھگو دیتا ہے۔

جب وہ باہر نکلی تو شام بڑی دُھلی دُھلائی اور سیراب تھی۔ بھُوک اور تھکن کا کتا وہ الگ الگ پوریوں کی شکل میں صاف صاف پہچانا جاتا تھا جیسے برف کے شیشے پر منعکس ہوتی تازہ رسیلی گنڈیریاں۔

اُس نے آواز دے کر ریما سے دو کپ چائے لانے کو کہا۔

عموماً اُس کی ہر آواز پر فی الفور جواب آتا۔

''اچھا جی۔'' انتہائی مؤدب اور لوچ دار آواز۔ آج شاید وہ غسل خانے میں تھی۔ وہ خُود باورچی خانے میں دیکھنے آئی۔

سٹیل کے راڈ سی بے لچک ہڈیوں والی تھکی، بھاری پنڈلیاں جیسے کسی الیکٹرانک مساجر نے دبا دبا۔ سینک سا تنک ہلکی پھلکی کر دی ہوں۔ بنا کسی جسمانی قوت کے سبک کبوتری کی سی پھدکتی ہوئی۔

ریما کپڑے استری کر رہی تھی لیکن استری کا پیندا اُس کی کاٹن کی قمیص سے گزرتا ہوا، استری سٹینڈ کے کپڑے کی راکھ چپکاتا ہوا جلے ادھ جلے دُھواں چھوڑتے بھُوسے کی مٹھیاں اطراف میں لٹکائے کثیف دُھوئیں میں سب کچھ دھنکار رہا تھا اور خود وہ بارش یا آندھی کی کس سمت دیکھتی تھی۔ بھسم کر

دینے کی خواہش میں سورج سی آگ برساتی اور دونوں آنکھوں سے خود برستی ہوئی۔

عدیلہ نے سوئچ بند کر کے اگزاسٹ فین چلایا۔ استری سنک میں رکھ ٹونٹی کھول دی سرسرسرا بھاپ اور دھواں چاروں دیواروں سے سر مارتا چھت سے ٹکراتا ایگزاسٹ فین کے مُنہ پر سیاہی ملنے لگا۔

''باجی میں نے پنڈ جانا ہے۔''

گکھوں کی گلی سے اُٹھ کر آنے والی یہ گنوارن اور ڈاکٹر عدیلہ عاصم گائنا کالوجسٹ کیا دونوں کے حبس موسموں کی زبان یکساں تھی۔ ایگزاسٹ فین کے پَروں پر دھواں اور دھند کار بن بن کر لیپ ہو رہے تھے۔

''کیا ہوا.....''

عاصم کے کھانستے ہوئے حلق میں لفظ کھکھیائے لیکن اس کا تو کھانسنا چھینکنا کھکھیانا ہر حرکت میں تناسب اور کشش ہوتی کہ وہی اسٹائل بن جائے۔

''یہ پنڈ جانا چاہتی ہے۔''

عدیلہ بھی کھانسی لیکن اُس کے حلق میں کڑواہٹ بہت دُور تک اُتر گئی۔ اُس نے کھنگار کر سینہ صاف کیا۔

''نہیں ریما میں خود اتوار کو تمہیں لے جاؤں گا اور ملوا کر ساتھ ہی واپس لے آؤں گا۔ وہاں پنڈ میں تمہارا ہے بھی کون ہمیں تو ہیں تمہارے سب کچھ، چلو مُنہ ہاتھ دھوؤ اور اچھے بچوں کی طرح چائے بنا کر لاؤ۔''

عاصم نے اُس کی پشت تھپتھپائی۔

ریما کی آنسوؤں والی آنکھوں میں افشاں سی کتری گئی۔ چلی تو بدن کی پینگ سی جھلائی۔ پچکے گالوں سے جیسے چکنی مٹی کی مہک اُٹھی ہو، جسے بارش نے بھگو کر گوندھ دیا ہو۔ باہر لان میں پلاسٹک کی بھیگی کُرسیوں پر بیٹھتے ہوئے عدیلہ نے خُون کے بہاؤ میں رُکتے کلاٹس پھیپھڑوں کی سمت دھکیلے صاف ہو کر پھر جز وِ خون بننے کے لیے ورنہ کسی نہ کسی شریان کو بند کر کے پھاڑ ڈالتے۔

''کھانے کو وافر، پہننے کو اچھا، پھر بھی پنڈ، جب پیٹ بھرا ہو تو بھوک کا ذائقہ بھول جاتا ہے نا ان لوگوں کو.....''

''آزادی...... عدیلہ جی آزادی بڑی نعمت ہے، بھرے پیٹ کی غلامی سے خالی پیٹ کی آزادی...... یہ نہ ہوتا تو ترقی یافتہ اقوام کے غلام آسائشوں پر مطمئن ہو کر آزادی کے لیے جانیں کبھی نہ دیتے۔''

''ہاں آزادی مار اور بھوک کی آزادی جس کا جی چاہا پھینٹی لگا دی، جس کا جی چاہا......''

''اب پہنچی ہو عدیلہ جی۔ بھوک کی کیمسٹری یہی ہے، اُچکنا اور اُچکے جانا، صبر اس کی نیچر نہیں، اور تم بھوک کو ترسا وے دے رہی ہو۔ صبر کا دم لگا رہی ہو۔ ڈرائیور سے مت بولو، مالی کے قریب مت جاؤ، دُودھ والے سے بات نہ کرو، عدیلہ جانی! جب بھوک کو ترساؤ گے تو یہ انقلاب ہو جائے گی۔ تمام حدیں تمام اصول، تمام قانون بہا لے جانے والا مُنہ زور سیلاب......''

آفٹر شیو لوشن کی گیلاہٹ میں سنہری جلد چمکتی تھی۔ سبزی مائل شیو ابھی نرم اور تازہ تھا۔

''کسی کمیونسٹ کا اشتہار معلوم ہوتے ہو۔ دیکھ کر مکھی نہیں نگلی جا سکتی۔''

ستونوں پر چڑھی بیلوں میں بنے گھونسلوں میں بسیرا لینے سے پیشتر مصنوعی فوارے کے تالاب میں غسل لیتے پرندے غوطہ لگاتے اور پَر جھاڑتے تھے۔

''لیکن تمہیں کیا معلوم کوئی ریسٹورنٹ، کوئی میزبان، کوئی باورچی، کتنی مکھیاں صفائی سے نکال کر بہترین برتنوں اور سجاوٹ کے ساتھ آپ کو کھِلا پلا دے، پھر تو کراہت کی کوئی وجہ ہی نہیں رہتی نا، عدیلہ جی مکھی کے دونوں پَر ڈبو کر باہر نکالو۔ یوں کہ مکھی بھی آسودہ ہو جائے اور نجس بھی پاک ہو جائے۔ کیسی زبردست حکمت! کسی بھی جرم پر تین چشم دید گواہ لاؤ، نجس کو کلمہ پڑھ کر پاک کر لو۔ یہ سب کیا ہے۔ یہی پردہ داری...... بہت ساری انسانی کمزوریوں سے خفیہ معاہدہ۔ حد یہ کہ مکروہ بھی جائز کی ذیل میں ہے۔''

موبائل پر ڈاکٹر عاصم کی اسسٹنٹ ڈاکٹر ربیکا نے آپریشن کے وقت کی اطلاع دی تھی۔

''مریض مُردہ ہے یا کہ زندہ......''

آفٹر شیو لوشن کی چمک میں تارے ٹمٹمائے۔ مساموں میں پھنسا پستئی شیڈ گہرا ہو گیا۔ فون کے اَندر سے چھچلتی ہوئی ہنسی غسل لیتی چڑیوں کو اُڑا لے گئی۔

''جناب حاضر ابھی حاضر آپریشن کیا پوسٹ مارٹم کے لیے بھی حاضر آپ حکم تو کریں۔''

وہ دونوں کسی مشترکہ کوڈ ورڈ پر بے تحاشہ قہقہے لگا رہے تھے۔ قہقہے لگاتے ہوئے عاصم کا جسم

پوری طرح سمٹا ہوا تھا، نہ اُچھلتا ہوا پیٹ، نہ گالوں تک چڑھے ہوئے جبڑے۔ نہ ٹھوڑی کے نیچے چربی کی لرزتی ہوئی قبر، شادی کے ویٹنگ ہال میں بیٹھی لڑکیوں کی فرسٹریشن کا بہترین نکاس، نکلتا ہوا قد، جسم، چہرہ، بال، جن کی اطراف کی سمت مراجعت میں ابھی وقت باقی تھا، جبکہ وہ دونوں کلاس فیلو تھے۔ شاید وہ بے احتیاطی سے کھیلی اور اپنے اچھے پتے قبل از وقت ضائع کر بیٹھی۔ تو یہ سنگین ابھی تک بالکل سیدھی تھی جو اس کی زد میں آئے شکار ہو جائے۔ جب کہ وہ بل کھا کر مڑ رہی تھی۔ مراجعت اطراف کو بہ نکلی تھی۔ شادی شدہ عورت کی فرسٹریشن کے نکاس کیوں اتنے ڈائنڈ کر دیے جاتے ہیں کہ وہ اندر ہی اندر پتھولتی سُوجتی اطراف میں بہنے لگے۔ کمی نکلی چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اُترا، کراہت سینے پر چڑھ بیٹھی۔ ڈاکٹر ربیکا اس کی نسبت خوبصورت تو نہ تھی لیکن فریش ضرور تھی اس لیے خوبصورت لگتی تھی۔ اس میں اب اُس کا کیا قصور کہ وہ اُس سے پہلے پیدا ہوئی۔ مس وکٹر بالکل خوبصورت نہ تھی لیکن کم عمر تھی۔ یہ کم عمری بھی کتنا خطرناک ہتھیار ہے۔ عورت کی زرہ بکتر ... بعد میں پیدا ہونے والی یہ عورتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ پہلے پیدا ہونے والی عورتوں کے لیے تضحیک وتحقیر کے اشتہار، پوری گھاتیں، پہلے پیدا ہونے والی عورتوں کے فن، ہنر، نوکری، حُسن، علم حتیٰ کہ شوہر تک کی گھات میں بیٹھی ہوئی قزاقنیں۔

ڈاکٹر ثمینہ، ڈاکٹر نورین، ڈاکٹر طیبہ، کتنے قہقہے عاصم کے وٹامنز جیسے بھرپور اور شہد جیسے چپکیلے قہقہوں سے چپکتے اور صحت افزا ہوتے ہیں۔ پیالوں سے مس ہوتے کتنے لبوں کی چسکیاں ہم آواز ہوتی ہیں۔ وہ خود بھی تو مرد ڈاکٹروں کے ہمراہ ہنسی کی کھنک شامل کر دیتی ہے۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ کسی کے بند کنٹینرز سے انقباض میں یہ اخراج کا باعث ہوگا، فقرہ بازی، لطیفہ گوئی، چھوٹے موٹے رومانس میں لپٹا ہوا مزاح، شاید بھاپ کے بند کنٹینرز میں یہ ذرا ذرا سوراخ ضروری ہیں۔

ذرا ذرا اخراج، تھوڑا تھوڑا سا ضیاع، ایک بڑے ذخیرے کو محفوظ کر دیتا ہے ورنہ بھاپ کی اندرونی قوت

عاصم کے کالر کی اکڑی ہوئی تہہ سے اٹھتی ہوئی خوشبو فوارے کے چھینٹوں میں جذب ہوتی تھی جس میں نہاتی ہوئی کبوتریاں، لالیاں، چڑیاں ڈبکیاں لگاتیں اور تہہ میں کچھ چگتیں گردنیں جھٹکتیں پَر جھاڑتیں۔

گاڑی کی ونڈ سکرین صاف کرتی ہوئی ریما جیسے صافی کی تہہ میں کوئی دانہ دنکا لپیٹے شیشہ صاف

کرتے ساری نچڑ رہی ہو۔ ذرا سی کیڑی جس کے منہ میں شکر دانہ دبا ہو۔ ارے یہ تو ایک چھینٹے کی مار ہے۔

بچے ٹیوشن پڑھ کر واپس آ گئے تھے اور ریما سے فرنچ فرائز بنوا کر کھا رہے تھے۔ کتنی ضروری تھی یہ لڑکی اس گھر کے لیے لیکن اس سے ضروری وہ اعتماد اور بھروسہ تھا کہ اگر ٹوٹ گیا تو پھر اُس کی انا...... گھر...... بچے...... وہی عائلی توڑ پھوڑ کی پُرانی کہانی، جو اپنے آپ کو دُہرا دہرا نہ گھسی نہ پھٹی نہ تنگ آ کر مری، لیکن دیکھ کے مکھی نگلی نہیں جا سکتی یہ بھی پرانی حکائت لیکن لاعلمی کا پردہ، ابہام شک اور دورائے انا کو سہارنے والی کامیاب تشکیک، آمنہ نے ٹی وی لاؤنج سے پُکار کر کہا۔

''ماما!...... پاپا کا فون تھا۔ وہ لیٹ آئیں گے۔''

پتہ نہیں کیوں اُس نے اس خبر کا تاثر ریما کے چہرے پر دیکھنا چاہا۔ اُسے لگا وہ ریما سے بھی کوتاہ، چپٹی دھنسی زمین کی کسی چنٹ میں پھنسی کسی پیر کی کچل کی منتظر ہے جس کی استواری بھوک ہے۔ بھوک جو صبر اور قناعت کے پردے سے نکل کر خونی انقلاب ہو جاتی ہے جس کی سرشت میں ریخت ہے۔ ڈاکٹر ربیکا اور ڈاکٹر عاصم کا مشترکہ ریٹائرنگ روم، رات دو ڈھائی بجے تک چلنے والا آپریشن، تھکے اعصاب کو تقویت پہنچانے والے مشروب پتہ نہیں صاف یا مکھی نکلے۔ پاک نہ صحیح، مکروہ ہی صحیح پر ناجائز تو نہ ہوئے نا۔

ڈاکٹر ربیکا، ڈاکٹر ثمینہ، ڈاکٹر عائشہ، مس وکٹر اور پتہ نہیں کتنی کم عمری کے کاسے تھامے ویٹنگ روم کی بھک منگیاں، بھوک کو تر سا وا انقلاب ہو جاتا ہے۔ قلندرانہ لاغرضی اور ایثار جس کی باڑ ہے۔ جہاں واضح غیر واضح ہو جائے۔ مکھی کو اُنگلی سے نکال کر پی جانا کتنی بڑی حکمت، نجس کو پاک کرنے کی معاشرتی ضرورت اور اخلاقی دانائی وہ اُٹھی تو کتنی چڑیاں پَروں سے پھواریں اُڑاتیں، چونچوں میں مٹی، کنکر، تنکا، پھنسائے گھونسلوں میں دُمیں جھلاتی گردنیں گھسیڑتی چلی گئیں لیکن لان، فوارہ، گھاس، سب وہیں اُس کے قدموں میں بچھا رہ گیا۔

''ریما آج تم ٹی وی لاؤنج میں سو جانا صاحب کے لیے دروازہ کھولنا وہ لیٹ آئیں گے۔''

بچوں کی پینگ جھلاتی ریما کو اُس نے مُڑ کر نہ دیکھا کہ اس خبر کے تاثرات اُس کے چہرے پر کیا ہیں۔

رُخصت پا گیا

چائے کے پیالے کو مُنہ لگا تھا کہ گھوڑے نے پانی کی ناند میں باچھیں کھول دی تھیں۔ سُرک سُرک سُرک...... سانپ کی سسکاری ایک ہی ڈیک میں ٹھنڈا گرم پانی پیندے سے جا لگا اکو کے سُوکھے سڑے پنجے میں جکڑا روغنی مٹی کا پیالہ ڈیرے کی دوفٹ دیوار کے پار ہٹیوں (دکانوں) پر بیٹھے ہوؤں کی آنکھوں میں لہرایا۔

''سولے چاء احمے چاء ولایتی چینی والی چاء۔''

چوک کی چاروں گلیوں کی چاروں ہٹیوں پر بیٹھے ہوؤں نے ولائتی چینی والی چائے کی ہڑکھ میں ہنکارا ابھرا ''اکو ......سدو...... کاکو......''

مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے گونجتا اعلان چائے کے خالی پیالے میں اوندھا گیا۔

''محمد دین عرف کالو قضائے الہٰی سے فوت ہو گیا ہے۔ جس کی نماز جنازہ پیشی (عصر) کی نماز کے بعد مدرسے کے احاطے میں پڑھی جائے گی۔''

دکانوں کے دروازوں میں ٹھنسی پھنسی پھٹی کی بھانجی کے عوض لُون، تیل، مرونڈے خریدتی عورتوں نے جبڑوں کی ہڈیاں پھسلائیں...... چچ چچ

''شودا کل رات سے تنگ تھا۔''

پیالے کی آخری سُر کی کے ساتھ حلق کے اکھاڑے میں کبڈی مچ گئی اور حلقوم کی نوکیلی ہڈی جھلسی ہوئی جلد کے اندر دھمال ڈالنے لگی۔ ہنسی میں کھنکتے للکرے ڈیرے کی حدود پاٹتے ہوئے مویشیوں کی کھرلیوں، ڈھے ہوئے کھولوں، ماچھن کی بھٹی اور چاروں دکانوں کے تنگ دروازوں میں پلٹتے رہے۔

''کالوآرائیں رخصت پا گیا۔ وفات پا گیا۔''

کیکر کی نرم شاخ کی دندیلی (مسواک) کاٹتے ہوئے چاقو کی دھار خالد کی پور میں چل گئی۔ لہو کی بوند بوند ہنسی کی چھاگل میں بھرتی رہی ''خالد بابو جوان ہو گیا۔''

کیکر کی چھدری چھاؤں تلے نسرین جٹی کا لال ٹماٹر چہرہ ہرے کچور پتوں کو گلنار کر گیا تھا۔

''نسو جٹی کیا لونگ گواچا؟''

نرگٹ کی نوکیلی ہڈی اور ناک کی نوک سے ٹپکتے میلے پسینے کے قطرے ہنسی کی کن من میں ٹپکے۔

''خالد بابو جوان ہو گیا، کالوآرائیں رُخصت پا گیا۔''

ہٹیوں پر بیٹھے مرد تمباکو کی کڑواہٹ حلق میں نگلتے اور نتھنوں سے اُگلتے رہے۔

''اوئے اکی مصلن ......''

تذکیر کو تانیث کی، شرمناک گالی نے اُکو مصلی کو جیسے بالوں کے چھتے سے پکڑ کر اندر بیٹھک میں پٹخ دیا۔ اکڑوں بیٹھتے ہوئے بوسیدہ دھوتی استخوانی پشت پہ تن کر ذرا سی مسک گئی۔ ہڈیوں، جوڑوں، رگوں، شریانوں کی مٹھ اُلجھ کر گویا متعدد گرہیں کھا گئی۔

''اوئے اکے! ڈکی آوے۔''

''بادشاہ جی بڑی چیری (ضدی) ہے۔ نہیں مانتی۔ سیدھی تھارو بریٹ نسل کی مربع پال گھوڑی۔''

''ڈوب مر مچھلیوں والے تالاب میں تیرے سُوکھے ڈھینگر کو شارکیں اُگل دیں ڈڈو (مینڈک) سر نک دیں ساری حیاتی کی نیک نامی کھُو میں ڈال دی تُو نے......''

''سائیں حکم ہو تو مُرادو گجری حاضر......''

پاؤں سے نکلتا ہوا جوتا ہڈیوں کی مٹھ پر بجا جیسے پتھریلی زمین پر کچا بیر ٹپکا ہو۔
''تہاڈیاں جوتیاں ساڈا سر (آپ کی جوتیاں ہمارا سر)۔''
جوتا اُٹھا پیر میں پہنا ڈب کے لڑ سے صاف کرنے لگا۔
''اک اور آ دے سائیں۔''
''تُو خنزیر کی رت (لہو)! اک زنانی نہیں سنبھلتی تجھ سے۔''
''تہاڈیاں گلاں گنودیاں نالاں۔ گلاں دی چھل آ وے۔''
حویلی کے اندرونی دروازے سے نوکرانی دھم دھم ننگے پیروں کے بٹ مارتی باہر نکلی۔
''چاچا اکو! اندر سے آرڈر ہے۔ گھوڑی پال مربع سے برے دھنیے لا دے انہی پَیروں پر واپس مڑ، ہانڈی چولہے پر چڑھی ہے۔''
''لاتا ہے پہلے چائے کی پیالی لا اس نہلے کے لیے اگر تیار نہ ہو تو گُو چی اور دودھ...... جلدی لا باہر نہلے پہ دہلا......''
اکے کا استخوانی وجود افق پھیلا، ہڈیوں پسلیوں کی مٹھ عمودا ٹھی۔
''مان جائے گی آخر مانے گی ہی نا......''
حرف حرف گلے سے ٹپک ناک مُنہ میں گھنگھنیاں پرو گئے۔
''یہ ہوئی نا اکے مصلی والی بات۔ پر آج کل میں زیادہ صبر نہیں ہے اپنے پاس۔'' مونچھوں کے پھندے باچھوں کے کناروں پر گلہری کی دُم کی طرح لہرا گئے۔
گُو چی استخوانی پُشت سے اکی ڈب نے ہڑپ کر لیے۔
''اندر عرض گزار دو، برے دھنیے آئے کہ آئے۔''
نرگٹ کی ہڈی حلقوم کے بڑ میں دھمال ڈالنے لگی۔ باہر کیکر اور پیپل کے رلویں (ملے ہوئے) چھتنار تلے کٹی ہوئی اُنگلی اور گوا چا ہوا لونگ ڈکھ سکھ بانٹتے تھے......
''خالد بابو جوان ہو گیا۔''
''کالو آرائیں وفات پا گیا، رخصت ہو گیا......''
چاروں بٹیوں پر بیٹھے ہوئے خالد کی جوانی اور کالو آرائیں کی وفات کی خبر پر حقے گڑگڑاتے

رہے اور ہنکارتے رہے۔

''ہوں آں اں، اکو، سدو...... کاکو......''

اکو کے ننگے پیروں سے اُٹھتی چھنی ہوئی مٹی کا پہاڑی سلسلہ آگے پیچھے دائیں بائیں چونیاں بناتا چلا جارہا تھا۔ مُیا پہاڑ کی زد میں آئی گنگناہٹ اکو کی طنابیں کھینچ گئی جیسے دگھڑ دھم ریوڑ پانی کے تالاب میں اُتر گیا ہو۔

''اللہ نہ بھلاوے اے تے اکو آلی ٹور اے۔''

سِل پر تھاپا مار مار کپڑے کوٹتی مُرادو گجری کے تھاپے کی ضرب میں تواتر آ گیا جیسے ڈھولک پہ تمی کی تھاپ ایڑی کی دھمک کا ساتھ دیتی ہو۔ ڈب میں ٹھنسی گرو کی بھیلی اور پتی کی پڑیا ٹپ کر کے ڈھول میں گریں جو مُرادو کی ڈب میں فی الفور معدوم ہو گئیں۔

''نہ گُرو کی پیسی سِر میں ماروں...... سرونٹوں کا دُھواں کھینچ کھینچ دمہ ہو گیا۔ بالن (ایندھن) دیکھنے جوگا نہیں...... ڈبی اِٹ سٹ، چر چرا اُبھر گئی۔ میٹھا چارہ نام کا نہیں......''

تھاپے کی ضرب بوسیدہ کپڑے پر پڑتی رہی جیسے پھٹے ڈھولک پر ہاتھ کی تھاپ کمزور پڑ جائے۔

''رات چھٹریوں کا گٹھا اور چری کی پنڈ آدے ای آوے...... پر وہ خیری سنیاری ''

''بالڑی (بچی) ہے ابھی، اُتھری گھوڑی پٹھے پہ ہاتھ نہ رکھنے دے...... پرانے پاپی سے کہہ، ٹھنڈا کر کے پیئے۔'' مُرادو نے کپڑے کی میل نچوڑ کھال کی سطح پر تیراکس کے نچوڑ لیا۔

''نہ اکا ٹیم کوئی نہیں ڈاہڈیاں تا نگاں...... ڈاہڈیاں...... اور وہ مربع پال ''

مرادو کے ہاتھ سے نچڑا ہوا کپڑا لے کر ادھ جلے سرونٹے پر پھیلا دیا۔ ڈھول کے پہاڑی سلسلے کے اُدھر کسان کھانسے اور کھنگارے......

''سارے پر، چھوناں، توڑی پٹھہ، مرادو گجری کے لیے...... ہم بھی کچھ ہیں تیرے پر کچھ اور دیکھے تو نا......''

ٹیوب ویل کی کوٹھڑی پر لگا نال، دھک دھک دُھواں اُگلتا اور سیاہی کی لکیر شفاف کھیتوں پر بکھیرتا تھا۔

''اوئے اکے! برسیم کی کنال دلا دے ساونڑیں (خریف) کے کارے (اُدھار) پر ''

ٹھنڈے حقے کے کسیلے کش رمضو کے حلق میں چڑھ گئے۔ گلا پھنسی کھانسی کھانس کھانس پوروں سے اُٹھا اُٹھا چلم میں چنگاریاں بھرنے لگا نے اکو کی سمت موڑی۔

''نہ سائیں نا آپ خود کھو دانت (عزت) اُتار کے رکھ دیتا ہے......ابھی تو پچھلے مہینے چری کی کنال......ایمان سے پانچ سو سے کم نہ تھی جو تجھے تین سو میں دلائی اور وہ بھی کارے (اُدھار) پر......''

کھال میں نہاتی چڑیاں پھڑ پھڑا کر اُڑ ئیں اور چھینٹے چلم میں تر مرگر ے۔

''نہ سائیں آپ دانت (عزت) اُتر واؤ۔''

رمضو نے دو شاخے تنے میں اوندھے مُنہ دھری کالی بھجنگ دیگچی اُٹھا کھال کا پانی بھر کچے ڈھیلوں کے چولہے پر چڑھا دی۔ گُڑ کی بھیلی کی میل کھرنے لگی۔ کناروں پہ بنتے میل کی جھاگ کو منگر تیرا تیرا کر اُتارنے اور کھال کے پانی میں بہانے لگا۔

''بشیرو پُتر بلانگ (چھلانگ) مار، واڑی سے ہرے دھنیے توڑ، اَندر ہانڈی چولہے پہ رکھے اُڈیک (انتظار) میں بیٹھے ہیں......''

''چاچا اکو! ملک سے چناب (گندم کی قسم) کا بیج تو دلا دے۔ سنا انباروں میں کئی بوریاں بھری رکھی ہیں......''

کریلے نینڈے کے پیلے پھولوں بھری کیاریاں پھلانگتے ہوئے بشرو پتہ پتہ دھنیہ توڑنے لگا۔

''چناب نہ ملے تو امریکن ہی سہی......پر ساونڑیں کے کارے پر......''

''بس سارے میری ای دانت......اُتر واؤ......''

سُرک سُرک سُرک۔ لمبی لمبی سُرکیاں۔ موڑی کماد میں سے سرسر نکلتی ہوا، چری کے نانڈوں میں سرسرائی اور بانسوں کے جھاڑوں میں ساز بجتے رہے۔

''بانسوں کا باغ تیار ہے مول پڑ گیا تو لاکھ سے کم کا نہیں۔'' چلم ہوا میں دہکی، اکو نے چھنگلیا سے شرنہیہ کے باریک پتے چائے کی پیالی سے تیرا کر نکالے اور اُنگلی چوسی۔

''لکھ ہوئے یا ککھ اپنی تو بس چائے کی پیالی اور سُکھ کی نیند......''

لمبی سُرکی حلق اور سینے کو جلا کر راکھ جیسا ٹھنڈا بھسم کر گئی۔ ڈیرے کے کیکروں تلے گری پڑی پھلیاں اُٹھا اُٹھا پیروں کے ناخن رنگتی ہوئی منی ملکانی پھلیاں پھینک گدھی کی پُشت پر لدے چری کے

ٹانڈے کھینچ کھینچ چوسنے لگی۔

''اگو ہمیں پینگ ڈال دے۔''

''نہ منی ملکانی! رسہ ای کوئی نہیں، پینگ اپنے چمڑے سے ڈالوں کیا۔''

چاہے چمڑے سے ڈال چاہے آنت سے ڈال ہمیں پینگ چاہئیے۔

''ہاں اں......''

اوجری کا پاؤ بھرا استخوانی جبڑے پر گچھا ہو گیا۔

''رسہ ایک تھاں دیکھا تو ہے......''

نرگٹ کی ہڈی جلے بھنے چمڑے کے اندر رقصاں تھی۔

''کہاں دیکھا ہے کہاں دیکھا ہے......''

گدھی کی پُشت سے تھبے بھر بھر چارے والی کوٹھڑی میں لے جاتے ملازم ہنسنے اور ہنکارے دینے لگے۔

''ہاں امیرو چدھڑ کے ڈیرے پر......''

قدموں کی دگھڑ دھم تیز ہو گئی جیسے زمین کی پرات پر وزنی ہتھیلی کی تھاپ پڑتی ہو۔ گدھی چری کے لمبے پاندے زمین پر گھسٹتی، بھاگ نکلی ایک طرف کا وانگا خالی اور دوسری سمت کا بھرا ہوا تازہ چارے کی مہک اصطبل اور باڑے کو بھرتی ساری ہوا کو بوجھل کر گئی۔

''منی ملکانی ٹانگیں بھی تیل پیتی ہیں تو پھر چلتی ہیں۔ پر ان کا تیل تو مکا (ختم) ہوا ہے''

''ہوں ہوں آں۔'' ہنسی اور ہنکارے کانسی کی پرات پر گیٹے کی طرح بجے۔

''منی ملکانی اندر بھاگی۔''

قہقہے کے ریلے میں نرگٹ کی ہڈی ڈوبنے اُبھرنے لگی۔

''گلوتائی وفات پا گیا رُخصت ہو گیا...... خالد بابو جوان ہو گیا......''

مربع پال گھوڑی اصطبل کے صحن میں سرپٹ دوڑنے اور دیواروں سے جسم رگڑنے لگی مورچھل سی دم اوپر اُٹھ کرتن گئی تھی۔

''ڈالتا ہوں، ڈالتا ہوں ذرا کترا کراوں، بڑی اتھری (شوخ) ہے پٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتی

مشک پا کے ہنہناتی ہے...... تھارو بریٹ ...... اصلی نسل کی ......"

اکو ساروں کے کام کرتا ہے پر میرا کام......

شر۔نبہ کی پھلیاں پیروں تلے کھڑ کھڑ بجاتا بچ مسلتا نیلی نسل کی بھینس کے ماتھے کو تھپتھپاتا جس کا مڑا ہوا سینگ اُس کے اپنے ہی سر میں دھنس رہا تھا۔

"حکم طارق بابو حکم......"

ڈوبتی اُبھرتی نرگٹ کی بڈی نوکیلی چونی کی طرح تن کر ٹھہر گئی۔" نیچے لوہے کی پتری رکھی تو تھی پر...... سینگ کنوا دیتے ہیں...... نیلی نسل کا......"

"پتہ تو تجھے ہے۔سنیاری......"

"سونا چڑھا ہے حرام زادی کو سائیں! کوئی اور حکم کر......"

"فاطی جنی۔"

"نہ نہ نری گڑ کی بھیلی جیسی کالی...... موٹی......"

"نیکاں بلوچن۔"

"نہ کملی ہے رالیں ٹپکاتی ہے......"

"تو پھر مرادو گجری......"

"نہ بڈھی ہے۔"

"نہ سائیں قابل استعمال ہے ابھی۔"

"نہ بس سنیاری دوسری کوئی نہیں۔"

"وہ مربعے پال......"

نرگٹ کی بڈی کی چونچ سے پسینے کے قطرے ٹپ ٹپ ڈھول کو بھنتے تھے۔قطرہ جہاں گرتا ڈھول روز کی مانند پک کر جم جاتی۔

"باپ بیٹا دونوں...... ایک چٹ...... ایک لک......"

پسینے کے قطروں سے کرنڈ ہوئی ڈھول کے گرد بگولا ناچنے لگا اور گڑ والی چائے کا دیگچا چھڑیوں کی آگ پر اُبل گیا جس کی سیاہ سطح پر، پت کا میلا جھاگ تیرتا تھا جیسے چھلے والی عورت کا کاڑھا ہو۔اکو نے

ڈب میں سے روٹیاں نکال دو ٹکڑے کیئے۔ دو سے چار پھاڑ دیں اور ایک ایک ٹکڑا کلے کو تربوز بناتا گیا اور تربوز چائے کے بڑے سے گھونٹ کے ساتھ غڑاپ سے حلق کی کھائی میں اُترتا چلا گیا۔

فیکاں مراثن نے گوبر سے لتھڑے ہاتھوں پہ چادر کا پلو ڈال چائے کا پیالہ دونوں ہتھیلیوں پر رکھ لمبی سُرکی لی۔

''کالا گڑ وا چھوکی پت کا ہے نا...... کاسنک سوڑ اڈ الا ہی نہیں......''

''اکو مینی جھوٹی (بھینس) ادھیارے پر لے دے نا......''

''اکو گل دو گھنٹے ٹیوب ویل چلوادے ہاڑی (ربیع) کے کارے پر......''

''ملکوں کی چار بھینسیں وَ کی (گابھن) کھڑی ہیں ایک اگر مل جائے۔ ساونڑیں (خریف) کے کارے پر......''

چائے کی مشک راہ گیروں کو روکتی رہی اور ضروریات کے انبار لگتے گئے۔ شریہنہ کے پھول درختوں سے جھڑ، بُو ریُو ربکھر چائے کے پیالوں میں تیرنے لگے۔

''سارے میری ای دانت (عزت) اُتر واؤ۔ کوئی سنیاری کو بھی......''

اکو سب کے پیالوں میں کاڑھے جیسی کالی چائے ڈالتا رہا، جس کی شدید میٹھی بھاپ حلق میں پت کی طرح تار بناتی تھی۔

دھول اُڑاتی سم پٹخاتی دھول کے غبار بہت پیچھے چھوڑتی مربع پال تھارو بریٹ نسل کی گھوڑی کھلے گیٹ سے طوفان کی طرح داخل ہوئی سارے مزار عے ملازم پیالے چھوڑ کر ادھر اُدھر کھسکے جیسے ابھی کوسموں تلے دل ہل دے گی۔ تھارو بریٹ سیدھی اصطبل میں جا کر جسم پکی دیوار سے رگڑنے لگی۔

''مربع پال لگام چھڑا آئی با سو مصلی کو اوئر باری نہر میں پھینک آئی۔''

''تھارو بریٹ پر سواری کی کوشش کی ہوگی۔'' اکو مصلی دونوں گھٹنوں کے بیچوں بیچ مُنہ دبا گنگا۔

''دیکھو کوئی ہڈی پسلی بچی کہ نا...... کہ شاید رُخصت پا گیا...... آخر تو وہ مربع کی مالک ہے ''

''اوئے اکے۔''

ڈیرے کے اندرونی حصے سے نکلتی آواز بھینسوں کے جسموں کی اُمس میں گھل کر بچی۔

''مربع پال لگام چھڑا آئی۔''

''جی سائیں!''

''کتنی بار حرامیوں کو سمجھایا سواری کے لیے نہیں ہے۔ پتہ نہیں ملائی بھی ہوئی کہ نا......''

''سائیں! خچر کو لات مارتی ہے۔ گھوڑے کو بھی پسند نہیں کرتی۔''

''اچھا......اچھا......وہ سنیاری والی بات۔''

''سائیں! گجری حاضر......'' لمبی سُرکی کے ساتھ جملہ نامکمل رہ گیا۔ جواباً گالیوں کا ہڑ (سیلاب) باہر آ گیا۔

''خبردار جو دوبارہ نام لیا۔ عادت ہوگئی ہے اُس کی جیسے نکاحی گئی ہو۔ زبان نیا چٹخارہ مانگتی ہے ورنہ گھر کی بھاجی ترکاری زیادہ پاک صاف ہوتی ہے......''

جھنجھلاہٹ دلائل کا چھاتہ اوڑھے چڑھ دوڑی۔

''اب کے بھی ملے بغیر آئی ہو تو گولی مار دو تھارو بریٹ کو، دو سال سے پھنڈر ہے...... ہر سال سرکار کو خچر دیا۔ پر یہ...... ریکارڈ خراب کر کے رکھ دیا حرامزادی نے۔''

زنانے سے نوکرانی دوڑتی ہوئی نکلی اور باڑے کی سمت مُنہ کر کے جبڑے پھیلا دیئے۔

''اگو! اندر سے آرڈر ہے، مصری مرغی کے چھ انڈے ابھی لا کر دے مُرغی بٹھانی ہے۔ انڈوں پر...... توڑی کا تسلا بھی بھر کے اندر بھیجو اور سرداراں کمہارن سے بڑا دور گکڑی (مرغی) بیٹھانے کے لیے لا کر دو جلدی......''

''نہ مصری......؟ اس بار میں کہاں مصر بکتا ہے۔''

چائے کی آخری لمبی سُرکی حلق کو جلا گئی...... ''تھارو بریٹ...... حرامزادی ملتی نہیں بہتی پاک دامن، گولی کھا مرے گی۔'' نوکرانی دوبارہ بھاگتی ہوئی آئی۔ گُڑ کی بھیلی اور پتی کی پُڑیا چارپائی کے پائے پر ٹکا کر چلی گئی۔ ڈب کا پیٹ پھول گیا۔

''اندر عرض گزارو مصری کے انڈے آئے کہ آئے اوڈوں کی بھنی پر ڈھیر پڑے ہیں۔''

تھارو بریٹ کے تھرکتے پھڑکتے مسلز پر ملازم کھریل پھیرتے تھے۔ مربع پال کی سرمگیں آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے قطاروں میں نکلتے تھے۔ جنہیں اگو پگڑی کے پلو میں جذب کرتا تھا اور سیاہ ایال کو سہلاتا تھا۔

''مل جا کمیلیئے ! مل جا نہیں تو گولی کھائے گی۔ دو سال سے پھنڈر...... تیرے سے تو خچر اور گھوڑے چاہئیں پہاڑوں پر مال ڈھونے کے لیے، فوجیوں کو سواری کروانے کے لیے، کملی کسی کو تو پسند کر لے نہیں تو گولی......'' لاؤڈ سپیکر کے اعلان کے ساتھ نرگٹ کی نوکیلی چونٹی ڈوبنے اُبھرنے لگی، پسینے کے قطرے ڈھول کو بھون گئے۔ سوگواری تمسخر اوڑھے کھلکھلائی۔

''اوئے کیہڑا وفات پا گیا۔ سلاما چھی رخصت پا گیا......''

کھلری ہوئی اُنگلیوں والے چوڑے پنجے اور پھٹی ایڑیوں والے لمبے پیرا تنے لمبے کہ کسی دکان سے ناپ نہ ملتا تھا اور موچی سائی (آرڈر) کے دو من گیہوں زائد مانگتا تھا۔ سو وہ بچے کی قبر ایسے پَیر جو کبھی کسی جوتے کی قید میں سمائے ہی نہ تھے۔ کپاس کی سیاہ پڑتی کھڑ کھڑ خشک کھوکھڑیوں کی تہ میں پھنسے پھٹی کے ریشے نکالتی ہاتھ بازو چھلواتی عورتوں نے اسوج کے تانبا سے سورج کے سنہری تار آنکھوں میں گھستے ہوئے محسوس کیے اور میل پسینہ کھورتی ہوئیں ہاتھوں سے ماتھے پر چھجے بنائے۔

''اگو دیکھ، ناساں (پھٹی کے آخری ذرے) بھی تیسرے حصے پر نکال رہی ہیں۔ مالکوں سے کہہ کے چھوٹاں چھڑا دے نا، کتنے خسیس بھوروں میں سے بھی حصہ بانٹتے ہیں۔''

''دادا اگو ! اجڑ (ریوڑ) چھوڑنے کی اجازت لے دے۔''

خشک چھڑیوں کے تنوں کے ساتھ دوبارہ اُگ آنے والے ہرے پتوں کو چرنے کے لیے ریوڑ کھیت میں گھس گئے، چارو ہوں اں ہوں کرتے پیچھے بھاگے اور عورتیں چیختی چلاتی رہیں۔

''حالا حالا سب کچھ اگو ہی کرے آپ تو کوئی سنیاری......'' لمبا ڈگ بھر چوڑے پاٹ والے کھال کو پھلانگا، جس کے گلابی کثیف سنہری پانی میں ٹیوب ویل کا شفاف پانی ملتا اور گندم کے ہرے بھرے تھالوں کے بدن دھوتا تھا۔ جس میں ٹیڑیاں اور لالیاں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور اُڑتے سمے پَروں سے پھواریں چھوڑتی تھیں۔

''اگو ای دانت اُتروائے۔''

''اوئے اکہ آیا کہ یکہ آیا۔''

ٹیوب ویل کی کوٹھڑی کے گرد پھیلے باغ میں چارپائیوں پر بیٹھے فضلو جٹ کے لڑکے تاش کھیلتے تھے۔

''اگو! سارے دانے مانے، ملکوں کے لیے ہی، کوئی اوکھر موکھر (بچا کھچا) ادھر بھی چکھا۔''

''حاضر سائیں حاضر آج ہی حاضر......''

''دانہ کیسا ہے۔''

''پکا اور میٹھا رس ٹپکاتا۔''

''نام بول۔''

''مُرادو گجری۔ پکی پیلوں، شہتوت کی گول۔''

''ہے تو ورتی ہنڈی پر چل گزارہ سہی......''

''سائیں بڑا نیکی کا کام ہے۔ رانڈ ہے غریب، دو پیسے بن جائیں تو دُعائیں دے گی......''

جبڑوں کی ہڈیاں اور ہونٹ بھکاری کے بیضوی کشکول کی طرح پھیلے اور چھنک سے سکا گرا۔

کینو کے لدے ہوئے پودے سے اکٹھے دو پھل ٹپک گئے آپ ہی آپ......

''سائیں باغ کو سُوکھا لگ گیا کیا۔''

چائے کے پیالے سے لمبی سُر کی نکلی جیسے سانپ کی سسکار بل سے نکلتی ہو۔

''نہیں اگو مصلی! سپرے لڑ گیا۔ دس لاکھ کا باغ کیرے کے مول گیا۔''

لالو جولاہے نے سُوت کا گولا اٹیرن پہ چڑھاتے ہوئے جنڈ کی کھکھل سے ٹیک لگا دی۔

''اوئے اگی مصلی بندہ بن بندہ...... سارے جگ کے ٹانکے بھراتا ہے۔ اپنا بھی کچھ سوچ، بد بختا! تیرا تو جنازہ بھی جائز نہیں۔ نہ رَن، نہ کن، نہ دھیا، نہ پُتر، نہ ٹھور نہ ٹھکانہ۔ ایک ڈب میں گُڑ پتی دُوجی میں روٹیاں چولہے پہ چاء کا کاڑھا...... اوئے بندہ بن جا...... بندہ......''

اگو نے لمبی سُر کی لے پیالہ ختم کیا۔ حلق کے اکھاڑے میں کبڈی مچ گئی۔

''مولانا آئے نکاح ٹوٹیں جنازے پڑھے جائیں، کون رُخصت پا گیا مولانا......''

امام مسجد مولوی عبدالصمد نے درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے ٹیوب ویل کے کھاڈے (ناند) پہ پَیر ٹکا بازوؤں کے کف چڑھائے۔

''کنک نسر گئی ہے۔'' مولوی عبدالصمد نے بالوں پہ مسہ کر کے صافہ لپیٹا۔ گندم کے بوٹے ہَوا میں لہرائے جیسے سونے کی بالیاں کھنکی ہوں۔ کھن کھن......

''اکرم! سنا ملکوں کے انباروں میں پُرانی کنک کے دو بھڑولے بھرے رکھے ہیں۔ اگر ایک بوری نئی کنک کے بدلے مل جائے۔ کام کروا دے۔ اکرم تیرا نکاح مفتو مفتی......''

لالو جولاہا اوکاں کی کھکھل سے اُٹھا تو دھاری دار گلہری لمبی دُم لہراتی اُسی کھکھل سے نکل تنکا تنکا پتوں والی ہری شاخوں میں چھپ گئی۔

''رات نمبرداروں کی بیٹھک پر بات تھی کہ انباروں میں دیسی پھٹی کی دو بوریاں پڑی ہیں۔ اگو! سودا کروا دے مجنوں کھیس بُن کے دوں گھنوں سے بھی کھرے۔ وچوں اک خاکی کھیس تیری۔''

پرلی مینڈھ پر گھاس کی وزنی پنڈ تلے دوہری ہوتی پنڈلیوں پر دوڑتی ہوئی دارو نے پنڈ بنے پر اچھال دی اور مُنہ پر چلو بھر بھر چھینٹے مارنے لگی۔ ٹیوب ویل کا شفاف پانی جھاگ کے گالے بناتا کھال کا کھلا منہ بھر رہا تھا۔

''اوئے اکے شالا مکیں (مر جاؤ)......'' اس سال پڑیاں (خالی کھلیان) ہمیں بھی دلا۔ پار سال بھی ساری مُرادو گجری ہونج (صاف) کے لے گئی بھتی سکے دار ہے نا تیری۔ سرسوں کے تیل میں تل تل میٹھڑے (میٹھے ٹکڑے) جو کھلاتی ہے تجھے......''

پیچھے آتی کسانوں کی ٹولی نے اپنے اپنے مطالبات، یکبارگی اُنڈیل دیئے۔

''اگو شالا جیویں۔ یوریے کے دو بورو تو اُٹھوا دے ہاڑی کے کارے پر، گنڈوں (پیاز) کے بدلے لال مرچیں لے دے۔ سنا مونگ پڑے ہیں انباروں میں، سونے رنگے گھی کے بدلے ونوا (بدلوا) دے......''

پکی پلی کی مینڈھ پر پانی کی اوک بھر پیتی مُرادو گجری نے بھرا ہوا لُپ اُچھال دیا۔ پانی کے چھینٹے نرگٹ کی رقصاں ہڈی اور ناک کی نوک پر جمی دُھول کو کیچڑ بنا گئے۔

''آدھی دھڑ توڑی کی لے دے اکرما! ڈب کھوئی جھ چڈبی کو بُوکن (جلاب) لگا توڑی (بھوسہ) رلا دو تو ٹھٹھہ سلونا ہو جاتا ہے۔''

ڈب کا پیٹ پٹ سے کھل گیا۔

''باگے والے مربع سے دو لوٹے کچور کر لیے کھو (توڑ) کے ٹماٹر ڈال چڑھائے ہیں۔ بھاجی رکابی میں نکلی پڑی ہے۔ آپ گُنی (ہانڈی) چاٹ لی تھی۔ پر ذرا او بلے او بلے۔''

''ذرا او بلے او بلے'' گنگناہٹ میں ڈھل گیا۔ ترچھی نگاہوں میں نمی تیر گئی۔

''انتظام ہو گیا ہے سَو کا نوٹ پکا کُل گوشت پکے اور سوڈے کی بوتلیں کھلیں......''

دوسرے بنے پہ پیتل کی پرات مانجھ مانجھ سونا رنگ بناتی رحمتے چدھڑن نے کرم خوردہ دانتوں کو بُکل مار چھپایا۔ دانتوں کی متعفن ہوا ڑ باہر نکلی اور ارد گرد کی ساری ہوا کو بھر دیا۔

''اوئے اکو اندر سے پچھواؤ مکئی کا آٹا تو نہیں چاہیے کنک کے بدلے وٹاوا (بدلوا) دے مکئی جوار کھا کھا آنتیں بھی سُوج گئیں۔''

ڈیرے پہ تھانہ اُترا تھا۔ ہنگامہ پورے گاؤں میں مچا تھا۔

اکو کے حلق کے اکھاڑے میں گھمسان کا رن پڑ گیا۔

''اوئے ڈھول سپاہی آئے، دعوتیں پکیں او کھر مو کھر ملازموں کو ملیں۔ بھلاں جی ای! بھلاں جی ای! اندروں کوئی آرڈر'' آرڈروں کی پوری بارات باہر اُتری۔

''اجو جٹ کے اجڑ (ریوڑ) میں پھرتی دیسی بکری اگر گابھن نہیں تو کو (ذبح) دیو۔ جو مرغیاں انڈے نہیں دیتیں حلال کر کے پھو دیو (پرا تار دو)۔ فاطی نائن کو بلاؤ۔ زردہ دم کرے، حا تو ماچھن کو سد (آواز) مارو آٹا گوندھ کے تندور تپائے۔ باگے آلے مربع سے مُولی گاجر...... دتو چڑی باز سے تیتر بٹیرے......''

''ہو گیا جی سارا کچھ ہو گیا پر کوئی کھور مور...... چاء دی پیالی......''

ڈیرے کی دو فٹ اُونچی دیوار کے ادھر تینوں نکروں کی ہٹیوں پر بیٹھے ہوئے ہنکارے۔

''اکو...... سدو...... کا کو......''

ایس پی صاحب نے ملک صاحب سے کہا۔

''ملک جی! یہ آپ کا اسسٹنٹ تو پورا مخبر ہے اسے تو آپ تھانے کو ڈونیٹ کر دیں۔''

ہر گلی، نکر، کھالے، بنے، کھوبے ڈھودل میں اکو کے کھرے موجود تھے۔ ہر بیٹھک، ہر ہٹی پہ بیٹھے اُس کے للکرے سن ہنکارتے تھے۔

''ڈیرے پر تھانہ اُترا۔ اوہ گیا ای اکو...... اکو دیاں نستیاں دیکھو۔ اکو دے للکرے سن۔ اوئے اکو ہمارا کام بھی...... میرا بھی...... اوئے میرا بھی...... اوئے ٹوراں ویکھ...... کیوں نا ہو ملکوں کا کاما

ہے......کاما......"

منہ اندھیرے بغلی سڑک حالیوں کے ہنکاروں اور بیلوں کی ٹلیوں کی کھنک سے بھر گئی۔

"اوئے اکو چائے کا دیگچہ نہیں اُبالا آج گڑ پتی نہیں ملا کیا...... سارا کچھ تھا نہ کھا پی گیا کیا؟"

سوئی ہوئی ڈھول کو روندتے جگاتے، ٹریکٹروں کے ہلوں پر رقصاں غباروں میں سارے منظر اور آوازیں لپٹ گئے تھے۔ مدھانیوں کی گھمک گھمک اور مرغوں کی بانگوں کی گونج تاریکی کے کوٹے میں گھومتی کوٹھوں اور بنیروں پہ چڑھ گئی۔

"اُوے اکو ذرا ٹوکری کو ہاتھ ڈلوا۔"

باڑا ہونجتی (صاف کرتی) جانو کی آوازیں حالیوں کے ہنکاروں میں رل مل گئیں۔ آخر خود ہی دونوں ہتھیلیوں پر ٹوکری اُٹھا گھٹنوں کا آسرا دے سر پر دھر لی۔

"کھچر! اگھوس مار گیا۔"

زنان خانے سے نوکرانی نکلی۔

چاچا اکو اندر سے آرڈر ہے ریڑ کے لیے برف لا کے دے۔ جوا ہوں کی بنی ہے۔ تالے رتا ککڑ (لال مرغ) حلال کروا کے لو دیو۔ کھلوی نہیں اُتارنی پھوک دیو تالے باگے آلے م بجے سے چھولیا لا کے دیو......"

مربع پال گھوڑی اصطبل میں بگٹٹ بھاگنے لگی۔ جیسے خود سے ہی ریس لگا رہی ہو اور سینگل بھینس منہ اُٹھا اُٹھا بولنے لگی۔

"چھ مہینے بعد پھر بول پڑی خالی نکلی پھنڈ رقصائی کو دے دیں۔ چھیرے جوگی۔"

ملازم چارے والی ریڑھی جوتتے، تبصرہ کرتے حالیوں کے قافلے میں مل گئے۔

"تیسری بار بولی ہے پھنڈ ٹھہرتی ہی نہیں......"

"نرا پٹھے کا اُجاڑا۔"

عورتیں، بکیاں اور جھبھریاں سر پر رکھے لسی لینے کو نکلیں تو ڈیرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ سوئے اکو کی چارپائی کے عقب سے مرادو گجری کی چیخ سارے گاؤں میں گرلا گئی۔

"ہائے اوئے سارا پنڈ رانڈ ہو گیا۔"

مدھانیاں چھوڑ عورتیں مکھن لتھڑے ہاتھ ملتی باہر نکلیں اور ایک ہی بین درختوں میں سوئے پرندوں کو اُڑا لے گیا اور چگادڑیں پرانے کنویں کی دیواروں سے ٹکرا پھڑ پھڑانے لگیں۔

''آج سارا پنڈ رانڈ ہو گیا۔''

زنان خانے سے بین اُبھرا اور بلند فصیلوں سے ٹکرا منہ کے بل اندر ہی گرا۔

''ہائے میں اَندر بیٹھی سجھو رانڈ ہوگئی کون تک سک لا کے دے......''

منی ملکانی جاگ کر باہر بھاگی اور لمبے لمبے جھونٹے لینے لگی۔

''کون پینگ ڈال کر دے۔کون کندھوں پہ بٹھا میلہ دکھائے۔''

خالد بابو کی آنکھیں ڈبڈبائیں جن میں نتو جٹی کا لال چقندر چہرہ جھلملا گیا۔گلہری کی دُم کی سی مونچھوں کو باچھوں پر تھپتھپاتے ہوئے وڈا (بڑا) ملک زنانہ خانے سے نکلا۔خوشابی لنگی کے ڈب اُڑسے۔

''وہی چوہڑے کا چوہڑا نکلا، لارا لگا کے آپ مر گیا۔'' گلو مراثن نے لکھو مصلن کے چٹکی بھری۔

''اکو کا دُکھ کس کو نہیں کاں چڑی کا اتھر (آنسو) نہیں سوکھتا۔ پر مراد و گجری کو تو دیکھ، جیسے پہلی بھی رانڈ ہوئی ہے۔''

تھارو بریٹ اصطبل کے دروازے کے سانگل پہ منہ رکھ سرگیں آنکھوں سے جھڑی لگا رہی تھی جسے آج کل میں گولی ماری جانے والی تھی جو دو سال سے پھنڈر تھی اور کسی خچر، گھوڑے کو لاگے (قریب) نہ لگنے دیتی تھی۔تین نمازیوں کی جماعت کروا کر مولوی عبدالصمد چارخانہ رومال سر پر لپیٹے شلوار کے کھلے پائنچے نالی کے وضودار پانی سے بچاتا ملک کی پائنتی بیٹھا اور دوسری چیخ سارے پنڈ میں بلبلا گئی۔

''جنازہ جائز نہیں ہے۔''

غسل کے لیے چار پائیاں کھڑی کر کے پردے کی اوٹ بناتے مردنولیوں میں بٹ چار پائیوں سے ٹیک لگا سائے میں بیٹھ گئے۔کفن سیتے درزی کے ہاتھ سے مشین کی دستی چھٹ چھٹ گئی اور سوئی کا ناکہ ٹوٹ گیا......

لالو جولا ہے نے مہندی رنگی داڑھی میں پورا پنجہ ڈبو دیا۔

''بڑا سمجھایا، بڑا سمجھایا، کوئی رَن کن کر لے۔ ساری حیاتی ڈب میں روٹی......کون پڑھے مکروہ جنازہ۔''

سوگوار مجمع یکطرفہ پنچائت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ تھارو بریٹ پکی دیوار سے جسم رگڑ رگڑ زخمی کرنے لگی اور بولی ہوئی جھوٹی منہ اُٹھا اُٹھا ملاپ کی دہائی دینے لگی تھی۔

مولوی، پٹواری، ماسٹر اور ملک کے جڑے ہوئے سَر مُرادو گجری کی چیخ نے جیسے بالوں سے پکڑ کر الگ الگ کر دیئے۔

''جنازہ جائز ہے۔ جائز میں......میں......آپ......نکاح میں......''

گجر برادری کے بزرگ اور جوان صفِ ماتم سے بلبلا کر اُٹھے اور پنچائت کے مدعی بن گئے جیسے اُن کا پانی توڑ کر رات کی تاریکی میں کسی اور کھیت والے نے باندھ لیا ہو۔

''اوئے یہ گجری اور یہ مصلی چوہڑا، وڈ (کاٹ) کے پھینک دو اسے راوی میں ٹوکے کے ساتھ......''

چودھری نے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا اور فلٹر والا ٹوٹا ڈیرے کی دو فٹ اونچی دیوار کے پار پھینکا، جہاں چاروں دکانوں کے منہ پر تالے لگے تھے اور جھکڑ جھولے، کنڈے دروازے کھڑ کھڑاتے تھے۔

''مرادو تیرا نکاح تو سمجھو آدھے گاؤں سے...... اور پھر کوئی کاغذ کوئی گواہ......عورت کی تو گواہی ہی آدھی......''

گلہری کی دُم جیسی مونچھوں پر دُھول جمنے لگی۔ کیکر کی سیاہ پڑتی پھلی، ہوا میں اُڑی اور گلہری کی دُم میں اَٹک گئی۔

''مولبی جی جلدی کرو مردہ رنگ بدل گیا اے۔ گواہ رخصت پا گیا اے۔''

مرادو کے سیاہ ہونٹوں پہ جمی پپڑی کلر سی تڑخی بالوں میں بھرے ککھ اور ٹانڈے خشک لٹوں کو گرہیں دے گئے۔ پلکیں بُھر بُھر آنکھوں میں پڑتی تھیں اور پانی قطروں میں نہیں لکیروں کی صورت میں نکلتا تھا اور میت کے گرد گھومتے وا ورولے میں بین وِرد کی صورت چکراتا تھا۔ ''پڑھو مومنو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه''

''مولوی کرے بھی تو کیا کرے، کرے تو شرع ہی کرے مولوی خود تیس برس کی عمر میں پانچ سال سنت محمدی پر عمل کرتے ہوئے نکاح میں گزار چکا ہے وہ مکروہ جنازہ کیوں کر پڑھائے......'' پٹواری نے ماسٹر کے کان کی لو پر مدعا ٹانگا۔

سارا گاؤں تو مولوی کے لب ہلنے کا منتظر تھا۔'' دیکھو شرح کہ مرادو......''

میت جس کیکر کے درخت تلے پڑا تھا۔ اُس کی چھاؤں سیاہ کھو کھلے چھال والے تنے سے چھنی ڈال رہی تھی، دھوپ چھاؤں کے دھبوں تلے پڑا میت جس کی آنکھوں کے گڑھوں، جبڑوں کی ہڈیوں، دانتوں کے مسوڑھوں کو بہت پیچھے دھکیلتی ہوئی جلد انہیں ننگا کر گئی تھی جیسے بھوسے پر نا کافی چمڑا چڑھا، مورا بنایا ہو مگر جا جا سے چمڑا ادھڑ مسک گیا ہو اور بھوسہ باہر کو اُنڈا پڑ رہا ہو۔ میت کے گرداگرد ٹکا ٹکا سی اکیلی مرادو ماتم کرتی تھی جس کا سپاٹ سینہ مردانہ وار تنا تھا۔ چادر کا پلو ئسر سے یوں لپٹا تھا کہ بیچوں بیچ انو سا بن گیا تھا، جیسے کوئی بڑا بوجھ سر پر اٹھاتا ہو۔ واور ولے سے نکلتا بین کیکر اور پیپل کے رلویں چھتنار میں بھرتا تھا اور ہر سمت ڈھول کے ٹک بھرتی اور پھکے مارتی ہوا میں سرسراتا تھا۔

''پڑھو مومنو لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ...... پڑھو مومنو لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ''

چند ایک کو پڑھنا آتا تھا جو پورے مسلمان تھے اور پنچائت کے مدعی تھے۔ اکثریت کو کلمہ پڑھنا نہ آتا تھا پر وہ پکے مسلمان تھے اور پنچائت کے تماش بین تھے لیکن وہ سب مولوی عبدالصمد کے ہونٹ ہلنے کے منتظر تھے کہ ماتم کا سلسلہ شروع کریں یا پھر...... کہ سب مسلمان تو شرع کے شارع ہیں۔

طاہرہ اقبال واقعتاً ایک خلاق افسانہ نگار ہیں۔ اُردو فکشن کا شاندار مستقبل جن چند افسانہ نگاروں کے فنی اور فکری کمالات پر منحصر ہے اُن میں طاہرہ اقبال سر فہرست ہیں۔ مبدائے فیاض سے انہیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے خالق اکبر کی اس عطا کا شکرانہ یوں ادا کیا ہے کہ تہ در تہ حقائق تک رسائی کو ایک نظر میں اپنے شعور کی گرفت میں لے لینے کی خداداد صلاحیت کو چمکانے کے لیے اَنتھک محنت سے کام لیا ہے۔ اُن کی نگاہ باریک بیں ہے، مشاہدہ تیز ہے اور مطالعہ گہرا ہے۔

طاہرہ اقبال نے سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے ذہن و ذوق اور تخلیقی روایات سے وہ سب کچھ سیکھا ہے جو ایک ایجاد طبع فن کار سیکھ سکتا ہے۔ طاہرہ نے جدید اور ترقی پسند اُردو فکشن کی اِس روایت سے اکتسابِ فیض بھی کیا ہے اور اِسے ثروت مند بھی بنایا ہے۔ ''سنگ بستہ'' اور ''ریخت'' کے بعد طاہرہ کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ اُس کے اور جدید تر اُردو فکشن کے شاندار مستقبل کا ثبوت بن کر طلوع ہوا ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

ISBN: 978-969-496-289-4